جامعہ کی کہانی

عبدالغفّار مدہولی
مُعلّم
استادوں کا مدرسہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Jamia ki Kahani

By
Abdul Ghaffar Madholi

سنہ اشاعت : 2004

قومی اردو کونسل کا پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : -/140

سلسلۂ مطبوعات : 1175

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی 66

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔

پروفیسر مشیر الحسن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر شپ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایک طرف بین الاقوامی سطح پر تیزی سے بدلتے ہوئے تعلیمی منظر نامے سے یونیورسٹی کو جوڑنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف ماضی کی روایتوں کا احترام کرتے ہوئے جامعہ کی بے مثال تعلیمی جدوجہد، ہندوستان کی قومی اور تہذیبی زندگی کی تشکیل میں اس کی بیش بہا خدمات اور اساسی اقدار کی بازیافت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ عبدالغفار مدہولی صاحب کی تصانیف ''جامعہ کی کہانی'' اور ''ایک معلم کی زندگی، حصہ اول و دوم'' جو جامعہ کی تحریک کو سمجھنے میں بنیادی مواد کی حیثیت رکھتی ہیں، کی مکرر اشاعت میں انھوں نے ذاتی دلچسپی لی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

ہے کہاں تمنّا کا دوُسرا قدم یارب
ہم نے دستِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

غالبؔ

انتساب

جامعہ کے طالب علموں اور کارکنوں کے
نام جن کے کاموں کو سلسلے وار جوڑنے
سے یہ کہانی بنی ہے۔

جامعہ کی یہ کہانی

اس کے قیام سے ہندوستان کو آزادی ملنے تک

یعنی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک

۲۷ سال پر مشتمل ہے۔

فہرست

تصاویر

تعارف

میں نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر کی ذمّے داریاں سنبھالنے کے فوراً بعد عبدالغفّار مدہولی صاحب کی کتابوں کو دوبارہ چھاپنے کا بیڑا اٹھایا اور مجھے بے حد خوشی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اتنے کم عرصے میں ان تینوں کتابوں کو ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست کو قبول کیا۔ میں اپنے ساتھی پروفیسر اختر الواسع کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ایک تفصیلی اور عالمانہ ابتدائیہ لکھا۔

اپنی ریسرچ کے دوران میں نے عبدالغفّار مدہولی صاحب کی دونوں کتابوں 'ایک معلّم کی زندگی۔ حصہ اوّل اور دوم' کا مطالعہ کیا تھا۔ مجھے اکثر و بیشتر یہ خیال آتا رہا کہ کیا وجہ ہے کہ ہماری تعلیمی تحریک پر جو تحریریں ہیں خصوصی طور سے انگریزی زبان میں، ان میں یہ کتابیں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کا کوئی ذکر بھی نہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ اب ان کتابوں کو زیادہ سے زیادہ لوگ استعمال کریں گے اور اس سے استفادہ حاصل کریں گے۔ چاہے جامعہ کی تاریخ ہو یا کسی اور ادارہ کی، اس کا لوگوں کے سامنے تعارف کرانا ضروری ہے، صرف بات چیت سے تحریک سے شناسائی نہیں ہوتی ہے۔

علم کے میدان میں الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں جب تک کہ ان کا تحریر سے ملاپ یا سنگم نہ ہو۔ جامعہ کی کہانی ایک جلد میں چھپی تھی اور '' ایک معلّم کی زندگی'' دو جلدوں میں — مجھے خوشی ہے کہ اب یہ تاریخی کام ایک ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر مشیر الحسن
وائس چانسلر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25

ابتدائیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ قومی تحریک آزادی کے ان ثمرات میں سے ہے جن کے ذریعے اس تحریک کے بنیادی جذبے، افکار، مقاصد اور نصب العین ٹھوس اور محسوس حقیقت کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ قومی رہنماؤں نے جو کارنامہ سیاسی سرگرمی کی سطح پر انجام دیا جامعہ کے معماروں نے اسی کارنامے کو تعلیمی جد و جہد کی سطح پر ممکن بنایا۔

نوآبادیاتی تسلط سے آزادی، ایک نئی مشترک ہندوستانی قومیت کی نمود، صدیوں کے سماجی اقتصادی جبر و استحصال سے گلوخلاصی، ذہنی جمود اور تقلید کے مقابلے تخلیقی تحرک اور اجتہادی فکر کا فروغ جیسے مقاصد جس طرح تحریک آزادی کے فکری منشور کا لازمی حصہ تھے اسی طرح جامعہ کے تعلیمی منشور کے بنیادی عناصر بھی یہی تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو ملک میں تحریک آزادی کے زیر اثر اور نتیجے میں جتنے بھی ادارے وجود میں آئے ہیں ان میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے کیوں کہ اس کے معماروں میں بھی بیشتر وہی افراد تھے جو اس تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین جہاں ایک طرف ملک کی سیاسی آزادی کے حصول اور مشترک قومیت کی تشکیل کے لیے سینہ سپر تھے وہیں دوسری طرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کو وجود میں لانے اور مستحکم کرنے کی جد و جہد میں بھی پیش پیش تھے۔

جامعہ دیگر اداروں کی طرح کسی ایک شخص کے خیال یا کسی حکومت یا اجتماعی

ادارے کی منصوبہ بندی کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص وقت میں ایک اجتماعی جذبے کی عملی تجسیم ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب مہاتما گاندھی نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی اور برطانوی حکومت کے تمام اداروں سے لاتعلقی اختیار کرنے کا بگل بجایا تو حکومت کے زیرِ انتظام تعلیمی اداروں سے قطع تعلق بھی اس کے اہم مقاصد میں شامل تھا۔ وطن پرست اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہزاروں لوگوں نے اس آواز پر اقدام کرتے ہوئے سرکاری اداروں کو خیرباد کہہ دیا۔ اس دوران مولانا محمد علی جوہر نے مہاتما گاندھی کو آمادہ کیا کہ انھیں علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کو بھی اس تحریک میں شامل کرنا چاہیے۔ یہ دونوں رہنما اس ارادے سے علی گڑھ پہنچے تو وہاں کے طلبہ نے جو ردعمل ظاہر کیا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اور اس تاریخ کا ایک باب وہ بھی ہے جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کی قیادت میں اس ادارے کے طلبہ اور اساتذہ کے ایک حلقے نے مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی مادرِ علمی کو خیرباد کہا اور اپنے آپ کو ایک نئے تعلیمی نصب العین اور مستقبل کے خیال کے سپرد کردیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقاء کا یہ اقدام اپنے وقت کی ایک صدائے حق کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل کرنے کے جذبے اور خیال پر مبنی تھا۔ یہ صدائے حق ان کے باہر سے ہی نہیں آئی تھی، ان کے اندر بھی اٹھی تھی۔ یہ ان کے وجود کی آواز تھی۔ اس آواز کے جادو نے جو ایک آوازۂ جنوں تھی، انہیں اپنی زندگی، اپنے مستقبل اور اپنے آرام و آسائش کو تج کر ایک گہری تاریکی میں چھلانگ لگانے کی طاقت دی۔ لیکن تاریکی کی یہ چھلانگ روشنی کی ایک نئی زمین پر قائم ہونے کا وسیلہ بن گئی۔ جب جذبے صادق ہوں، ارادے اٹل ہوں اور جنون ایک برتر عقل کا

پروردہ ہو تو خوابوں کی اندھی جست بھی خوش تعبیری کی دانا و بینا صورت گری پر منتج ہوتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ جو ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ کے ایک ویرانے میں چند خیموں کی شکل میں وجود پذیر ہوئی تھی آج اگر ایک مرکزی یونیورسٹی کی صورت میں فروغ پذیر ہے تو یہ اس کے پس پشت کارفرما افراد کے دماغوں کے سوز، دلوں کے ساز اور دست و پا کی محنتوں کا کرشمہ ہے جنھوں نے اپنے جذبوں کی قوت، افکار کی وسعت اور اپنی بے مثال آدرش پسندی اور امید پرستی کی اینٹوں سے ایک موہوم خیال کو گوشت پوست سے آراستہ کیا اور لاعلمی کے ویرانے میں علم کی ایک بستی پیدا کردی۔ جامعہ جو ایک صدائے حق پر لبیک کہنے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی دھیرے دھیرے خود بھی ایک صدائے حق بنتی چلی گئی اور پھر اس آواز نے ایک شمع وفا کی شکل اختیار کرلی۔ یہ صدا جہاں جہاں بھی پہنچی اہل دل اور اصحاب نظر نے اس پر لبیک کہا اور دھیرے دھیرے چند دیوانوں کی یکجائی ایک بھری پری بزم جنوں میں تبدیل ہوگئی، ایک ایسی بزم جنوں جس کی صدارت ایک شمع بصیرت کررہی تھی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ایسی تعلیمی اور تہذیبی جد و جہد کا اشاریہ ہے جس کا بنیادی مقصد ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں یہ تھا کہ جامعہ:

> ... ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم، ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت

اور قومی اتحاد کا سبق دے گی اور ہندوستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن وتہذیب کی معتبر خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب وخیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب دیکھتے آئے ہیں اور ہمت وخلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ (جامعہ) علم محض روزی کی خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے۔ وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب، حکمت اور صنعت، سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے"۔

جامعہ انھی مقاصد کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ دن علی گڑھ میں رہی، پھر دہلی میں پہلے قرول باغ علاقے میں منتقل ہوئی اور اس کے بعد بالآخر اوکھلے کے جامعہ نگر میں مستقل قیام پذیر ہوگئی۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک جب ملک آزاد ہوا یہ نوخیز ادارہ ابتلا وآزمائش اور وجود وعدم وجود کی کشمکش کے ہر ممکن تجربے سے گزرا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے عزم وحوصلے، ایمان ویقین اور اعتماد واستقلال کا سرمایہ بھی ترقی کرتا رہا۔ اس دوران بار بار ایسی تاریکی کے وقفے آئے جب یہ محسوس ہونے لگا کہ شاید اب جامعہ کی یہ کشت خواب سوکھ جائے گی مگر تبھی کہیں نہ

کہیں سے کوئی زرِامید ابر رحمت کی طرح برسا اور اس کھیتی کو پھر ہرا کر گیا۔ شروع میں نوخیز جامعہ کی مالی اعانت بہت بڑی حد تک خلافت کمیٹی کے فنڈ سے کی جاتی تھی، لیکن بہت جلد اہل جامعہ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ذہنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اسے خلافت کمیٹی کا دست نگر نہیں رہنا چاہیے اور اس طرح جامعہ کو ایک خود مختار ادارہ بنانے کا تصور پیدا ہوا۔ مگر یہ تصور اپنے ساتھ سخت مالی دشواریاں بھی لے کر آیا جس سے نجات کی یہ صورت نکالی گئی کہ ادارے کو دہلی منتقل کردیا جائے۔ حکیم اجمل خاں کی کوششوں سے ۱۹۲۵ء میں جامعہ کی محفل دہلی کے قرول باغ علاقے میں ازسرنو سجائی گئی۔ اس دوران ڈاکٹر ذاکر حسین اعلا تعلیم کے لیے جرمنی جا چکے تھے۔ لیکن جرمنی میں ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب سے ان کی ملاقات ایک ایسا واقعہ ثابت ہوئی جس نے جامعہ کی کہانی کو حقیقت کا ایک نیا موڑ دے دیا۔ ۱۹۲۶ء میں یہ تینوں افراد جامعہ کے ایک نئے مستقبل کی نوید بن کر آئے اور ادارے کی گرتی ہوئی چھت کے لیے عزم وارادے اور تخلیق و تعمیر کے تین غیر متزلزل ستونوں کی طرح قائم ہوگئے۔ اس کے بعد ایک نئے جوش وخروش کے ساتھ جامعہ کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنانے کی وہ صبر آزما جدوجہد شروع ہوئی جس میں ایک طرف تعلیم کے نئے نئے تجربے کیے گئے، طلبہ کی کردار سازی کے نئے معیار قائم کیے گئے، انھیں اسلام کی اصل روح اور قومی تہذیب کی بنیادی اقدار سے واقف کرنے، انھیں فرقہ وارانہ یکجہتی کے جذبوں سے سرشار کرنے اور ان کی شخصیت کے متوازن نمو کی خاطر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرنے کے جتن کیے گئے، وہیں دوسری طرف ادارے کی مالی بنیادوں کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے ملک بھر کے اہل خیر افراد کے دلوں پر دستک دینے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا یہ ۲۷ سالہ دور بجا طور پر جامعہ کا ملّی دور کہا جاسکتا ہے جس کے دوران جامعہ کے بانیوں اور کارکنوں نے ہر ممکن ایثار و قربانی پیش کرتے ہوئے اس ادارے کو بار بار عدم کے مہیب جبڑوں سے باہر نکال کر اسے وجود کی زمین پر قائم رکھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے جامعہ کے کارکنوں کی اس بے مثال ایثار پیشگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''یہ قوم کے بچوں کے لیے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود ان کے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لیے ترسے ہیں۔ یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لیے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہوسکتا۔ یہ کتابوں کو ترستے ہیں۔ تحقیق وسائل کو ترستے ہیں، انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لیے زمین خریدواتے ہیں اور اپنے مطالبات کو مؤخر کردیتے ہیں''۔

جامعہ کے لیے وقف انہی افراد میں سے ایک نہایت درخشاں نام جناب عبدالغفار مدہولی کا ہے جنھوں نے جامعہ کی کہانی میں اس کے ملّی دور کی تمام تر جدوجہد اور اس کی کامرانیوں اور نامرادیوں، امیدوں اور مایوسیوں اور آسائشوں اور صعوبتوں کو بے کم و کاست بیان کردیا ہے۔ پروفیسر محمد مجیب کے الفاظ میں:

''... جامعہ میں عبدالغفار صاحب مدہولی جیسے خادم بھی ہیں جنھوں نے اپنی شخصیت کو جامعہ میں بالکل سمو دیا اور جن کی نبض جامعہ کی نبض کے ساتھ اسی طرح چلتی ہے گویا ان کا وجود جامعہ کے وجود سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ہر نقصان سے ان کے دل پر ایک زخم لگتا ہے۔ اس کی

ترقی کا ہر قدم ان کے سرمایۂ حیات کو بڑھاتا ہے۔ جامعہ کے کام ان کے
لیے محض نیک اور مفید کام نہیں ہیں بلکہ ان کی واردات قلبی کی ترجمانی کرتے
ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دراصل یہی لوگ ہیں اور ان میں میرے نزدیک
عبدالغفار مدہولی صاحب معنوی اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ جامعہ ملیہ قومی
یکجہتی کی مثال اور تعلیمی تجربوں کا میدان اس وجہ سے بن سکی کہ وہ بنیادی
طور پر ایک تعلیم گاہ ہے اور وہ تعلیم گاہ اسی وجہ سے بن سکی کہ اس میں
عبدالغفار مدہولی جیسے استاد ہیں"۔ (پیش لفظ، جامعہ کی کہانی)

مدہولی صاحب نے ان ۲۷ برسوں کے شب و روز کی تمام تر کیفیات و
حالات کو ان کے تمام جزئیات کے ساتھ اسی طرح بیان کیا ہے کہ ایک ایک واقعہ،
ایک ایک خیال و احساس اور ایک ایک جذبہ زندہ ہو اٹھا ہے۔ کچھ اس طرح کہ
قاری اس پوری تعلیمی جد و جہد میں اپنے آپ کو شریک پاتا ہے۔

شیخ الجامعہ محترم مشیر الحسن صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی زمام کار سنبھالنے
کے بعد جامعہ کی بے مثال تعلیمی جد و جہد، تحریک آزادی اور اس کے بعد کے
جمہوری ہندوستان کی قومی اور تہذیبی زندگی کی تشکیل میں اس کی بیش بہا عطا اور
اس کی فکری بنیادوں اور اساسی اقدار کی بازیافت اور تجدید کا جو منصوبہ باندھا ہے،
'جامعہ کی کہانی' کی از سر نو اشاعت اس کی ایک تابناک کڑی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار
۱۹۶۵ء میں مکتبہ جامعہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی اور اب تقریباً ناپید ہو چکی ہے۔
اس کتاب کی اشاعت کی ذمے داری قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
نے اٹھائی ہے جس کے لیے اہل جامعہ اس کے سربراہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کے
تہہ دل سے ممنون ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ 'جامعہ کی کہانی' کی اشاعت سے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کی اس شاندار تعلیمی جد و جہد کی تخلیقی باز آفرینی کا موقع ملے گا اور یہ موقع بھی کہ آج ملک کے دو بڑے فرقے اپنی اپنی مذہبی اور تہذیبی روایات اور اقدار کی روشنی میں اپنی گذشتہ ایک ہزار سال کی مشترک تہذیب کو نئی زندگی دینے کے لیے یک جا ہوں تاکہ سیکولر جمہوری ہندوستان کو ہر طرح کے مذہبی کٹرپن اور احیا پرستی کے اثرات سے پاک اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد کو توانائی اور تحرک حاصل ہو سکے۔

پروفیسر اختر الواسع
ڈائرکٹر
ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

۳۱ر جولائی ۲۰۰۴ء

شکریہ

محترم محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ نے "پیش لفظ" تحریر فرمایا۔ اسے پڑھ کر ملے جلے جذبات سے دوچار ہونا پڑا۔ اسے شایع نہ کرنا بے ادبی ہوتی، بقول مجیب صاحب اگر میں نے ساتھیوں میں خدا کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کی تو مجھے بھی تو اپنی زندگی کی غلطیوں کا اور اپنی ہستی کا احساس ہے۔ اسی لیے میں نے عرض کیا کہ مجیب صاحب کی یہ بے پناہ عقیدت پا کر مجھے ملے جلے جذبات سے دوچار ہونا پڑا۔

جب میں کوئی کتاب لکھتا ہوں تو زبان کا مجھے اتنا خیال نہیں رہتا ہے۔ جتنا نفس اس مضمون کا، اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میرا علم محدود ہے لیکن میرے اُستاد ڈاکٹر عابد حسین صاحب جب میرے مسودے کو سنوار دیتے ہیں تو میری سعی مشکوٗر ہو جاتی ہے۔

میں شاگردوں کے لیے بورڈ پر تو صاف لکھ لیتا ہوں لیکن معمولاً میری تحریر خراب ہے۔ اس کہانی کے لیے اِدھر اُدھر کے ٹکڑوں کو جمع کرنا، ان میں کانٹ چھانٹ کرنی، اپنی طرف سے لکھنا پھر ان سب میں تال میل پیدا کرنے کے لیے نمبر ڈالنا یہ اُلجھا ہوا کام تھا، مکتبہ جامعہ کے کارکن حبیب احمد صاحب میری تحریر اور میرے اشارات کو سمجھ کر اسے صاف کرتے رہے اس سے مجھے آگے بڑھنے میں مدد ملی۔ میرے دوست محمد حسین صاحب اُستاد مدرسہ ثانوی نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا۔

جامعہ میں مدد کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔

میرے ساتھی سعید انصاری صاحب ریڈر ٹیچرس کالج جامعہ نے واقعات کی

تصدیق کی۔

میرے ہمدرد جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج نے ایک نظر مسودہ دیکھ لیا۔

میرے رفیق عبداللہ ولی بخش قادری صاحب لکچرر ٹیچرس کالج جامعہ نے پروف دیکھنے میں غلطیوں کی ذمّے داری اپنے سر لی۔

میں نے ''رنگی کی زندگی'' میں پڑھا تھا کہ ایک کارکن کے پاس مدرسے کی اہم چابیاں رہتی تھیں، وہ بوڑھا ہوگیا تھا، مگر یہ خدمت اسی کے سپرد رہی، میرے پرانے رفیق جناب اختر حسین صاحب فاروقی آرٹسٹ مدرسہ ثانوی رضا کارانہ طور پر جامعہ کا جھنڈا اور اہم تصاویر، کتبے اپنی تحویل میں رکھتے ہیں، آپ کی وجہ سے پرانی تصویریں مل گئیں۔

میرے دوست حسین حسان صاحب رُکن ادارہ تعلیم و ترقی نے ایسی فہرست مرتب کردی جس میں جامعہ میں کام کرنے والے کارکنوں کی وہ تصانیف ہیں جو ۱۹۴۷ء تک لکھی گئی ہیں۔

میرے ساتھی رشید نعمانی صاحب اُستاد آرٹس انسٹیٹیوٹ نے کاپیاں دیکھنے میں میرا ہاتھ بٹایا۔

حسیر الدین پورنوی فاضل دیوبند مدرسہ ثانوی متعلم نے طباعت میں مدد دی۔

میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پیش لفظ

جامعہ میں آنے کے بعد میں نے جامعہ اور جامعہ کے مقاصد پر بہت سے مضمون لکھے۔ سنہ ۴۹ء کے بعد سے جامعہ کی سالانہ رپورٹ یا اس رپورٹ پر تبصرہ لکھنا میرے ذمّے رہا، لیکن میں برابر یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ میں ایک ایسے ادارے اور ایسے کاموں کے بارے میں لکھ رہا ہوں جو مجھ سے دور نہیں تو کسی قدر الگ ضرور ہیں، اپنی طبیعت کو دیکھتے ہوئے میں اس ذہنی علیحدگی کو غلط یا بُرا نہیں سمجھتا، بلکہ شاید اسی علیحدگی کی بدولت میں اپنا توازن کھوئے بغیر جامعہ میں اڑتیس برس گزار سکا۔ لیکن جامعہ میں عبدالغفار صاحب مدہولی جیسے خادم بھی ہیں جنھوں نے اپنی شخصیت کو جامعہ میں بالکل سمو دیا اور جن کی نبض جامعہ کی نبض کے ساتھ اس طرح چلتی ہے گویا ان کا وجود جامعہ کے وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ہر نقصان سے ان کے دل پر ایک زخم لگتا ہے اس کی ترقی کا ہر قدم ان کے سرمایۂ حیات کو بڑھاتا ہے۔ جامعہ کے کام ان کے لئے محض نیک اور مفید کام نہیں ہیں بلکہ ان کی واردات قلبی کی ترجمانی کرتے ہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ دراصل یہی لوگ ہیں اور ان میں میرے نزدیک عبدالغفار صاحب مدہولی معنوی اعتبار سے بہت ممتاز ہیں۔ جامعہ ملیہ قومی یک جہتی کی مثال اور تعلیمی تجربوں کا میدان اس وجہ سے بن سکی کہ وہ بنیادی طور پر ایک تعلیم گاہ ہے، اور وہ تعلیم گاہ اس وجہ سے بن سکی کہ اس میں عبدالغفار مدہولی جیسے استاد ہیں۔

شاید اپنی ذہنی علیحدگی کی وجہ سے میں اور ساتھیوں کی بہ نسبت عبدالغفار صاحب کی شخصیت اور اُستاد کی حیثیت سے ان کے کمال کا بہتر اندازہ کر سکتا ہوں وہ اصول کے بہت پابند ہیں اور اسی کی بدولت مجھے ایک سبق ملا جسے میں اب تک نہیں بھولا ہوں، انھوں نے سنہ ۳۱ء یا سنہ ۳۲ء میں مجھ سے ایک جلسے کی صدارت کرنے کی

فرمائش کی، میں نے وعدہ کرلیا مگر جلسے کا جو وقت مقرر تھا اس سے آدھے یا ایک منٹ دیر سے پہنچا دیکھا کہ میری جگہ کوئی اور صدارت کر رہا ہے۔ یہ سختی صرف میرے ساتھ نہیں کی گئی ابھی چند دن ہوئے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھ سے عبدالغفار صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ انھیں مدرسہ ابتدائی کے ایک جلسے میں پہنچے میں ذرا دیر ہو گئی تھی اس لئے عبدالغفار صاحب نے ان کی جگہ کسی دوسرے کو صدر بنا کر کارروائی شروع کر دی۔ اس کا ان کے اوپر بہت اثر پڑا اور وہ وقت کی بہت زیادہ پابندی کرنے لگے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اور میرے سپرد جو فرائض رہے ہیں ان کی وجہ سے ہماری عادتوں کو جامعہ کے معمول کو بنانے اور بگاڑنے میں بہت دخل رہا ہے اور اگر جامعہ کے جلسوں میں وقت کی پابندی کی جاتی رہی ہے تو اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ عبدالغفار صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے اور میرے دل میں خدا کا خوف پیدا کر دیا۔

میں نے جامعہ میں برسوں پڑھایا ہے مگر کامیابی کا احساس کبھی نہیں ہوا۔ کبھی اس کی شکایت ہوتی کہ طالب علم توجہ نہیں کرتے، کبھی اس کی کہ ان کی معلومات کم ہیں یا صلاحیت کم، بہرحال شوق کی ہم آہنگی اور جستجو کی رفاقت کا مزہ مجھے بہت کم ملا، اس کا سبب غالباً وہی ذہنی علحدگی ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ عبدالغفار صاحب اپنے مضمون کو اس طرح اپنے پاس بٹھا لیتے ہیں جیسے ماں اپنے بچے کو، اور اسے اس طرح پیار کرنے لگتے ہیں کہ دیکھنے والوں یعنی کلاس کے بچوں کو بھی پیار آنے لگتا ہے اور پھر یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مضمون کو اپنے پاس بٹھاتے ہیں یا کلاس کے بچوں کو، اب ان کا کام اُستادوں کے مدرسے میں اُردو کی تعلیم دینا ہے مگر مجھے یقین ہے یہاں بھی ان کے شاگردوں میں کم و بیش وہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہو گی جو مدرسۂ ابتدائی کے بچوں میں پیدا ہوتی تھی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء، ..... میں جب عبدالغفار صاحب طالب علم تھے اور بورڈنگ میں رہتے تھے، نگران نے شکایت کی کہ وہ شہر جاتے ہیں اور بہت دیر سے واپس آتے ہیں، دریافت کرنے پر انھوں نے کہا کہ مجھے ڈراما دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لئے شہر جاتا ہوں اور واپسی میں دیر ہو جاتی ہے۔ اسی دوران میں کسی استاد نے رخصت لی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ان کی جگہ عبدالغفار صاحب کو کلاس لینے کی ہدایت دی، دو ایک دن بعد وہ اتفاق سے اس کلاس کے سامنے سے گزرے تو انھوں نے دیکھا کہ بچے بالکل مبہوت ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہیں اور عبدالغفار صاحب اداکاری کے انداز سے سبق پڑھا رہے ہیں، اچھا استاد سبق کو اس طرح ذہن نشین کرتا ہے جیسے اداکار اپنے پارٹ کو، اور پڑھاتے وقت ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ طالب علم ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ عبدالغفار صاحب کی اصل استعداد کا اندازہ ہوا تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ان کو ٹریننگ کے لئے موگا بھیجا اور تھوڑے دن بعد ہی موگا سے ڈاکٹر ہارپر کے خط آنے لگے کہ آپ نے جو استاد ٹریننگ کے لئے بھیجا ہے اس میں بہت سی نایاب خوبیاں ہیں۔

موگا سے واپسی پر عبدالغفار صاحب مدرسہ ابتدائی کے نگراں مقرر ہوئے جامعہ کو جو لوگ دیکھنے آتے وہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور عبدالغفار صاحب کے بنائے ہوئے مدرسہ ابتدائی کو دیکھتے تھے، اسی مدرسے کا معائنہ کرنے کے بعد انگلستان کے ماہر تعلیم سالٹر ڈیویز نے مجھ سے کہا کہ میں آدھی دنیا کے مدرسے دیکھ کر آ رہا ہوں لیکن ایسا مدرسہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ یہ سنہ ۳۷ کی بات ہے۔ جب عبدالغفار صاحب مدرسہ کی نگرانی سے علیحدہ ہو چکے تھے، انھیں توقع تھی کہ ان کے ساتھی انتہائی انہماک سے کام کرنا روزمرہ کا معمول بنا لیں گے۔

محض شوق اور دلچسپی سے کام کرنا ان کے نزدیک کافی نہیں تھا وہ ایسی مروّت نہیں کرتے جس سے کارپردازی کا معیار گر جائے۔ اس لئے اگرچہ انھوں نے مدرسے میں جان ڈال دی وہ اُستادوں کو قابو میں نہ کر سکے۔ نگرانی سے علٰحدہ ہونے کے بعد انھوں نے پہلی اور دوسری جماعتوں میں سے ایک کی تعلیم اپنے ذمّے لی اور اس محدود میدان میں بھی ان کی تخلیقی قوّت نے بڑے کرشمے دکھائے، منصوبی طریقۂ تعلیم (پروجکٹ میتھڈ) میں جو منجملہ اور طریقوں کے تعلیم کا ایک طریقہ ہے اُن کے شوق اور عقیدت نے جادو کا اثر پیدا کر دیا، اور اس کی بدولت مدرسے کے معمولات کا ہر پہلو تربیت اور صلاحیتوں کو ابھارنے کا ایک بے مثل نسخہ بن گیا، سنہ ۴۲ یا ۴۳ میں عبدالغفار صاحب تیسری جماعت کے استاد تھے اور میں نے ان کی ایک ڈائری دیکھی ہے جس میں پورے سال کی کارگزاری تفصیل سے درج ہے میرا بہت جی چاہا کہ اُسے صرف اُردو میں نہیں بلکہ خود اس کا ترجمہ کر کے انگریزی میں چھپواؤں مگر وسائل کی کمی اور اپنی دوسری ذمّے داریوں نے اس ارادے کو پورا نہیں ہونے دیا۔ بہرحال عبدالغفار صاحب اپنے مختلف تعلیمی تجربوں اور طریقوں کو چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بیان کرتے رہے ہیں اور اُمید ہے کہ وقت کے ساتھ ان کتابوں کی قدر بڑھتی رہے گی۔

جامعہ کی کہانی لکھنے کے لئے عبدالغفار صاحب بہت ہی موزوں شخص ہیں، اس لئے کہ اُن کی نظر ایک معیاری اُستاد کی نظر ہے اور اُن کا دل ایسا حساس ہے کہ ان تفصیلات میں اثر اور کشش اور معنی پیدا کر دیتا ہے۔ جنھیں شاید دوسرا کوئی روزمرّہ کی باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیتا، یا خاص اہمیت نہ دیتا۔ عبدالغفار صاحب اپنے ہر سبق کو خیال اور بیان کے ذہن نشین ہونے کی ایک داستان بنا سکے ہیں اور جہاں ہم کہتے ہیں کہ ہاں، زندگی کو تو گزرنا تھا ہم نے

جامعہ میں گزاردی، وہاں انھیں شوق اور ہمت اور حوصلے کی بصیرت افروز کیفیتیں نظر آتی ہیں۔ مناسب ہے کہ اس نئے دور میں جب کہ یہ خواہش زور پکڑ رہی ہے کہ جامعہ بھی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہو جائے گذشتہ دور کی بے سروسامانی اور فاقہ مستی کے مزے بھی یاد رہیں اور جامعہ کی انفرادیت کو قائم رکھیں۔

محمد مجیب (شیخ الجامعہ)
۲۹ر دسمبر ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

برادرانِ جامعہ اور ہمدردانِ جامعہ

جامعہ کی کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، ۲۷ سال میں سے پہلے ۲۱ سال کی روداد لکھنے میں میں نے اپنی کتاب "ایک معلم کی زندگی" سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن وہ کتاب بچوں کو مخاطب کر کے لکھی تھی اور یہ آپ حضرات یعنی اپنے بزرگوں رفیقوں اور جامعہ کے عام قدردانوں اور ان لوگوں کے لئے ہے جو کبھی جامعہ کے بچے تھے اور اب خود بچوں کے باپ ہیں اس لئے مجھے طرزِ ادا میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی۔ بعد کے چھ سال کے حالات میں رسالہ ہمدرد جامعہ سے مدد ملی نیز مختصر تاریخ اور دستور العمل جامعہ سے بھی مدد ملی ہے۔ مجھے اس کا پوری طرح احساس ہے کہ جامعہ ملیہ جیسے اہم قومی ادارے کی تاریخ جیسی ہونی چاہیئے ویسی لکھنا میرے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ بزرگانِ جامعہ میں سے جو لوگ اس کام کے اہل ہیں، انہیں اس کی فرصت نہیں، میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک بار اس کہانی کو سیدھے سادے لفظوں میں کہہ ڈالوں، پھر اگر اہلِ جامعہ میں سے کسی صاحب طرزِ ادیب کو کبھی توفیق ہوئی تو وہ جامعہ کی مطلوبہ تاریخ لکھ کر اس نقشِ اوّل کو قلم زد کر دیں گے۔

ایک بات اور عرض کرنی ہے۔ جامعہ ملیہ کی تعمیر اس کے سبھی کارکنوں کا مشترک

کارنامہ ہے اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش اعتراف کی مستحق ہے۔ اس مختصر کہانی میں سب کا ذکر نہیں آسکتا تھا۔ صرف ان لوگوں کا نام آیا جن کے سپرد کوئی خاص شعبہ یا خاص خدمت تھی۔ ضمیمے میں ۱۹۲۴ء کے کارکنوں اور پھر ۱۹۴۶ء کی جوبلی کے کارکنوں کی فہرست درج کرنے سے کسی حد تک یہ کمی پوری ہو سکی۔ پھر بھی مخلص اور قابل حضرات کے نام رہ گئے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب بھائی اور بزرگ میری مجبوریوں کو پیشِ نظر رکھ کر مجھے معاف فرمائیں گے۔

آپ کا خادم
عبدالغفار مدھولی
۲۹؍اکتوبر ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا سال

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء سے جون ۱۹۲۱ء

۱۹۲۰ء میں غیر ملکی حکومت انگریز کا قبضہ ہٹانے اور اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے جب ملک میں خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کا زور تھا مولانا محمد علی اور شوکت علی اور مہاتما گاندھی ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ جوش کی لہر سارے ملک میں دوڑ گئی تھی۔ ترکِ موالات کے پروگرام میں ایک شق سرکاری تعلیمی اداروں سے تعلقات قطع کرنے کی بھی تھی لیکن علی گڈھ کے اسلامی، دارالعلوم میں بہت کچھ رجعت پسندوں کا تسلّط تھا۔ لڑکوں میں خلافت کی تحریک سے دلچسپی بہت تھی مگر رجعت پسندوں کی تربیت نے عملی قدم اٹھانے کے قابل نہ رکھا تھا۔ مولانا محمد علی اور علی گڈھ کے منتظمین میں عرصہ سے ان بن چلی آتی تھی۔ لڑکے قول میں مولانا محمد علی کے ہم نوا تھے فعل میں منتظمینِ کالج کے۔ سچ ہے غلامی تیسروں کو روباہ مزاج بنا دیتی ہے۔ اب جو تعلیم گاہوں کے چھوڑنے کا مطالبہ شروع ہوا تو علی گڈھ والے ششش و پنج میں تھے۔ کہتے ہیں کہ مولانا محمد علی اور شوکت علی نے گاندھی جی سے کہا کہ یہ کام ہم کو علی گڈھ سے شروع کرنے دیں۔

مولانا محمد علی کے پاس کچھ جوشیلے طالب علم پہنچے بھی تھے کہ آپ علی گڈھ میں آکر ترک موالات کی دعوت کیوں نہیں دیتے۔ مولانا محمد علی نے ان طالب علموں کے جوش کو علی گڈھ کے طلباء کی مشترک خصوصیت سمجھا اور اعلان کیا کہ ہم علی گڈھ آتے ہیں۔ یہ دونوں خیرِ دل بھائی گاندھی جی کو ساتھ لے کر علی گڈھ پہنچے۔ منتظمین کالج نے بھی چھپ چھپ کر مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ کچھ لوگ ان سے سوالات کرنے پر، کچھ اُن پر فقرے کسنے پر متعین ہو کر آئے۔ کالج کے طلبا کا جلسہ ہوا گاندھی جی نے تقریر کی، علی برادران نے تقریریں کیں مگر ہوا نہ جمی۔ کچھ لوگ خوش ہوئے کچھ شرمندہ، دن میں جلسہ ہوا تھا رات کو جب رجعت پسندوں کے یہاں گھی کے چراغ جل رہے تھے غیرت مند شرم سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کوئی سجدے میں پڑا ہوا تھا کوئی روتا تھا۔ یہ بہت تھوڑے سے لوگ تھے اور اکثر وہ تھے جنھوں نے جوش کے نعرے نہ لگائے تھے نہ مولانا محمد علی کو علی گڈھ میں آکر ترکِ موالات کی دعوت دینے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ خاموش سے سنجیدہ لوگ تھے مگر وہ علی گڈھ کی اس بے اعتنائی اور بے تعلقی کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ یہ اچھے طالب علم تھے چاہتے تھے کہ امتحان میں شریک ہو کر اپنی تعلیم ختم کریں اور پھر بن پڑے تو قومی تحریک میں شریک ہوں، مگر اب کیا کرتے۔ یہ کیسے دیکھتے کہ مسلمانوں کے اس عظیم الشان علمی مرکز میں خدمتِ اسلام اور خدمتِ ملک کے نام پر کچھ قربانی کا مطالبہ ہو اور ایک حلقہ سے لبیک کی آواز نہ نکلے۔ انھوں نے رات ہی رات مشورہ کیا کہ اب جو بھی ہو ہمیں کچھ کرنا چاہئے صبح ہوتے ہوتے ان کی تحریک پر یونین میں طلباء کا ایک جلسہ پھر ہوا۔ اس جلسہ کا رنگ اور تھا۔ گذشتہ دن کی حرکتوں پر ندامت اور غصہ عام طور پر پھیل چکا تھا، جوشیلی تقریریں ہو رہی تھیں۔ نعرے لگ رہے تھے کہ اتنے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی ہال میں پہنچے

جو لوگ اس وقت جلسہ میں تھے وہ ساری عمر اس کو نہ بھولیں گے۔ دونوں بھائیوں نے بس دو دو چار چار منٹ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ علی گڈھ ہمارا روحانی گھر تھا ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے۔ بہت دل شکستہ جاتے ہیں۔ خدا حافظ۔ ہزاروں نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا۔ بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ایک کہرام تھا۔ دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے۔ اس عالم میں علی برادران ہال سے چلے گئے۔ مگر یہ چند منٹ بہتوں کے لئے زندگی کے فیصلہ کن منٹ بن گئے۔ تقریروں کا جوش بڑھا۔ اسی میں کسی نے اٹھ کر یہ کہا کہ ہمیں بے شک اس ادارہ کو چھوڑنا چاہیئے یہاں کی تعلیم کی قیمت ہمارا دین ہے مگر ہمیں بہتر تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے جو لوگ ہمیں یہاں سے جانے کی دعوت دے رہے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اس بہتر تعلیم کا انتظام اپنے سر لیں۔ بات معقول تھی مگر جوش میں معقولیت کا بُرا حال ہوتا ہے چاروں طرف سے لوگ اس غریب مقرر پر ٹوٹ پڑے۔ "یہ بے ایمان ہے ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹانا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ ہمارے جوش کو ٹھنڈا کر دے۔ یہ جاسوس ہے اسے ڈاکٹر ضیاء الدین نے ملازم رکھ لیا ہے۔" اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا۔ اس پر ابن حسن صاحب (جو بعد کو جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے معلم تھے اور جوانی میں جن کی موت ایک قومی حادثہ ہے) کھڑے ہوئے کہ دوسری تعلیم گاہ کی تجویز تو ایک معقول تجویز ہے اس پر یہ زلزلہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اتفاق سے ابن حسن صاحب بھی اسی زمانے میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہو چکے تھے۔ جوش والوں نے ان پر طعنے شروع کئے۔ زاہد علی صاحب (شوکت علی صاحب کے صاحب زادے) نے خاص طور پر تقریر کی۔ مخالفت کا ایک طوفان اٹھا جس میں ابن حسن صاحب کی تقریر ڈوب گئی۔ ذاکر صاحب جو اس وقت ایم۔ اے اور ایل ایل۔ بی کے طالب علم تھے ایک عرصہ سے بیمار تھے

ایک کونے میں چپکے بیٹھے یہ سُن رہے تھے اور باوجود نور اللہ صاحب کے کہنے کے (یہ اس وقت یونین کے وائس پریسیڈنٹ تھے) اب تک کچھ نہ بولے تھے ان سے اب نہ رہا گیا۔ انھوں نے ایک زوردار تقریر کی کہ ہر معقول بات کو طعن اور تشنیع کے حربے سے اگر یوں ہی ختم کیا جائے گا تو یہ جوش کڑھی کا اُبال ہو کر رہ جائے گا بات جو کہی گئی ہے اگر صحیح ہے اور دل کو لگتی ہے تو اُسے ماننے یہ کیا کہ جو کہہ رہا ہے وہ جاسوس ہے تنخواہ پاتا ہے آخر آپ سب نے تو اپنی عقل گرو نہیں رکھی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اور ایک جداگانہ تعلیم گاہ کے قیام کی مدلل تائید کی۔ شامتِ اعمال ذاکر صاحب بھی ابن حسن صاحب کے ساتھ میں اسسٹنٹ لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے ایک دوست سید محمد صاحب (جو علی گڑھ میں DEMAND OF LABOUR. کے نام سے مشہور ہو گئے تھے) اُٹھے اور کہنے لگے "یہ شخص میرا دوست ہے یہ اچھا آدمی ہے سچا آدمی ہے مگر اس وقت اس کے سینہ میں شیطان گھس گیا ہے یہ بھی اپنی تنخواہ کو محفوظ کرنا چاہتا ہے، اس لئے یہ ترکیب کر رہا ہے کہ وقت مل جائے اور ہم کچھ نہ کر پائیں۔ دوستو دھوکا نہ کھاؤ" سید محمد صاحب نے خلوص سے یہ تقریر کی تھی اسی لئے باوجود ذاکر صاحب کے اثر کے لوگ ذاکر صاحب کی بات ماننے کے لئے تیار نہ تھے، ذاکر صاحب جن کا چہرہ نقاہت سے زرد تھا اور سارا بدن پسینہ سے تر تھا پھر کھڑے ہوئے اور اس دفعہ ان کی تقریر نے لوگوں کے خیالات کا رُخ بدل دیا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھوں نے پہلے سے بہتر دلیلیں دیں بلکہ یہ تھی کہ لوگوں کو ان دلیلوں کے پُرخلوص ہونے کا یقین دلایا۔ جب انھوں نے یہ کہا کہ میں اپنی لکچراری سے مستعفی ہوتا ہوں تو سب کے منہ بند ہو گئے۔ ابن حسن صاحب نے بھی کہا کہ میں بھی استعفیٰ دیتا ہوں جن لوگوں کو وظیفے ملتے تھے انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے وظیفے ترک کرنے کا اعلان

کیا اور وہ جوش جو ابھی تک لفظوں کے دریا کی شکل میں اُمنڈ رہا تھا اب صداقت کے دربار میں مخلصانہ صداقت کی نذر پیش کرنے لگا۔ شور اور پکار کی جگہ متانت اور عزم نے لے لی۔ اور بالآخر اس مجمع نے یہ مطالبہ منظور کیا کہ اگر موجودہ تعلیم ناقص ہے تو بہتر تعلیم کا انتظام کرنا قوم کا فرض ہے کالج سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ سرکاری تعلق کو چھوڑے اور قوم سے مطالبہ کیا گیا کہ کالج ایسا نہ کرے تو نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کیا جائے جامعہ ملیہ کا خیال یوں ان جوشیلے ناتجربہ کار لیکن پُر خلوص اور آمادۂ عمل نوجوانوں کے باہمی مشورہ سے پیدا ہوا، اسی میں اس خیال کی قوت ہے کہ یہ نقطۂ نظر "فردا" ہمارے مستقبل کی تشکیل کا ایک خیال ہے۔ یہی اس کی کمزوری ہے کہ اس میں سوچ اور غور اور تجربے کو کم دخل رہا ہے۔ قدامت پرستی اور ترقی پسندی کے معرکے میں عموماً فریقوں کی یہی قوت اور کمزوری ہوتی ہے۔ غرض ایک نئی تعلیم گاہ بننے کا خیال یہاں سے چلا، علی برادران تک یہ التجا پہنچی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری تک پہنچی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی تک پہنچی سارے مسلمان اہلِ فکر تک پہنچی۔ سیاسی کام کرنے والے عموماً تعمیری کاموں سے کچھ ٹھنڈے اور بے نمک سے کام ہوتے ہیں۔ بچتے ہیں مگر اس مطالبہ میں ایسی، صداقت تھی کہ سب نے مان لیا۔ تفصیلات میں اختلاف ضرور تھا مگر اصولاً سب نے تسلیم کیا کہ علی گڈھ قوم کے مطالبہ کو ٹھکراتا ہے تو قوم کو اپنے نوجوانوں کا مطالبہ ماننا ہوگا۔

اب سُنئے دوسری طرف کا کچھ حال، نوجوانوں نے اپنا یہ مطالبہ تو پیش کر دیا لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ کن قوتوں سے ہے۔ وہ ساری قوتیں جو اس لئے کہ وہ تاریکی کی قوتیں ہیں اپنا کام تاریکی میں چھپ کر ہی اچھا کرتی ہیں وہ پوشیدہ ریشہ دوانیاں کر رہی تھیں کہ الامان کہتے ہیں کہ اعلیٰ ترین حکام

حکومت اور کارکنانِ علی گڈھ میں براہِ راست ٹیلی فون کا رشتہ قائم ہو گیا، سارے ہندوستان سے "بہی خواہانِ قوم" اپنے سرکاری اور غیر سرکاری فرائض سے چھٹیاں لے کر اور کہیں نہ کہیں سے اپنا سفر خرچ بھی پاکر "علی گڈھ کو بچانے کے لئے" چل کھڑے ہوئے۔ منتظمین کالج نے لڑکوں کے گھروں کو خط لکھے پھر تار دیئے کہ تمہارے لڑکے کی جان خطرے میں ہے اُسے بُلالو بلکہ آکر لے جاؤ اور واقعی جان کے خطرہ کی یہ لوگ کچھ نہ کچھ تدبیریں پہلے دن سے کر رہے تھے۔ یہ ارباب حکومت کو بتا رہے تھے کہ لڑکے باغی ہو گئے ہیں ہمارے قابو میں نہیں، پولیس بھیجئے۔ فوج بھیجئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ علی گڈھ اس زمانے میں دیکھنے کی جگہ تھی۔ علی گڈھ والوں کی زبان میں "بھانت بھانت کا والدین" اقامت گاہوں میں گھومتا نظر آتا تھا۔ ایک طرف نوجوانوں کا آزادی کا جوش تھا۔ قومی خدمت کا ولولہ تھا بے غرضی تقریباً بےخودی تھی۔ دوسری طرف غلامی تھی، مصلحت اندیشی تھی، خود غرضی تھی۔ ایک طرف جوانی تھی دوسری طرف بڑھاپا، کالج کے ارباب حل وعقد نے عجب بات یہ ہے کہ طلباء کو ایک مرتبہ بھی کسی جلسہ میں آکر نہیں سمجھایا ہاں الگ چھپ چھپ کر اُن سے ملے۔ ولایت جانے کا وظیفہ دلانے کا لالچ دیتے، نوکری کے سبز باغ دکھاتے اور یوں ان نوجوانوں کی اخلاقی موت کا سامان کرتے۔ بہت سے نوجوان تو اپنے والدین کے ساتھ گھروں کو چلے گئے۔ بیٹا روتا ہوا، باپ شرمایا ہوا ریل گاڑی میں بیٹھ گویا اپنا مُنہ چھپائے جاتے تھے۔ پھر بھی کوئی تین سو لڑکے رہ گئے تھے، ان کا حال بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جلسے تھے، مشورے تھے ڈائننگ ہال سے کالج کے ارباب حل وعقد نے کھانا بند کر دیا تھا۔ لڑکوں کا اپنا انتظام تھا۔ حیدرآباد کے مقبول بھائی منتظم تھے۔ روز باہر سے کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ عجیب پُرکیف زمانہ تھا، کئی دن تک علی برادران نہ آسکے تھے۔

اب وہ بھی آئے اور اولڈ بوائز کی عمارت میں زیادہ تر مولانا شوکت علی اور خواجہ عبدالمجید صاحب کی کوششوں سے بنی تھی ٹھیرے۔ یہیں تمام اکابر آئے اور مشورے ہوئے۔ لڑکے بھی ان میں شریک ہوئے۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ اس کالج کو چھوڑ کر دوسرا ادارہ بنالیں گے، کچھ کو یہ ضد تھی کہ اس وقت تک نہ نکلیں گے جب تک جبر سے نہ نکالا جائے، ایک وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ جبر سے نکالا جائے گا تو ہم بھی جبر سے پیش آئیں گے پہلے گروہ میں حکیم اجمل خاں صاحب تھے، دوسرے کے سردار مولانا محمد علی صاحب تھے، تیسرے کے حسرت موہانی بالآخر ایک دن صبح کی نماز کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کالج کے چاروں طرف پولیس گھیرا ڈالے ہے۔ پولیس کا ایک افسر مولانا محمد علی کے نام حکم لے کر پہنچا کہ طلباء کے ساتھ کالج سے نکل جایئے، وہ قافلہ جب اس تعلیم گاہ سے نکلا ہے جسے وہ اپنے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو دیکھنے والوں کے دِل ہِل بِل گئے۔ اُن نوجوانوں کے چہروں پر ایمان کا نور تھا۔ سامنے ایک نوجوان ایک ہرا جھنڈا لئے تھا جس پر کلمہ طیبہ لکھا تھا، ساتھ ساتھ مولانا محمد علی اور دوسرے اکابر تھے۔ حکیم صاحب نے کہیں سے کچھ خیموں کا انتظام کیا تھا یہ قافلہ جاکر ان خیموں میں اُترا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی کھانا پکانے کی کسے سُدھ تھی اور کسے موقع، ابھی اپنی چھاؤنی میں پہنچے بھی نہ تھے کہ شہر کے لوگ دیگوں میں پکا ہوا کھانا ٹھیلوں پر لادے پولیس کے گھیرے سے نہتے پہنچ گئے۔ شام کو بھی کھانا شہر سے آیا۔ ہجرت میں نمازوں کا ذوق اور بڑھ گیا تھا۔ امام کلام مجید کی تلاوت کرتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ آیتیں دل میں کھبی جاتی ہیں۔ ایسی گہری مذہبیت تھی کہ شاید اس نسل کے لوگوں پر کبھی اس سے پہلے طاری نہ ہوئی تھی۔ رہنے سہنے کی خاصی تکلیف تھی۔ نوج کے سے انتظامات تھے پر فوج کا سازوسامان نہ تھا، مگر جن لوگوں نے وہ تکلیف جھیلی تھی وہ سب کہتے ہیں کہ

ایسا لطف کا زمانہ عمر بھر پھر نصیب نہ ہوا۔ رفتہ رفتہ نظم قائم ہو گیا۔ حکیم اجمل خاں، پہلے امیر جامعہ اور مولانا محمد علی، پہلے شیخ الجامعہ ہوئے۔ اونچے درجے کے طلبا میں سے بعض درس کے لئے مقرر ہوئے۔ ذاکر صاحب، نور اللہ صاحب، سید محمد صاحب، رؤف پاشا صاحب وغیرہ علی گڈھ کے استادوں میں سے مولانا اسلم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب، عبد الکریم صاحب فاروقی ترکِ موالات کر کے ان ہی لڑکوں کے ساتھ چلے آئے۔ کچھ لوگ باہر سے بلائے گئے۔ تین ہندو پروفیسر مدراس سے آئے کیلاٹ صاحب بھی اسی زمانے میں آئے۔
کالج سے نکالے جانے سے پہلے ۲۹ راکتوبر ۱۹۲۰ء جمعہ کے دن باضابطہ طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ہوا۔ علی گڈھ کالج کی مسجد میں جوش سے بھرے ہوئے طلباء اور اساتذہ جمع ہوئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے ہاتھوں رسم تاسیس ادا ہوئی جس کے بعد ان کا مشہور خطبۂ تاسیس مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا اس لئے کہ ان کی طبیعت ناساز تھی چند اقتباسات یہاں درج ہیں۔

"اے نونہالان وطن۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڈھ کی طرف بڑھایا۔ اور اسطرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڈھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف

بتلائیں لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڈھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڈھ میری طرف آیا ہے ....
مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالانِ وطن کی ہمت بلند پر آفریں، اور شاباش کہنا چاہیئے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالات انصاری کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔"

جامعہ کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور اُن عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا اُستاد بناتے۔"

اس جلسے کے بارے میں ذاکر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

" مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڈھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید، جلا وطنی، علالت اور تفکرات نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو

مددِ خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجودِ مقدّس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کرسکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں، صاحبو یاد رہے کہ وہ جسم دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو اُن کے سامنے تھے ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا۔ چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔ اسے عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیرِ نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا، یوں اور اس فضا میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو۔"

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے، حکیم صاحب نے کہیں سے خیموں کا انتظام کیا تھا۔ یہ خیمے غالباً نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے میرٹھ سے بھیجے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ ایک دو کوٹھیاں اور بھی کرائے پر لے لی گئی تھیں اور ان ہی خیموں اور کوٹھیوں کو ملا کر مہاجرین کی یہ ساری آبادی اس میں رہتی تھی۔ اکثر درس کھلے میدان میں درختوں کے نیچے ہوتے کہاں ایم او کالج کے وہ آراستہ و پیراستہ کمرے اور ان میں آرام دہ

پلنگ اور صوفے اور کہاں یہ خیمے اور بے سروسامان کمرے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھول کر بھی ان تکلیفوں کی طرف خیال نہ جاتا وہ ایک مذہبی اور ملی نشہ تھا جو کبھی ان مادی تکلیفوں کے احساس کو پاس نہ آنے دیتا تھا۔

یہ سب جذبات اور کیفیت خواہ کسی اور اثر کا بھی نتیجہ رہی ہوں لیکن سب سے بڑا اثر مولانا محمد علی کے درس کا تھا۔ مولانا کے درس کا بیشتر حصہ ڈاکٹر اقبال کی دونوں مثنویاں "اسرار خودی" اور "رموزِ بیخودی" رہا کرتی تھیں۔ مولانا اکثر ایک شعر پڑھتے اور اس کی تفسیر میں گھنٹوں صرف کرتے، بیچ بیچ میں روتے بھی جاتے اور رلاتے بھی جاتے۔ اکثر اس کی سند میں قرآن کی آیتیں بھی پڑھتے اور حدیثیں بھی نقل کرتے۔ سچ یہ ہے کہ ان مذہبی تاثرات میں لڑکوں کو قرآن اور حدیث کے مطالعہ کا اچھا خاصا ذوق پیدا ہو گیا۔ اس ذوق کے بڑھانے میں غالباً مولانا حمید الدین فراہی کا بھی بہت حصہ تھا۔ جن کے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں کوئی سات لکچر ہوئے اور لوگوں نے اس کے نوٹ اور خلاصے اس طرح محفوظ رکھے جیسے انمول موتی پا لئے ہوں۔ قرآن کی تفسیر کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی نے تاریخ اسلام پر لکچروں کے ایک سلسلہ کا بھی انتظام کیا تھا اور یہ لکچر دار المصنفین، اعظم گڈھ کے ایک رفیق مولوی سعید انصاری صاحب نے آ کر دیئے تھے۔

یہ درس اور لکچر کسی امتحان کی تیاری کے لئے نہ ہوتے تھے بلکہ ایک عظیم الشان مہم پر جانے کا پیش خیمہ ہوتے۔ طلباء یہ لکچر اور درس سُن سُن کر تیار ہوتے تھے اور ٹولیاں بنا بنا کر ملک کے مختلف حصوں میں تحریک ترکِ موالات کا پیغام سنانے بھیج دیئے جاتے۔ ہم آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ یہ چند روزہ تعلیم اور اس بے سروسامانی کے ساتھ کیسا جادو کا کام کرتی تھی!۔

اس سلسلہ میں ایک چیز یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ لوگوں کا قرآن

جامعہ کی ابتدائی زندگی

و حدیث اور علوم اسلامی سے شغف کچھ زبانی درس و تدریس ہی پر آ کر ختم نہیں ہو گیا بلکہ لوگوں نے اس کے لئے مواد اور ذخیرہ بھی جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح ایک کتب خانے کی بنیاد پڑ گئی بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے علمی دفینے نکال کر دیئے جن کی فراہمی میں مولانا رشید احمد صاحب مرحوم سابق استاد علی گڑھ کالج کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمارت پھوس کے چند بنگلوں پر مشتمل تھی جو ڈگی کوٹھی کے پاس بنائے گئے تھے۔ اکثر پڑھائی درختوں کے نیچے ٹاٹ کے فرش پر ہوتی یا جب یہ بھی نہ ہوتا تو اپنے اپنے چغے چٹائیوں کی طرح بچھا لیتے۔ یہ چغے کیا تھے زندگی کا سامان تھے۔ انھیں اوڑھتے بچھاتے اور طرح طرح سے استعمال کرتے قرآن اور حدیث کے اکثر مسائل یا میر اور سودا کے کلام کی بیشتر نکتہ سنجیاں معاشیات اور سیاسیات کے اہم ترین نظریئے اکثر ان ہی بوریوں پر حل ہوئے ہیں۔

دوسرا سال

جولائی ۱۹۲۱ء سے جون ۱۹۲۲ء

دوسرے سال کے کاموں کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "فاؤنڈیشن کمیٹی" جماعت انتظامیہ (سنڈیکیٹ) اور دیگر مجالس نے جو اہم فیصلے کئے ہیں اُن کا ذکر کیا جائے۔

جس جلسہ میں جامعہ کی رسم افتتاح ادا کی گئی اس میں فاؤنڈیشن کمیٹی، کے نام سے ۴۷، اصحاب کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی (اس کی فہرست آخر میں منسلک ہے دیکھئے ضمیمہ نمبر ۱) اس کمیٹی کا جلسہ ۲۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کو حکیم اجمل خاں کی صدارت میں ہوا۔ کارروائی کی خاص باتیں یہ ہیں۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ممبران فاؤنڈیشن کمیٹی کی فہرست سُنائی۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ ممبران فاؤنڈیشن کمیٹی کی تعداد ۱۰۰ مقرر کردی جائے دو ممبر صاحبان کے نام خارج ہو جانے کے بعد ۷۲ ممبران باقی رہے طے ہوا کہ ۱۷ ممبران منتخب کئے جائیں۔ (بعد کے یہ ۱۷، اراکین کے نام بھی آخر میں منسلک ہیں۔ دیکھئے ضمیمہ نمبر ۲

محمد علی صاحب نے کہا کہ عہدہ داروں کا انتخاب بھی کرلیا جائے۔

آنریری سکریٹری کے عہدہ کے لئے آغا محمد صفدر صاحب نے ڈاکٹر انصاری صاحب کا نام پیش کیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے کہا کہ آنریری سکریٹری کوئی مقامی صاحب کو ہونا چاہیئے تاکہ کام میں سہولت ہو، میں علی گڈھ میں متواتر رہ کر کام نہیں کر سکتا۔

مولانا شوکت علی صاحب نے حاجی موسیٰ خاں صاحب کا نام پیش کیا اور وہ باتفاق رائے منتخب ہو گئے۔ پھر مولانا محمد علی صاحب کی تجویز پر مولوی انوار الہدیٰ صاحب اور تصدق احمد خاں شیروانی صاحب جائنٹ سکریٹری منتخب کئے گئے۔

صدر کے عہدہ کے لئے متفقہ طور پر حکیم اجمل خاں صاحب کا انتخاب کیا گیا۔

جماعت انتظامیہ (سنڈیکیٹ) کے لئے حسب ذیل نام پیش ہوئے۔

(۱) عامر مصطفٰے خاں صاحب (۲) حافظ عبد الرحیم صاحب

(۳) کنور عبد الوہاب صاحب (۴) ڈاکٹر انصاری صاحب

(۵) نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب (۶) مولانا حسرت موہانی صاحب

(۷) مولانا عبد الماجد صاحب (۸) مولانا شوکت علی صاحب

(۹) آغا محمد صفدر صاحب (۱۰) مولانا آزاد سبحانی صاحب

(۱۱) پرنسپل یونیورسٹی (۱۲) صاحب صدر

(۱۳) آنریری سکریٹری (۱۴) ایک نمایندہ اسٹاف

(۱۵) اور (۱۶) دو جوائنٹ سکریٹری

یہ سب حضرات باتفاق رائے منتخب ہو گئے۔ مولانا محمد علی صاحب کی یہ تجویز منظور ہوئی کہ جب تک نیا نصاب تعلیم تیار ہو مجوزہ نصاب کو ضروری

اصلاح وترمیم کے ساتھ جاری رکھا جائے اور اس میں دینیات کا بہ بطور ایک لازمی مضمون کے اضافہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔ مہاتما گاندھی جی نے کہا کہ ہندو طلباء کی مذہبی تعلیم کے لیے یونیورسٹی کو ایک کمرہ اور وقت دینا چاہیے۔ اگر اہل ہنود مذہبی تعلیم دینا چاہیں تو پروفیسر کا انتظام وہ خود کریں البتہ جب یونیورسٹی میں طلباء کی تعداد زیادہ ہوجائے اس وقت یونیورسٹی بھی اس کا انتظام کرسکتی ہے۔

اہلِ ہنود کی تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں دروازے کھلے رہیں۔

قرار پایا کہ نظامِ تعلیم میں مناسب تبدیلی کرنے اور نیا نصاب تیار کرنے کے لیے ایک مجلس کا انتخاب کیا جائے تا کہ جدید نظام و نصاب سالِ نو سے شروع ہوجائے۔

مندرجہ ذیل اصحاب اس مجلس کے رکن منتخب ہوئے:

(۱) ڈاکٹر محمد اقبال صاحب (۲) مولوی عبدالحق صاحب
(۳) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (۴) مولانا آزاد سبحانی صاحب
(۵) ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب (۶) مولوی صدر الدین صاحب
(۷) ڈاکٹر انصاری صاحب (۸) مولانا محمد علی صاحب
(۹) محی الدین احمد صاحب (۱۰) مولوی شبیر احمد دیوبندی صاحب
(۱۱) مولی عنایت اللہ صاحب (۱۲) پرنسپل ایس۔ کے۔ رودرا، سینٹ، اسٹیفنس کالج، دہلی۔
(۱۳) پرنسپل گڈوانی (۱۴) پروفیسر سہوانی
(۱۵) سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب (۱۶) جواہر لال نہرو صاحب

(۱۷) راجندر پرشاد صاحب پٹنہ (۱۸) مولوی سید سلیمان ندوی صاحب
(۱۹) ایک ممبر اسٹاف۔

قرار پایا کہ حکیم اجمل خاں صاحب (۲) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب (۳) مولانا محمد علی صاحب کو اختیار دیا جائے کہ نصاب موجودہ میں ضروری ترمیم کر کے خلاصہ تیار کریں اور اس کا فوراً اعلان کردیں۔

تعلیم دینیات کا نصاب بنانے کے لئے مندرجہ ذیل حضرات کی ایک جداگانہ کمیٹی مقرر ہوئی۔

(۱) مولانا آزاد سبحانی صاحب (۲) مولانا سلامت اللہ صاحب
(۳) مولانا صدرالدین صاحب (۴) مولانا عبدالقیوم صاحب
(۵) مولانا داؤد غزنوی صاحب (۶) مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی
(۷) مولانا عبدالقادر صاحب (۸) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب۔
(۹) مولانا محمد علی صاحب

چند اور اہم تجویزیں جو اس سلسلہ میں منظور ہوئیں یہ ہیں:۔

(۱) اس سال ترک موالات کرنے والے طلباء جامعہ کے امتحانوں میں پرائیوٹ طور پر شرکت کر سکتے ہیں۔

(۲) جامعہ میں ایک اسکول کھولنے کا انتظام بھی کیا جائے۔

(۳) جامعہ سے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کو اصولاً منظور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق قواعد ضروری کا بنانا جماعت انتظامیہ کے سپرد کیا جاتا ہے۔

(۴) مولانا محمد علی نے تجویز کیا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ شیخ الجامعہ (پرنسپل) کا عہدہ قبول کرلیں، انوارالہدیٰ صاحب نے اس کی

تائید کی۔ یہ تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی۔ ایک تار اس مضمون کا ان کے پاس بھیجا گیا۔

جماعت امنا (ٹرسٹیز) کے نظام اساسی کے بنانے کے لئے حسب ذیل اصحاب منتخب کئے گئے۔

(۱) محمد علی صاحب (۲) تصدق احمد خاں صاحب شیروانی

(۳) نواب اسمٰعیل خاں صاحب (۴) حاجی موسیٰ خانصاحب (اکس آفشو)

(۵) ڈاکٹر انصاری صاحب (۶) خواجہ عبدالمجید صاحب (سکریٹری)

جامعہ کے مصارف کا سرسری تخمینہ دس ہزار روپیہ ماہوار کیا گیا اور یہ قرار پایا کہ مجلس انتظامیہ مفصل بجٹ بنا کر آئندہ جلسہ میں پیش کرے۔

(۵) طے پایا کہ یہ فاؤنڈیشن کمیٹی اس وقت تک کام کرے گی جب تک کہ ان قواعد و ضوابط کے مطابق جو بنائے جا رہے ہیں پہلی مجلس امنا کا انتخاب عمل میں آئے۔

ڈاکٹر اقبال نے شیخ الجامعہ کا عہدہ قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔ جب مولانا محمد علی تحریک آزادی کے سلسلے میں جیل چلے گئے تو دوسرے شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب مقرر ہوئے خواجہ صاحب کے جیل جانے پر ڈاکٹر محمد عالم شیخ الجامعہ کا کام کرتے رہے۔ مگر جیسے ہی موصوف قید فرنگ سے رہا ہو کر واپس آئے۔ ڈاکٹر عالم صاحب نے انھیں چارج دیدیا۔

اس سال کالج کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مدرسے کی پڑھائی کا بھی سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع ہوا لیکن یہ مدرسہ صرف ثانوی کی حد تک (ہائی اسکول کی جماعتیں) تھا۔ . . . . اور یوسف پاشا صاحب جو علی گڈھ کالج

کے ان ممتاز نوجوان طالب علموں میں تھے جنھوں نے کالج چھوڑ کر جامعہ میں شرکت کی تھی سب سے پہلے نگراں (ہیڈ ماسٹر) مقرر ہوئے۔ ابتدائی جماعتیں اگلے سال سے شروع ہوئیں۔

ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں صاحب اور ان کے ساتھ سعید انصاری صاحب اور دوسرے طلباء نے پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ ایک قلمی رسالہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا نام پہلے "الرشید" تھا پھر بدل کر مولانا محمد علی کے تخلص کی نسبت سے "جوہر" رکھا گیا۔ رسالہ کے سرورق پر مولانا کا یہ شعر بھی درج ہوتا تھا جو اس کے مقاصد اور کارکنوں کے جذبات کا ترجمان تھا۔

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

یہ رسالہ ہفتہ وار نکلتا تھا اور اس میں طلبہ کے مضامین جامعہ سے متعلق خبریں اور حالات حاضرہ پر تبصرے بھی ہوتے تھے، لوگوں کو ہر ہفتہ اس پرچہ کا بڑی بے صبری کے ساتھ انتظار رہتا تھا اور کارکنان جامعہ اس کے تبصروں اور تنقیدوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ کالج کا مسلم آرگن بن گیا اور اسے جامعہ کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔

اس زمانے میں طلبہ کی علمی دلچسپیوں میں دوسری اہم چیز کالج کی انجمن اتحاد تھی جو نہ صرف نام میں بلکہ کام میں بھی علی گڈھ کالج کی یونین کا مثنیٰ تھی۔ اکثر یہ انجمن کالج کے طلبہ کے اندر اتحاد نہیں بلکہ اختلاف پیدا کرنے کا باعث ہوتی پھر بھی یہ ان کے لئے نہ صرف تقریر کی مشق کا ذریعہ تھی بلکہ ان کی نیابت اور ترجمانی کا واحد وسیلہ بھی تھی۔ اس کے سب سے پہلے نائب صدر علی گڈھ کالج کے یونین کے نائب صدر سید نوراللہ صاحب، ناظم اکبر علی

خاں صاحب بیرسٹر حیدرآباد (دکن) مہتمم کتب خانہ پیر الٰہی بخش صاحب تھے۔ دوسرے سال انتخاب جو ہوا وہ مولوی سعد الدین انصاری صاحب ندوی کا ہوا اور ان کی قابل یادگار صدارت انجمن کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی تیسرے سال شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی باری آئی۔ ان کے زمانے میں انجمن کی کارکردگی اور قوت بڑھ گئی

اس سال کے واقعات میں ذاکر صاحب کا یورپ جانا ایک قابلِ ذکر واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب ایک طرف جامعہ کی کارکن جماعت میں شامل تھے اور دوسری طرف ایک طالب علم کی شان سے طلبہ میں گھل مل کر رہتے تھے ان کی جدائی سب پر شاق تھی۔ ذاکر صاحب کا باہر جانے کا ارادہ بہت پہلے سے تھا۔ غالباً انھوں نے علی گڑھ کالج کے زمانے ہی میں پاسپورٹ وغیرہ لے لیا تھا لیکن ترک موالات کے ہنگامے کی وجہ سے نہ جا سکے۔ اب حالات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو انھیں اپنا ارادہ پورا کرنے کا موقع ملا۔ اور وہ برلن (جرمنی) یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ سب اہلِ جامعہ نے رنج اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انھیں خدا حافظ کہا۔

اس سال جامعہ کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ اس کے چند اقتباسات یہاں درج ہیں :-

"ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ماحول کا بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

جہاں ہندو طلبار کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبار بھی اہم ہندو رسوم اور ہندو تہذیب و تمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے کہ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم و تفہم پر منحصر ہے۔"

اساتذہ سے مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

برادران محترم۔ آپ غالبًا اس ذمّہ داری سے بخوبی واقف ہوں گے جو اس جامعہ کے معلم کی حیثیت سے آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آپ کا کام یہاں اپنے متعلمین کو صرف کتاب کے اسباق پڑھا دینا نہیں ہے۔ آپ اگر محسوس کریں تو آپ کے ہاتھ میں وہ اثر پذیر مادّہ دیا گیا ہے جس سے ملّت اسلامی کے مستقبل کی عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس پختہ اور محکم عمارت میں لگائے جانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ان کی تمام خامیوں کو زمانہ تعلیم میں دور کر دیں اور آپ یقینًا جانتے ہوں گے کہ یہ کام زبانی درس سے ممکن نہیں اس کے لئے عمل کی زبان درکار ہے۔ آپ کو اپنے شاگردوں کے سامنے اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کرنا ہوگا کیوں کہ انسان کی فطرت درس کے مقابلے میں ایک اسوۂ حسنہ سے نسبتًا جلد سبق آموز ہوتی ہے۔ آپ کو اپنی زندگی میں خلوص و ایثار، حق پسندی اور تقویٰ کی ایسی مثال پیش کرنی ہوگی جو آئندہ ان کے لئے چراغِ ہدایت کا کام دے سکے۔ میں تو اس ذمہ داری کا خیال کرکے لرز جاتا ہوں جو اس وقت آپ کے بازوؤں پر ہے۔"

طلبار کی ہمت افزائی کرتے ہوئے انھیں تعلیم کا حقیقی مقصد ان الفاظ میں سمجھایا۔

"عزیزان گرامی! میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ اس پُر آشوب زمانہ میں جس سے ہماری قوم اور ہمارا ملک اس وقت گزر رہا ہے تم نے اس قدر پامردی اور بلند حوصلگی سے کام لیا میں ان تکالیف سے واقف ہوں جو تمہیں اکثر اٹھانی پڑیں، میں تم میں سے اکثر کی مالی مشکلات سے بھی آگاہ ہوں اور میں اس بُرے سلوک سے بھی بے خبر نہیں جو تم میں سے اکثر کو اپنے اعزا کے ہاتھوں جھیلنا پڑا ہے لیکن صد آفریں ہے تم پر اور تمہاری ہمتوں پر کہ تم امتحانوں میں پورے اُترے تم میں سے بہت سے آج جیل خانوں کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں لیکن یاد رکھو یہ سب مصیبتیں چند روزہ ہیں۔ اگر تم اپنے اعلیٰ مقاصد اور ارادوں پر قائم رہے تو یہ تمام مشکلیں سہل ہو جائیں گی۔ تم جانتے ہو کہ انسان کے لئے دنیا میں حقیقی مسرت اور شادمانی کا وجود اس وقت ممکن ہے جب اس کے مقاصد میں رفعت، اس کے خیالات میں علو اور اس کے مطمع نظر میں وسعت ہو۔ وہ اپنے دل کے اندر نوع انسان کی محبت کے جذبۂ صادقہ کے لئے جگہ رکھتا ہو اور دنیا میں باطل کے فنا اور حق کے قیام کو اپنے وجود کی غایت جانتا ہو، اس کے مقاصد کی بلندی اور اس کے مساعی کا خلوص اسے مادی علاقوں سے ایک گونہ بے نیاز کر دے۔

جہاں مادی ذرائع کی کمی ایک پست ہمت آدمی کے لئے سنگ راہ کا کام کرتی ہے وہاں اس کے لئے ان کا نہ ہونا گویا اس کی حریت نفس اور آزادیٔ فکر کی راہ سے رکاوٹوں کا ہٹ جانا ہوتا ہے۔ وہ جب اپنی منزل کی پُر خطر اور مشکل راہ پر اتقلل من الدنیا کی سچہ

شماری کرتا ہوا گامزن ہوتا ہے تو اس سازوسان کا بار اس کی دشواریوں میں اضافہ کرنے کے لئے موجود نہیں ہوتا۔ تم میں سے اکثر پر میرے یہ کلمات صادق آتے ہوں گے اور تم اپنی بے سروسامانی کے باوجود اپنے ضمیر کے اطمینان اور اپنی روح کی آزادی پر جس قدر فخر کرو بجا ہے۔

لیکن عزیزانِ من! میں اس جگہ تمہیں ایک خطرے سے متنبہ کئے دیتا ہوں اور وہ یہ کہ اپنی آزادی کے معنی کہیں بے راہ روی اور مطلق العنانی نہ سمجھ لینا۔ حقیقی آزادی کی تو پہچان ہی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اپنی مرضی سے اپنے مقاصد کو مدنظر رکھ کر کسی آئین محکم کے ماتحت لے آئے تم کہیں غلطی سے حریت کو بے اصولی کا مرادف نہ سمجھ لینا۔ دنیا کی ہر متمدن جماعت میں اور علی الخصوص ملت اسلامی میں فرد کی ہستی دراصل ایک امانت ہے جسے صرف مقاصد علیہ کے حصول کے کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے اور اس وجود کا ہر دوسرا استعمال دراصل ایک بڑی خیانت ہے جس کا جواب دینا ہوگا۔

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

آخر میں سند پانے والے طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا:۔

تم میں سے جن لوگوں کو آج جامعہ کے آخری امتحان کی سند مل رہی ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی تعلیم کا زمانہ ختم ہوگیا۔ درحقیقت اب ان کی تعلیم کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جب وہ دنیا کے مکتب میں زندگی کی ابجد سیکھیں گے ان سے اس وقت میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ زندگی کے کسی رہ گذر میں اپنے کو پائیں لیکن اس پیغام حق کو نہ بھولیں

جس کی تبلیغ و اشاعت اُن کے وجود کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ وہ دنیا سے اگر کچھ سیکھنے جائیں تو اس کے عوض اسے نجات کا وحید راستہ سکھانے کی کوشش بھی کریں۔ وہ سمجھ لیں کہ وہ دنیا میں ایک خادم اور داعئ حق کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں اور کسی گروہ یا فرقہ کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی خدمت کے لئے۔ کیونکہ وہ اس تعلیم کے حامل ہیں جو دنیا سے نسب و نسل کے امتیازات مٹانے اور انسان کے "سر دامن" کو "گرد وطن" سے پاک کرنے کے لئے آئی تھی وہ اپنے کو حقیر اور بے یار و مددگار نہ سمجھیں کیونکہ جس نے ایک خدائے قہار کے آگے اپنے سر نیاز کو خم کیا وہ کسی دوسرے کی مدد کا محتاج نہیں وہ اس پیغام کے ایلچی ہیں جو دنیا کے حقیقی دکھ کا تنہا درماں ہے۔

بے خبر تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ہم سب کی آنکھیں تم پر لگی ہیں۔ ہمیں مایوس نہ کرنا۔"

تیسرا سال

جولائی ۱۹۲۲ء تا جون ۱۹۲۳ء

جامعہ پر سیاسی رنگ کے بجائے رفتہ رفتہ تعلیمی رنگ چڑھنے لگا۔ اب جامعہ کی تعلیم زیادہ باضابطگی اور پابندی سے ہونے لگی۔ مدرسہ اور کالج کی باقاعدہ جماعت بندیاں ہوئیں۔ ابتدائی کی جماعتیں بھی کھل گئیں۔ فاؤنڈیشن کمیٹی نے ۱۹۲۰ء ہی میں نصاب تعلیم تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی..... مولانا محمد علی نے کمیٹی کے ممبران کی مدد سے ایک تعلیمی اسکیم تیار کی اور اس کی روشنی میں ابتدائی جماعتوں سے لے کر کالج کی اونچی جماعتوں تک کے لئے نصاب بنایا گیا۔ تمام مضامین میں آرٹس کی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ سب منزلوں میں صنعت و حرفت کو اہمیت دی گئی اور اس کا مقصد یہ رکھا گیا کہ طلبہ ذہن و دماغ کے ساتھ ساتھ ہاتھ کا کام بھی کرنا سیکھیں تاکہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ اپنے لئے مختلف معاشی شعبوں میں جگہ حاصل کر سکیں، قفل سازی، الیکٹرو پلیٹنگ، پالش، صحافت، کپڑا بننے، جلد بندی، لیتھو اور ٹائپ کی طباعت

تصاویر، لائن اور ہاف ٹون بلاک بنانے، کاپی رائٹنگ، شارٹ ہینڈ، اور ٹائپ رائٹنگ کی تعلیم کے انتظامات ہوئے۔ غرض دو سال کے ہنگامی عرصے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کو صحیح معنوں میں ایک آزاد قومی تعلیمی نظام کے حامل ادارہ کی شکل دیدی گئی۔ ترکِ موالات سے پہلے قومی رہنما علی گڈھ کالج کو ایک ایسی مسلم یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے جسے ملک کے ہر حصّہ سے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ہو تاکہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک ہمہ گیر قومی نظام تعلیم تشکیل دے سکیں، حکومت نے مسلمانوں کے تعلیمی ادارے کو یہ حق دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے حکومت کے اثر سے آزاد رہ کر ملک میں اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس سے ملک کے کئی اسکولوں نے الحاق کرالیا اور اُسے ایک ناظر المعارف (انسپکٹر آف اسکولز) کا عہدہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ۱۹۲۲ء کے آخر تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے مندرجہ سترہ اسکولوں نے اپنا اپنا الحاق منظور کرالیا۔ (ضمیمہ ۳ ملاحظہ ہو)

جامعہ میں ہر مضمون کے لئے الگ الگ استاد ہندوستان کے مختلف حصوں سے بلا کر رکھے گئے۔ (۱) فہرست ضمیمہ نمبر ۲ میں ملاحظہ ہو۔

معمل حکمیات (سائنس) کے لئے اور سامان فراہم کیا گیا۔ پریس مستحکم ہو گیا، جس کے منیجر عبد العلی صاحب تھے، اسی سے ملحق ایک شعبہ تصنیف و تالیف قائم ہو گیا جس کی نگرانی پر نور الرحمٰن صاحب مقرر ہوئے۔ جامعہ کے آرگن کے طور پر جنوری ۱۹۲۳ء سے رسالہ جامعہ نکلنے لگا۔ اس کی ادارت بھی نور الرحمٰن صاحب کے سپرد ہوئی۔ طلبہ کی برادری میں مدرسہ کے اندر انجمن اتحاد کی طرح "بزم کمال" کے نام سے حافظ فیاض احمد صاحب کی

اساتذہ وطلباء جامعہ علی گڈھ ۱۹۲۵ء

دائیں سے بائیں کھڑے ہوئے: حبیب داد خاں صاحب، جمال احمد صاحب، عبدالقادر صاحب جونپوری، محمد سرور صاحب، عبدالقادر صاحب سیالکوٹی، محبوب علی صاحب، یوسف حسین خاں صاحب، سید انصاری صاحب،

کرسیوں پر: نصیر الدین صاحب، ارشاد الحق صاحب، طاہر الیس محمدی صاحب، عبدالعزیز انصاری صاحب، لاروس محمد حیات صاحب، شفیق الرحمن قدوائی صاحب، ای جے کیلاٹ صاحب،

بیٹھے ہوئے: عبدالسلام صاحب، عبدالعلیم انصاری صاحب، محمد معین الدین حارث صاحب، چوہدری اکبر علی صاحب، سی کے نائر صاحب، قاضی محمد سعید صاحب، [illegible] صاحب۔

نگرانی میں ایک انجمن قائم ہوئی۔ تربیت جسمانی کے سلسلہ میں اسکاؤٹنگ کی ابتدا بھی ہوئی، غرض جامعہ نے ہر لحاظ سے ایک سیاسی اور عارضی ادارے کے بجائے ایک مستقل اور تعلیمی ادارہ کی شکل اختیار کی اور اس کے اس تبدیل ہیئت میں جہاں اس کے دوسرے شیخ الجامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کا بہت بڑا ہاتھ تھا، وہاں ان کے جیل چلے جانے کے بعد ان کے قائم مقام ڈاکٹر محمد عالم صاحب نے بھی ان روایتوں کو زندہ رکھا۔

اس سال میں ایک سب سے قابل ذکر واقعہ جلسہ تقسیم اسناد ہے جو ہندوستان کے مشہور سائنس داں پی۔ سی۔ رائے کی صدارت میں ہوا جلسہ کی سب سے بڑی خصوصیت صدر کا خطبہ تھا جو مسلمانوں کے علمی اور سائنٹفک کارناموں کی ایک روشن داستان تھا اور یہ داستان ایک غیر مسلم کی زبان سے اور بھی حیرت کی بات تھی۔ چند اقتباسات یہاں درج ہیں۔

"یہ یونیورسٹی اُن محترم ہستیوں کے زیر سایہ یعنی مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کی تعلیمات کے زیر اثر ہے جن کی عزت سے ہمارے دل لبریز ہیں، میں اپنی طرف سے، اور مجھکو یقین ہے کہ ان سب کی طرف سے بھی جو یہاں اس وقت موجود ہیں اس غم و تاسف کے احساس کا اظہار کرتا ہوں جو ان دونوں ہستیوں کے جیل میں جانے کی وجہ سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ چاہے وہ موجود ہوں یا نہ ہوں، میں دست بدعا ہوں کہ ان کی پیدا کی ہوئی روح اس یونیورسٹی کی رہنمائی کرے۔ خدا کرے کہ ہندوستانی قومیت کے ہیروز کا بے تعصبانہ طرز عمل، سچائی اور حقانیت کی جستجو، ان کا جذبۂ وطن پرستی اور ان کے دیگر محاسن [illegible] آئندہ ترقی کے راستہ پر مشعل راہ کا کام دیں اور

اس دارالعلوم میں تعصب، جہالت، اور مذہبی و قومی تنگ نظری کو کوئی جگہ نہ ملے۔ باوجود اتنی مسافت اور اپنی بیگانگی کے آپ کے کارکنوں کی غیر متعصبانہ اور شریفانہ رویّہ نے آپ کی اس دعوت کے قبول کرنے میں میری ہمت افزائی کی۔ میں نے آپ کی آواز پر اس لئے اور بھی لبیک کہا کہ مجھکو پورا یقین تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جیسا ایک بھائی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ایک عرصہ دراز سے بنی نوع انسان روشنی کی تلاش میں ہے، گو اس آواز کو ہمیشہ دبانے اور فنا کر دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اگر وہ روشنی میسر ہو جائے تو تمام انسانیت اس کی خواہش یک قلم ترک کر دے، یہی سچائی، حقانیت اور روشنی کی طلب ہے جو انسان کو تقرب الٰہی عطا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ اس روشنی کو تمام اقصائے عالم میں پھیلانا ہمیشہ سے مشرق کا فرض رہا ہے۔ جیسا کہ مشہور قول ہے کہ "Ex Oriente lux" مشرق کو چاہیئے کہ اس کی تصدیق کرے۔

یونیورسٹی کا یہی وہ پہلو اور یہی وہ مقصد ہے جو سائنس کے قدیم طلبا کی حیثیت سے مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف مائل کرتا ہے۔ تعصب تنگ دلی اور تنگ نظری تمام تاریخ بنی نوع انسان میں انسانی ترقی کے سب سے بڑے دشمن رہے ہیں اور شخصی حکومت کے مضر اور روح فرسا اثرات انسانی دماغ کے تعطل میں سب سے زیادہ شدید ثابت ہوئے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ تہذیب دشمن کی خاطر سائنس کی سب سے بڑی، سب سے بہتر اور سب سے مستقل خدمت، تحکم و جبروت سے بغاوت، صداقت کی جستجو اور معقولیت کی حمایت رہی

ہے اور آج یہاں ایک سائنس داں کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے میں آپ سے اس علم صداقت اور نشانِ حرّیت کو ہمیشہ بلند رکھنے کی درخواست کرتا ہوں۔

اگرچہ میں وہ بات زبان سے نکال رہا ہوں جو ممکن ہے کہ تہدیدی الفاظ معلوم ہوں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ ان تبصروں سے میری مراد دوستانہ مشورے کے سوا کچھ بھی نہیں اور مجھے تو اس معاملہ میں بالکل شبہہ نہیں بلکہ اس کے برخلاف مجھے کامل وثوق ہے کہ حق وصداقت خالص تعلیم وتعلم اور آزادیٔ افکار کی یہ تحریم وتکریم اس یونیورسٹی کی ویسی ہی خصوصیت امتیازی ہوگی جیسی عہدِ ماضی میں ترقی اسلام کی تھی۔ میں اسلام کی روایات علمیہ سے واقف ہوں، مسلمانوں نے سائنس، علوم وفنون اور فلسفہ کی جو خدمتیں انجام دی ہیں مجھے معلوم ہیں ....

جب یورپ کی دنیا بربریوں کے حملوں سے زوال پذیر ہوکر ناگفتنی تاریکی کے گڑھے میں جا پڑی تھی، اگر اس وقت اسلام کمک نہ پہنچاتا اور اعلیٰ علوم کی تخم ریزی کرکے اس کی پوری پرداخت نہ کرتا اور حق وحرّیت کی جاں بخش آب وہوا میں اس کی تربیت کرکے انھیں پھولنے پھلنے نہ دیتا تو میں پوچھتا ہوں کہ آج دنیا کہاں ہوتی۔ اور تہذیب جدیدہ کا نشان کہاں ملتا۔؟ قرونِ وسطیٰ میں مسلمان اہلِ علم، اہلِ سائنس اور فلاسفہ نے مشرق، مصر، یونان کا تمام علم نہایت احتیاط کے ساتھ محفوظ کرلیا اور محفوظ ہی نہیں کرلیا بلکہ ان کی تہذیب واصلاح میں اضافہ کیا اور ترتیب دی۔ کوئی شخص، گبن، سیدیو، لین پول،

ڈریپر، سر سید امیر علی اور اس عہد کے دوسرے مورخین کے فصیحانہ اوراق کو پڑھکر مسلمانوں کی آزادی خیالات، جدت، تحقیقات اور تنوع تحصیلات پر حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ علم کی محبت اور صداقت کا احترام اسلام کے خمیر میں داخل تھے، نبی عربی (علیہ السلام) نے علم کی قدر و قیمت یوں بتائی: "علم حاصل کرو کیونکہ جو خدا کی راہ میں تحصیلِ علم کرتا ہے وہ پرہیز گاری کا کام کرتا ہے جو علم کا چرچا کرتا ہے وہ خدا کی حمد و ثنا کرتا ہے اور جو اس کی جستجو کرتا ہے وہ خدا کی عبادت کرتا ہے۔ جو علم سکھاتا ہے، صدقہ دیتا ہے، اور جو ان لوگوں کو تعلیم دیتا ہے جو اس کے اہل ہیں وہ خدا کی راہ میں جاں نثاری کرتا ہے.... طالب علم کی روشنائی ....شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے جو طلب علم میں سفر کرتا ہے، اُسے خدا بہشت کی راہ دکھاتا ہے۔" مجھے اب اور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں غالباً آپ بھی سنتے سنتے تھک گئے ہوں گے، لیکن پھر بھی اسلام کی ذہنی و علمی کارناموں کی داستان ناکافی رہی اور گو میں تصویر کے اس درخشاں رخ سے ایک لمحہ کے لئے بھی منہ نہیں پھیر سکتا۔ جو کسی قوم یا ملک کے لئے انتہائی فخر و ناز کا باعث ہو سکتا ہے۔ تاہم ہم کو اپنے آباد اجداد کے ان درخشاں کارناموں پر مطمئن نہ ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ہماری ذہنی و دماغی کمزوری ہوگی بلکہ ہم کو ان کی مثال، ان کی روح ان کے ذوق علم و فن، ان کے بے تعصبانہ تحصیل کمال کو جو قوم و ملک کی قید سے یکسر پاک تھا اور جس نے اسلام کو روشن کر دکھایا آج بھی اپنے لئے شمع راہ بنانا چاہیئے۔ انھیں روایات اسلامی کی بنا پر

مجھے اس خیال سے آج ایک مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ صداقت و آزادی کی ہمیشہ علم بردار رہے گی۔

لیکن ایک دوسرا خطرہ لاحق ہے جس پر عموماً جماعتی یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جس سے اس قسم کی درس گاہیں غرق آب ہو جاتی ہیں۔ میری مراد اس سے جماعتی تنگ نظری اور مذہبی تعصب ہے جس کے متعلق ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بھی میں مایوسی کی طرف مائل نہیں اور ہر موقع پر مجھے خواہ مخواہ خطرہ نظر نہیں آتا۔ اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ دو بزرگ ہستیاں جن کے نام نامی اس تعلیم گاہ کے ساتھ وابستہ ہیں، خود اس امر کی ضامن ہیں کہ ہندو مسلم اخوت اس درسگاہ میں ہمیشہ جاری و ساری رہے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تعصب کا یہ ناگوار جذبہ اس کی مقدس چار دیواری کے اندر کبھی قدم نہ رکھے گا اور اگر بے خبری کی حالت میں کبھی آ بھی گیا تو اس کو جمنے کا موقع نہ دیا جائے گا۔ تاہم جہاں کہیں ایسا امکان ہو احتیاط مشکل ہوتی ہے اور اسی کے متعلق میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔

ہندوستان ایک متحد الاقوام قومیت رکھتا ہے۔ گو دوسرے ممالک کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں مختلف قومیں اور نسلیں آباد ہیں لیکن یہ اقوام و ملل حب وطن کے ایک طلائی رشتہ میں سب کے سب منسلک اور وابستہ ہیں۔ اس مجموعہ اقوام میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلم جو سب سے زیادہ مشہور رہیں اگر دونوں باہم متفق و متحد رہیں تو متحدہ ہندوستانی قومیت کا وجود قطعی ہے اور کوئی وجہ

نہیں کہ وہ باہم متحد نہ رہیں، ....

اگر ہم ہندوستان میں مسلمانوں کی رواداری اور بے تعصبی کو اس زمانہ کے یورپ کی رواداری سے مقابلہ کریں تو ہم کو صاف فرق نظر آجائے گا۔ میں یہ باتیں مسلمان حاضرین کے خوش کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میری قطعی رائے ہے اور آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر اس وقت بھی تھی جب کہ میں ایڈنبرا میں طالب علم تھا اور میں نے ایک رسالہ "ہندوستان غدر سے پہلے اور بعد" کے نام سے لکھا تھا۔ ....

....

میں جانتا ہوں کہ مادر وطن کے وہ (مسلمان) ویسے ہی حقیقی سپوت ہیں جیسے کوئی بڑے سے بڑا محب وطن ہندو۔ میں ان سے یہ گذارش کروں گا کہ مسلم جماعت میں اخوت اور حب وطن کا جذبہ ہمیشہ جاری رہے اور یہی وہ پیام محبت ہے جس کی تبلیغ و اشاعت اس قومی یونیورسٹی کو کرنی ہے۔ اس کو تمام ہندوستان کے سامنے اخوت اور بھائی چارہ کا نمونہ پیش کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اپنے نصب العین کی تکمیل اس کے ان بانیوں کے خوش کرنے کا بہترین ذریعہ ہوگی۔ جن کے لئے ہندو مسلم اتحاد بطور عقیدہ کے تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی ابتدا بہت اچھی ہوئی ہے۔ جو کارروائیاں کہ اس تعلیم گاہ نے کی ہیں وہ بہت ہمت افزا ہیں۔ یہ کہنا اس کے لئے کافی ہوگا کہ یہاں کے طلبا میں بہت سے ہندو طلبا بھی ہیں اور اسٹاف کی فہرست میں بھی متعدد ہندو اساتذہ کے نام موجود ہیں۔ مزید برآں

ہندو طلباء کی مذہبی تعلیم کے لئے بھی خاص انتظام تھے اور کئی خالص ہندو مدارس اس سے ملحق ہیں۔ خدا کرے کہ یہ برادرانہ جذبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

چوتھا سال

جولائی ۲۳ء سے جون ۲۴ء

ابتدا میں جامعہ ملیہ کا کوئی دستور مرتب نہیں ہوا جس میں اس کے اغراض و مقاصد وضاحت سے بیان کیے جاتے، لیکن اس کے بانیوں یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی تقریروں اور تحریروں میں جن مقاصد کا اظہار کیا گیا وہ یہ تھے۔

(۱) یہ تعلیم گاہ حکومت کے اثر سے آزاد قومی اور ملی مصالح کی پابند ہو۔

(۲) اس کی تعلیم میں دینی اور دنیوی، قدیم اور جدید عناصر کا صحیح امتزاج ہو۔

(۳) وہ ملک کی آزادی اور ہندوستانی قومیت کی تحریک میں حصہ لے۔

ایک عرصہ تک فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) اپنی منتخب کردہ جماعتیں مجلس انتظامی (سنڈیکیٹ) اور مجلس تعلیمی (اکیڈمک کونسل) کے ذریعے

جامعہ کا کام چلاتی رہی اس طرح فاؤنڈیشن کمیٹی نے مجلس اُمناء کا درجہ حاصل کر لیا تھا، اس کے اراکین ان طبقوں پر مشتمل تھے۔

(۱) مرکزی اور صوبائی خلافت کمیٹیوں کے نمایندے۔

(۲) ان لوگوں کے نمایندے جو جامعہ کی بڑی بڑی رقموں سے مدد کرتے تھے۔

(۳) مسلمانوں کے رجسٹری شدہ اداروں اور انجمنوں کے نمایندے۔

(۴) رجسٹرڈ مسلمان گریجویٹس کے نمایندے۔

(۵) جامعہ کی انجمن طلبائے قدیم کے نمایندے۔

(۶) جامعہ کی مجلس تعلیمی اور مجلس انتظامیہ کے نمائندے۔

(۷) امیر جامعہ کے نامزد کردہ حضرات

(۸) وہ لوگ جنھیں مجلس امناء اپنا ممبر چُنے۔

مجلس انتظامی کے پچیس اراکین تھے جن میں سے امیر جامعہ، شیخ الجامعہ نائب شیخ الجامعہ ...... ناظم جامعہ اور مسجّل جامعہ اپنے عہدوں کی بناء پر اس کے رکن ہوتے۔ دو اراکین جامعہ کے نامزد کردہ ہونے اور ایک رکن کو شیخ الجامعہ نامزد کرتے تھے۔ باقی تمام اراکین مجلس امناء اور مجلس تعلیمی سے ہوتے تھے۔ مجلس منتظمہ کے کنوینر (داعی) کے فرائض ناظم جامعہ کے ذمے تھے۔ مجلس تعلیمی میں دو ممبر مجلس منتظمہ کے منتخب کردہ اور باقی جامعہ کے مختلف عہدہ دار ہوتے تھے۔ مجلس تعلیمی کے معتمد کے فرائض مسجّل کے ذمہ تھے۔ پہلے چند سال میں جو لوگ ان جماعتوں کے ممبر رہے ان کے ناموں کی فہرست کتاب کے آخر میں درج ہے ضمیمہ نمبر ۴ میں دیکھئے۔

سنہ ۲۴-۱۹۲۳ء کے تعلیمی سال میں جو اساتذہ کام کر رہے تھے ان کی

فہرست ضمیمہ ملا میں ملاحظہ فرمائیے۔ کالج کے طلبہ کو اخبار نویسی (صحافت) سکھانے کے لئے ایک نو مسلم مسٹر داؤد اپسن اسی سال جامعہ میں تشریف لائے ثانوی کے طلبار کے لئے تجارتی حساب کتاب Book Keeping کا انتظام بھی کیا گیا۔

کالج کے لڑکے "کرشنا کوٹھی" اور "بنگالی کوٹھی" میں رہتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی کے طلبار مطبع سے متصل فرید منزل، دلکشا منزل، مشرف منزل اور کچی بارک میں تھے، ان کے اتالیق حافظ فیاض احمد صاحب اور سید نذیر نیازی صاحب تھے۔

اس وقت حافظ صاحب کی نگرانی میں مدرسہ کی انجمن "بزم کمال" بہت زوروں پر تھی۔ انعامی مقابلے، مدرسہ کے مسائل، حالات حاضرہ، بحث والے مضامین، نظمیں، غرض سبھی ... پروگرام بہت دلچسپ ہوا کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جمعرات کا دن جب بزم کمال کا جلسہ ہوتا تھا سب لڑکوں کے لئے خوشی کا دن ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کالج میں تو بہت لڑکے تھے جو ایم، اے، او کالج علی گڈھ اور دوسرے سرکاری مدرسے چھوڑ کر آئے تھے۔ ان کی "انجمن اتحاد" بھی عروج پر تھی۔ جلسے "محمد علی ہال" میں ہوتے تھے۔ ابتدائی اور ثانوی والوں کو شریک ہونے کا موقع ملتا تھا، بیشتر استاد بھی حصّہ لیتے تھے۔ اس لئے "بزم کمال" کی کامیابی پر اس انجمن کا بھی اثر پڑا۔

"انجمن اتحاد" اور "بزم کمال" کی مسند نشینی کے جلسے بھی خاص جشن کی حیثیت رکھتے تھے سب لوگوں کو ان کا انتظار رہتا اس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ یہ دونوں انجمنیں مدرسہ کی دلچسپیوں کا خاص مرکز تھیں۔

اس زمانے میں جامعہ کے طلباء کا حوصلہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ "انجمن اتحاد" کے نائب صدر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کے خطبۂ صدارت کے ایک حصّے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"برادران جامعہ! انسان کی تمدنی زندگی کا یہ ایک بہترین اصول ہے کہ جب بہت سے کام ایک ہی وقت میں غور طلب ہوں تو سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ کی جاتی ہے جس کی انجام دہی وقت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہو۔ چنانچہ میرے نزدیک انجمن اتحاد ملیہ کا اولین فرض اور مقصد اس وقت صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی ان ذمہ داریوں کا حقیقی طور پر احساس کریں جو اس جامعہ کے حلقہ میں داخل ہونے کے بعد ہم پر عائد ہوتی ہیں، ذمہ داریوں کی تشریح اجمالاً صرف اسی قدر کی جا سکتی ہے کہ ہم اپنے میں اس قدر صلاحیت پیدا کریں کہ اگر جامعہ کا بوجھ اساتذہ کے کاندھوں سے اٹھا کر ہم پر ڈال دیا جائے تو ہم اس کے متحمل ہو سکیں اور ہر وقت جامعہ کی تمام کمزوریوں کو رفع کرنے کے لئے ہم بھی اسی طرح ساعی و کوشاں رہیں جس طرح ہمارے اساتذہ،

حضرات! اس حقیقت سے آپ بھی واقف ہوں گے کہ ہر تعلیم گاہ کے قیام کے لئے دو ہی عنصر سب سے زیادہ ضروری ہوا کرتے ہیں، ایک اساتذہ کا حلقہ دوسرے طلباء کی جماعت اسی حیثیت سے دونوں کی ذمہ داریاں بھی مساوی ہوتی ہیں لیکن اس کلیہ کا تعلق جہاں تک ہماری جامعہ سے ہے میں یقین کے ساتھ

کہہ سکتا ہوں کہ ہماری ذمہ داریاں اساتذہ کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں، یہ ہماری سب سے بڑی خود فراموشی ہوگی، اگر ہم اس کا اندازہ ابھی سے نہ کرلیں یہ

ستمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آئے تو جامعہ کے تمام طلباء کی طرف سے محمد علی ہال میں جلسہ ہوا، اقبال کی مشہور نظم،

"ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند"

بڑے جوش کے ساتھ پڑھی گئی۔ مولانا نے ایک جوش دلانے والی تقریر کی اور اپنا وہ شعر بھی سُنایا جو رہا ہوتے وقت کہا تھا۔

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
پر تیرے اسیروں کی دعاء اور ہی کچھ ہے

اس جلسے میں انجمن اتحاد کے نائب صدر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی نے اپنے سپاس نامہ میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا تھا "ع "وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے" اس پر مولانا نے اپنی وہ مشہور تقریر کی جس سے جامعہ کے متعلق ان کا اصل خیال ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ "ہم نے کبھی تعمیر کا ارادہ کیا ہی نہیں تھا جس کی حسرت آج ہمارے دل میں ہو۔ جامعہ کی یہ آبادی تو مدینہ کے مہاجرین اور انصار کے لوگوں کی طرح ہے جو فتح مکہ کے انتظار میں ہیں ہمارا اصل قلعہ تو علی گڈھ کالج ہے جس پر ہمیں ایک نہ ایک دن قبضہ کرنا ہے"

جلسوں کا ذکر آیا ہے تو ایک اور جلسہ کا ذکر کر دوں جس کا شمار جامعہ کے پہلے دور کے بڑے جلسوں میں ہوتا ہے۔ یہ تھا "تقسیم اسناد کا جلسہ"

اس کے صدر مشہور نومسلم انگریز محمد مارماڈیوک پکتھال تھے۔ کئی دن پہلے سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ محمد علی ہال اور اس کے احاطے کو پھول پتیوں اور سبزے سے سجایا گیا تھا۔ مہمانوں کے لئے جا بجا خیمے لگے ہوئے تھے۔ لڑکوں کی طرف سے دکانیں کھولی گئی تھیں۔ حامد علی خاں صاحب کی نگرانی میں اسکاؤٹ جلسے کا انتظام کر رہے تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ جامعہ کے تمام طلبا اور اساتذہ ایک ہی لباس میں تھے اور سب نے ہرے ہرے چغے پہن رکھے تھے۔ بڑے پیمانے پر سب لوگوں کے لئے دعوتی کھانے کا انتظام تھا۔ بیشتر کام ثانوی کے بڑے اور کالج کے طلبا نے کیا تھا کیوں کہ اس زمانے میں یہی لوگ پیش پیش رہتے تھے اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی۔

رات میں طلبا کا مشاعرہ ہوا، طبیعت موزوں ہو تو اکبر علی صاحب مزاحیہ نظمیں کہہ لیتے ہیں۔ آپ کی ایک نظم پر حاضرین لوٹ لوٹ گئے۔

جامعہ کے سابق طالب علم رانا جنگ بہادر کی زبانی جامعہ کا یہ رنگ بھی دیکھئے۔

"اس وقت میری آنکھوں کے سامنے وہ چاروں کوٹھیاں پھر رہی ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کا شاندار منظر دکھاتی تھیں۔ ان کوٹھیوں میں ہم لوگوں کا ہوسٹل تھا۔ ایک کوٹھی ہماری تندرستی کے رکھوالے ڈاکٹر ضیا صاحب کو ملی ہوئی تھی اور باقی کوٹھیوں میں لڑکے رہتے تھے، ان میں دس پانچ نہیں، درجنوں ہندو طالب علم تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا صوبہ ہوگا جس کے نوجوان نمائندے ان طالب علموں میں نہ موجود ہوں، آسام، بنگال اور بہار، پنجاب، مدراس اور مہاراشٹر سبھی صوبوں کی قومیت کی پیاسی جوانی کا جامعہ کے پنگھٹ پر میلا لگ گیا تھا۔ ہوسٹل میں ہندوؤں،

اور مسلمانوں کے باورچی خانے تو الگ الگ تھے مگر ساتھ کھانے پینے میں کسی قسم کا پرہیز نہ تھا۔ دعوتوں اور ضیافتوں میں سب کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھتے تھے اور ایک ہی جگہ سے چپاتی، دال، ترکاری اور گوشت لے کر کھاتے تھے۔ اسی کو بھائی چارہ اور دانت کاٹی روٹی کہتے ہیں۔ ان دنوں کی جامعہ میں اس کا کیا خوب سماں بندھتا تھا۔

والی بال وغیرہ انگریزی کھیلوں کے ساتھ کبڈی اور دوسرے، دیسی کھیل بھی برابر چلتے تھے۔ اس چہل پہل میں میل ملاپ خوب پھولتا پھلتا تھا۔ پوشاک میں بھی یکسانی تھی۔ ہر شخص سفید کھدّر کا کرتہ اور پاجامہ یا دھوتی پہنتا تھا، شلوار بھی دیکھنے میں آتی تھی............ جو ذرا شوقین تھے وہ ذرا نفیس کھدّر استعمال کرتے تھے۔ اوپر سے بڑھیا اچکن ڈانٹتے، اور اپنے تنگ پائجامے کی چوڑیاں اچھی طرح چن کر جنیلی سی بناتے تھے۔ یہی نہیں وہ اپنی ٹوپی پر ذرا سی بھی شکن نہیں آنے دیتے تھے اور اسے پہنتے بھی تھے۔ ٹھسّے کے ساتھ، آخر تھے تو ان میں زیادہ تر وہی لوگ جو ابھری ہوئی شان و شوکت اور نکھری ہوئی لطافت و نزاکت کے گھر، علی گڈھ یونیورسٹی کو چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ جامعہ کے ہوسٹل کو بھی اپنے منجھے ہوئے مذاق کے مطابق انھوں نے سجایا مگر غالیچوں کی جگہ سادی دریاں رکھیں اور مل کے کپڑے کی چاندنی کی جگہ کھدر کی سفید چادریں بچھائیں۔ دروازوں کو بھی انھوں نے ننگا نہیں رہنے دیا۔ ان کی برہنگی کو پردوں سے چھپایا مگر وہ پردے کھدّر ہی کے تھے، ہاں ان کے چھاپے میں سادہ پن نہیں بلکہ بھڑکیلا پن تھا مگر وہ سودیشی کے اصول کو نہیں توڑتا تھا۔ سودیشی اور سودیشی پریم دونوں ہی کے جامعہ

والے دل سے قائل تھے ۔ دن رات انھیں باتوں کا چرچا ہوتا رہتا تھا اور ہندو اور مسلمان طالب علم ہی نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان استاد بھی ان چٹ پٹی باتوں میں بڑے شوق سے حصہ لیا کرتے تھے ۔

جامعہ میں ہندو طالب علموں ہی کی نہیں، ہندو استادوں کی بھی خاصی بڑی تعداد تھی ان میں زیادہ تر پروفیسر تھے جو سرکاری کالجوں کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے، میرے رہتے رہتے ان میں سے دو ایک صاحب چلے گئے ۔

ایک آسامی پروفیسر تھے ۔ شاید پروفیسر بروا ان کا نام تھا۔ انکے تلفظ پر ہم چھپ کر ہنستے تو ضرور تھے مگر ساتھ ہی ان کی قربانی کی تعریف بھی کیا کرتے تھے ۔ کہاں آسام اور کہاں یوپی ۔ وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک دلکش خیال کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے ۔ اور اس دلکش خیال کے پالنے پوسنے میں مست تھے ۔ پروفیسر گپتا سائنس پڑھاتے تھے ۔ پروفیسر سنگھل، اکنامکس اور گپتا، اور شری سوریا کانت شاستری سنسکرت ۔ شاید جامعہ کے علی گڈھ چھوڑ کر دہلی آنے سے پہلے ہی یہ سب تتر بتر ہو گئے ۔ پروفیسر گپتا دیرہ دون کے کسی کالج میں چلے گئے ۔ اب نہ جانے کہاں ہیں ؟ پروفیسر سنگھل شاید ہولکر کالج میں ہیں اور شاستری جی اب آکسفورڈ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم پا کر کسی کالج میں پڑھا رہے ہیں ۔ پروفیسر ہادی حسن کو میں کبھی نہیں بھول سکتا شکسپیر پڑھایا کرتے تھے ۔ انگریزی کا لہجہ بہت حسین تھا اور شیریں آواز کے سانچے میں الفاظ ڈھل کر جاندار چیز کی طرح ہمارے سامنے آتے تھے ۔ ان کے گلابی تن پر کھدر کا باریک لباس کھل اٹھتا تھا مگر ان کی طبیعت اس پر

نہیں جمتی تھی۔ وہ آخر بدک گئی اور ان کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر علی گڈھ یونیورسٹی میں لے گئی۔

پروفیسر طاہر ایس محمدی بمبئی سے آئے تھے۔ جتنے دبلے پتلے تھے اتنے ہی تیز طرار تھے۔ پڑھاتے بہت اچھا تھے۔ مگر سب سے اچھا پڑھاتے تھے پروفیسر کیلاٹ۔ جب وہ علی گڈھ میں آئے تھے تب ان کے سر میں شاید ہی کوئی سفید بال ہوگا۔ میں نے ان کا جیسا پڑھانے کا ڈھنگ کسی کا نہیں دیکھا۔ ادھر وہ سیاہ تختے پر جملے لکھتے تھے ادھر وہ جملے ہم لوگوں کے ذہن پر نقش ہو جاتے تھے، کسرتی، گٹھیلے جسم والے پروفیسر کیلاٹ ہم لوگوں کے دماغ کے لئے خوراک مہیا کرنے پر بس نہیں کرتے تھے ہمیں ٹوک ٹوک کر اپنا جیسا تندرست جسم بنانے کے لئے ہمارے دلوں میں ڈمبل کے اسپرنگ جیسی اُچھلنے والی خواہش پیدا کیا کرتے تھے۔ پروفیسر کیلاٹ کے لئے دنیا میں جامعہ کے سوائے اور کچھ نہیں تھا یہی ان کی دنیا تھی۔ پھر کیوں نہ جامعہ کے لڑکے ان پر ہزار جان سے نثار ہوتے۔ ہم اپنے شیخ الجامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کی بھی بڑی عزت اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی نیشنلزم خالص دودھ کی سی تھی۔ وہ سدا ہنستے رہتے تھے اور ان کی ہنسی کی چاندنی میں ہم ہندو اور مسلمان سبھی طالب علم مزے لیتے تھے۔

جامعہ میں سرکاری کالجوں کی طرح پروفیسروں کے لئے میز اور کرسی اور لڑکوں کے لئے ڈسک اور بنچیں نہیں تھیں۔ چٹائیوں پر کھدر کی چادریں بچھی رہتیں اور بعض وقت چادریں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ استاد اور شاگرد انھیں پر بڑی خوشی سے بیٹھ جاتے تھے اور پڑھائی

بڑے مزے میں ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے جامعہ کے رجسٹرار یعنی حیات صاحب یاد آگئے۔ انھوں نے اپنے کمرے میں چھانٹ کر اوّل درجے کی دری بچھا رکھی تھی۔ اس پر شاید دو ایک غالیچے بھی تھے۔ ان پر بے داغ سفید چادریں بچھایا کرتے تھے۔ خود بھی بے داغ اور بے شکن کپڑا پہنا کرتے تھے، وہ جب کام کرنے بیٹھتے تھے تو کام کی طرف ان کا اتنا دھیان نہیں ہوتا تھا جتنا کہ کپڑوں کی طرف۔ ان کی شوقینی میں جو صفائی تھی وہ ضرور اپنانے کی چیز تھی۔ مسٹر ڈی جی آیپن کو جو جامعہ کے جرنلزم ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے، نہ اپنے کپڑوں کے میلے ہونے کا خیال ہوتا تھا اور نہ ان کی شکنوں کے ٹوٹنے کا وہ پھٹی پرانی چٹائی پر بھی بڑی بے تکلفی سے لڑکوں کے ساتھ بیٹھ جایا کرتے تھے۔ مسٹر آیپن اینگلو انڈین تھے اور بعد میں مسلمان ہو گئے تھے مگر زیادہ تر کوٹ پتلون ہی پہنتے تھے۔ جامعہ میں اچکن اور چوڑی دار یا ڈھیلا پائجامہ پہننے کا رواج تھا مسٹر آیپن کے لئے زمین پر بیٹھنا ایک مصیبت کا سامنا تھا۔ کبھی وہ اکڑوں بیٹھ جاتے اور کبھی پاؤں پسار کر ایک ہاتھ کے اوپر سارے جسم کا بوجھ ڈال دیتے تھے۔ خوش مزاج وہ ایسے تھے کہ اپنی ہنسی آپ ہی اُڑاتے رہتے تھے ....

وہ اپنے کو چوپایہ (Beast) کہا کرتے تھے اور اپنی بیوی کو پری (Beauty) وہ بہرے بھی تھے اور اشاروں سے باتیں کیا کرتے تھے مگر ان کی قابلیت کے سامنے ان کی سب خامیاں چھپ جاتی تھیں۔ اپنے زمانے کے ہندوستانی اخبار نویسوں میں جہاں تک چٹ پٹے چٹکلے لکھنے کا تعلق ہے وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں تو وہ اپنے عجیب قلم سے لوگوں کو کراری چوٹیں بھی لگا سکتے تھے مگر اس سے جب

وہ لوگوں کو گدگدانا شروع کرتے تھے تو پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑجاتے تھے وہ کئی چوٹی کے اخباروں کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ہندوستان کی اخبار نویسی کی تاریخ میں اُن کا نام اس لئے بھی ہمیشہ زندہ رہے گا کہ وہ اس ملک میں جرنلزم کی باقاعدہ تعلیم جاری کرنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ ان سے اخبار نویسی کا جو ہنر میں نے سیکھا وہ اس لائن میں میری پہلی پونجی تھی۔

جامعہ کے طالب علموں کی انجمن کے جو جلسے ہوتے تھے وہ دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ میں الہ آباد یونیورسٹی میں اچھے بولنے والوں میں گنا جاتا تھا۔ لیکن یہاں کے جوشیلے مقررین کی تقریروں کے سامنے میری تقریر ایسی ہی لگتی تھی جیسے گنگا کے سامنے گومتی۔ ڈاکٹر اشرف کی آواز، جب کمیونزم کا زور تھا، کہاں نہیں گونجتی تھی۔ کچھ نوجوان جامعہ میں ایسے تھے جو دن رات دُنیا کو چھان ڈالنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ان میں کئی نے اپنے خواب کو عملی جامہ پہنایا۔

سچ تو یہ ہے کہ جامعہ کی فضا میں وہ جادو تھا جس کے اثر سے جوانی کے پہلو میں چھپی ہوئی تمام خصلتوں کو، کلیوں کی طرح چٹک کر کھلنے کا موقعہ ملتا تھا، اس کے پھول ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں"

پانچواں سال

جولائی ۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۲۵ء

۱۹۲۱ء میں جامعہ نے پہلا عارضی نصاب تعلیم شائع کیا تھا، چونکہ
دوسرے مدارس سے آنے والے طلبہ یہاں تعلیم پا رہے تھے، فوری طور
پر ان کے میٹرک اور سندی امتحانات کا معاملہ سامنے تھا۔ اس لئے اس
نصاب میں سرکاری مدرسوں کے عام نصاب کے مقابلہ میں کچھ اہم
تبدیلیاں نہ تھیں مگر دراصل مولانا محمد علی کی یہ خواہش تھی کہ ہر منزل کے
طلبا، قرآن پاک کی تعلیم سے واقف ہوں اور اردو کی ایسی ریڈریں
تیار کی جائیں جو اردو اور معلومات دونوں مضامین کا کام دیں اس لئے
موصوف نے ایک ایسی اسکیم تیار کی جس میں اسلامیات کے ساتھ ساتھ
عربی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا۔ نیز اردو اور معلومات کے مضامین
ایک ساتھ پڑھانے کے لئے کتاب الدروس کے نام سے ریڈروں کا ایک
سلسلہ تیار کرنے کی تجویز رکھی۔ یہ اسکیم اخبارات میں اور ماہرین تعلیم کے
پاس رائیں حاصل کرنے کے لئے بھیجی گئی، ان کی آراء کی روشنی میں مناسب
ردوبدل کرکے مجلس تعلیمی نے ایک مفصل نصاب تعلیم ہر منزل کے لئے

منظور کیا جس کی خاص باتیں یہ تھیں۔

۱۔ مسلمان بچوں کے لئے دینیات اور ہندو بچوں کے لئے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی تھی۔

۲۔ جو طلبا، اُردو زبان اول کے طور پر نہ پڑھنا چاہیں ان کے لئے ہندی کا متبادل نصاب رکھا گیا۔

۳۔ ہندی کو زبان اول کی حیثیت سے پڑھنے والے طلبہ کیلئے آسان اُردو کا سیکھنا ضروری تھا۔

۴۔ چوتھی جماعت سے عربی زبان اور انگریزی کی تعلیم لازمی تھی۔ ہندو طلبا، کے لئے عربی کی بجائے سنسکرت کا انتظام تھا۔

۵۔ پانچویں جماعت سے کسی ایک حرفہ کا سیکھنا ضروری تھا۔

۶۔ خوش خطی کی تعلیم کو نصاب کے ایک لازمی جز کی حیثیت دی گئی تھی۔

بی۔اے۔ کی مدت تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُس زمانے کی تقسیم کی طرح ہائی اسکول کی تعلیم دسویں جماعت تک، اس کے بعد ایف۔ اے کے دو سال اور بی۔ اے۔ کے دو سال نہیں تھے بلکہ آجکل کی طرح ہائی اسکول کی تعلیم گیارھویں جماعت پر ختم کر کے بی۔ اے۔ کی تعلیم کے لئے تین سال رکھے گئے تھے۔ یہ بات واضح رہے کہ شروع کے گیارہ سال میں ایک درجہ "مکتب" کا تھا جسے آج کل پہلی جماعت کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے جامعہ میں اُس زمانے کے ثانوی چہارم کے معنی گیارھویں جماعت کے تھے۔ بہت بعد میں ایسا ہوا کہ ہم نے سرکاری تعلیم کی تقلید میں دسویں جماعت کو ثانوی چہارم کا درجہ دیا۔ بہر حال اب تو جامعہ کی پہلی

تقسیم کے مطابق بیشتر جگہ ہائر سکنڈری کے گیارہ سال اور بی۔ اے۔ کے تین سال رکھے گئے ہیں۔

عام بی، اے کے علاوہ بی۔ اے۔ امتیازی (آنرز) کی تعلیم بھی ہوتی تھی۔

"صحافت" اور "تجارت" کے ڈپلوما کورس پڑھانے کا بھی انتظام تھا۔

علی گڈھ کالج سے آنے والے اساتذہ اور طلبہ میں بعض قابل ترین لوگ تھے۔ اس لئے شعبۂ تصنیف و تالیف قائم ہوتے ہی، معیاری کتابیں تیار ہونے لگیں۔ یہ کارکنوں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ ایک بڑا پریس جامعہ کو مل گیا تھا جس کے ناظم عبدالعلی صاحب تھے کتابیں چھپوانے کی سہولت تھی۔ شروع میں کتابیں فروخت کرنے کا کوئی الگ شعبہ نہ تھا مگر گذشتہ سال "مکتبہ جامعہ" کے نام سے .... اس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ایک سال کے عرصہ میں مولانا محمد اسلم صاحب کی تاریخ الامت کی دو جلدیں، مولانا محمد سورتی صاحب کی ازہار العرب شائع ہوگئیں۔ قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا انتخاب شائع ہوا۔ ذاکر حسین خاں صاحب کی کتاب "مبادیٔ معاشیات" اور بچوں کی کتابوں میں "ترکوں کی کہانیاں" شائع ہوئیں مولانا نیاز فتحپوری کی کتاب "اخبار الدولتین" اور نور الرحمٰن صاحب کی کتاب "انتخاب کلام میر" طباعت کے لئے تیار تھی۔

مولانا محمد حسین محوی لکھنوی نے تاریخ فیروز شاہی کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ضائع ہوگیا۔ مولانا محمد مسلم صاحب عظیم آبادی مشہور عربی لغت "المنجد" کا ترجمہ کر رہے تھے۔ یہ دونوں حضرات

شعبہ تصنیف و تالیف کے ارکین بھی تھے۔ اس شعبہ کے ناظم نورالرحمٰن صاحب تھے اور مکتبہ کے مہتمم بھی آپ ہی تھے۔

ان دنوں ذاکر صاحب جرمنی میں تھے۔ موصوف نے "مطبع شرکت کاویانی، برلن" سے مکتبہ جامعہ کا معاہدہ کرا دیا، مطبع شرکت کاویانی برلن، علوم فارسی جدیدہ اور علوم مشرقی کی خدمت کے لئے مشہور تھا۔ ذاکر صاحب نے اس مطبع کی شائع کردہ بعض خوبصورت کتابیں، مکتبہ میں بھجوائیں جن میں "سفرنامہ خسرو"، "تیاتر"، "موش وگربہ" وغیرہ مشہور ہیں۔

موصوف نے دیوان غالب کا پاکٹ ایڈیشن بھی بہت خوبصورت چھپوا کر بھجوا دیا۔ ان دنوں یہ دیوان خوب بکا۔

رسالہ "جامعہ" کی خریداری بڑھنے لگی۔ مدرسہ میں جہاں "جوہر" اور "چمن" جیسے سنجیدہ علمی رسالے نکلا کرتے تھے "لوقان" اور "پنچ" کے نام سے مزاحیہ رسالے بھی موجود تھے۔ "لوقان" کے مدیر فیاض حسین صاحب تھے جنھوں نے بعد میں "ہونہار" نکالا تھا۔ ان رسالوں میں ہنسنے ہنسانے والی باتیں اور کارٹون بھی ہوتے تھے۔

جہاں تک ظاہر میں نظم و ضبط کا تعلق ہے علی گڈھ کالج کی طرح یہاں بھی ہر طرح کے انتظامات تھے۔

طلباء کی صحت، شفاخانہ جامعہ کا انتظام اور شفاخانہ میں رہنے والے مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے میڈیکل آفیسر کا انتظام بھی تھا۔

طلباء کی سہولت کے لئے "اتحادی دکان" کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اس دکان کا سرمایہ طلبا کے ہاتھ حصے فروخت کر کے فراہم کیا گیا تھا اسٹیشنری کے علاوہ اس دکان میں چاء اور اس کے لوازمات موجود رہتی

تھے۔ لباس کے بارے میں دستور العمل میں لکھ دیا گیا تھا۔

"تمام ارکان جامعہ سے .... توقع ہے کہ وہ کھدّر کا لباس استعمال کریں گے۔ تقریبات کے موقع پر کھدّر کا سادہ سبز چغہ جس کی آستینوں پر زرد کنارہ ہے استعمال کیا جاتا ہے، طلباء کو اس چغہ کا استعمال جماعت میں، ..... شیخ الجامعہ کی خدمت میں اور اپنے استادوں اور دیگر اراکین جامعہ سے ملنے کے وقت نیز، شہر اور اسٹیشن جانے کے وقت استعمال کرنا ضروری ہے۔"

فیسوں میں ابتدائی کے طلباء سے ۱۵ روپے اور ثانوی کالج سے ۱۶ روپے ۱۲ آنے لئے جاتے تھے، جس میں فیس تعلیم، قیام، طعام، اخراجات دارالاقامہ، فیس طبی امداد، کھیل اور انجمن اتحاد کی فیس شامل تھی۔

غریب طلباء کے لئے امدادی وظائف کے علاوہ ذہین اور کام کرنے والے طلباء کے لئے طرح طرح کے وظائف تھے۔

طلباء کی فیسوں سے اُن کے قیام، طعام، اور دیگر اخراجات کا کام چل جاتا تھا۔ جامعہ کے مصارف کے لئے متفرق چندوں کے علاوہ جتنی رقم درکار تھی وہ مرکزی خلافت کمیٹی ادا کرتی تھی۔

جامعہ نے ایک قومی سیاسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے اس کی پرورش اور دیکھ بھال کا فرض ابتداء میں سیاسی رہنماؤں ہی کو انجام دینا پڑا۔ نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملّیہ اسلامیہ) کی فاؤنڈیشن کمیٹی خلافت تحریک کے سرگرم کارکنوں ہی پر مشتمل تھی اور اس کمیٹی نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو جو جماعت انتظامیہ تشکیل دی اس میں بھی زیادہ تر یہی لوگ تھے جامعہ کے اخراجات کا تمام بار اس زمانہ میں مرکزی خلافت کمیٹی ہی پر تھا۔

جامعہ کے قیام سے ایک سال تک کا زمانہ سیاسی ہنگاموں اور مذہبی جوش وخروش کا زمانہ تھا۔ اس وقت ایک قومی تعلیمی درسگاہ کے لئے، سیاسی تنظیم سے علیحدہ رہنا ممکن بھی نہ تھا لیکن جامعہ کے کارکنوں کے سامنے پہلے ہی سے یہ حقیقت تھی کہ تعلیم کو عملی سیاست سے آزاد رکھنا چاہیئے۔ وہ خلافت کمیٹی کی امداد کے باوجود جامعہ کو خلافت کمیٹی کا تابع بنانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ مرکزی خلافت کمیٹی نے نومبر ۱۹۲۲ء کو اپنے ایک جلسہ میں یہ تجویز پاس کر دی تھی کہ جامعہ ایک آزاد ادارہ ہے اور کسی دوسری جماعت کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے تعلیمی کام کرنے والے یہ سمجھتے تھے کہ جب تک جامعہ ملیہ کے پاس مرکزی خلافت کمیٹی کی امداد کے علاوہ ایک جداگانہ فنڈ نہ ہوگا اسے صحیح معنوں میں ایک خالص تعلیمی ادارہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ۱۹۲۲ء کے آخر میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے ملک وقوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور لوگوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک خاص تعلیمی ادارہ کی حیثیت میں قائم اور باقی رکھنے کے لئے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع کر دی۔

جامعہ .... نے اگرچہ ۱۹۲۳ء کے شروع میں خلافت کمیٹی کے اثرات سے آزادی حاصل کرنا شروع کر دی تھی اور اس کا میزانیہ منظوری کے لئے خلافت کمیٹی میں جانا بند ہو گیا تھا لیکن دراصل جامعہ کا وہ انتظامی دور جب اس نے ایک خود مختار ادارے کی حیثیت حاصل کر لی اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی منتقل کیا گیا۔

۱۹۲۴ء جامعہ کے لئے بڑی آزمائش کا سال تھا۔ ملک میں سیاسی جوش وخروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ خلافت تحریک بے جان پڑ گئی تھی اس کی طرف

سے جامعہ کو جو امداد مل رہی تھی وہ بند ہو گئی تھی۔ وہ سیاسی قدیمی رہنما جنھوں نے ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہیجان اور ملی جوش سے متاثر ہو کر تعلیمی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے اور ایک نئے نظام تعلیم کے جاری کرنے۔ یکے بعد دیگرے انقلاب کے نتائج کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے مشکل کام سے کنارہ کش ہو رہے تھے۔ ایسے لوگ بہت ہی کم تھے جو قومی تعلیم گاہوں کے قیام کو زمانۂ انقلاب کا سب سے اہم واقعہ سمجھتے تھے۔ انقلابی جد و جہد کی ناکامی نے مسلمان رہنماؤں کے حوصلے پست کر دئے تھے اور وہ ایک آزاد تعلیمی درسگاہ یعنی جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چلانے کی ذمہ داری لیتے ہوئے گھبراتے تھے اس کی ایک وجہ، شاید یہ بھی تھی کہ ان بزرگوں نے جو اس تعلیمی انقلاب میں ہراول کی حیثیت رکھتے تھے کبھی اس کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا کہ وہ علی گڈھ کالج سے علیحدہ رہ کر پھلے پھولے۔ وہ جامعہ کی آبادی کو ایسے مہاجرین اور انصار کی جماعت سمجھتے تھے جو فتح مکہ کی منتظر رہے۔ ان کا اصلی مرکز تو علی گڈھ کالج تھا اور ان کے دلوں میں اس پر قبضہ کرنے اور جامعہ کا پرچم لہرانے کی حسرت تھی۔ ناکامی، اور مایوسی نے انہیں اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اتنا نہ سمجھ سکتے تھے کہ دوسرے قلعہ کو فتح کرنے سے پہلے اپنے قلعہ کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے دوسری صورت یہ تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کر دیا جائے۔ ایک ایسے آزاد قومی ادارہ کو چلانے کی ذمہ داری لینے سے جسے حکومت کی طرف سے مدد لینا عار معلوم ہوتا ہو ان لوگوں کو یہی آسان نظر آیا کہ اسے بند کر دیا جائے۔

ایسی نازک حالت میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دل اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہ تھے اور وہ اپنے خون سے سینچی ہوئی کھیتی کو اس طرح

ضائع ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے یہ جامعہ کے طلبا اور کارکنوں کی وہ جماعت
تھی جس نے جامعہ کے کام کو اپنا کام بنا لیا تھا اور اس کو چلانے کے لئے
ہر قسم کی مصیبتیں جھیلنے کے لئے تیار تھے۔ ان کا ایک ساتھی (ذاکر حسین)
اس وقت اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ گیا ہوا تھا اور خیال یہ تھا کہ وہ واپسی
پر جامعہ کے چلانے میں ان کا ہاتھ بٹا سکے گا۔ ان لوگوں نے انھیں تار دیا
کہ مجلس اُمناء کے اراکین جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بند کرنے کی تیاریاں کر
رہے ہیں کیا مشورہ ہے؟ ذاکر صاحب نے جواب میں لکھا کہ "میں اور
میرے چند ساتھی جامعہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے
تیار ہیں۔ ہمارے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیا جائے۔" جامعہ کے
فارغ التحصیل طلبہ کا ایک وفد دہلی میں حکیم اجمل خاں صاحب سے ملا۔
اُن ہی دنوں جامعہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے دلی میں مجلس امناء کا
جلسہ ہونے والا تھا۔ وفد کے اراکین نے حکیم صاحب سے درخواست
کی کہ وہ ذاکر صاحب کے آنے تک جامعہ کو بند نہ ہونے دیں۔ انھوں
نے حکیم صاحب کو یہ یقین دلایا کہ وہ جامعہ کے لئے ہر قسم کی تکلیفیں برداشت
کرنے کے لئے تیار ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا "میں جامعہ ملیہ کو دہلی لے
آؤں تو تم لوگ اس کے لئے کس قدر قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو؟"
وفد کے اراکین نے بالاتفاق کہا کہ ہم جامعہ کو قائم رکھنے کی خاطر بلا کسی
معاوضہ کے کام کرنے کو تیار ہیں۔ حکیم صاحب نے انھیں اطمینان دلا کر
واپس بھیج دیا۔ مجلس امناء کے اجلاس میں جامعہ کو جاری رکھنے اور
بند کرنے کے مسئلہ پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ حکیم صاحب نے مجلس امناء
سے یہ تجویز پاس کرالی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دہلی منتقل کر دیا جائے اور

اُسے چلانے کی ذمہ داری انھوں نے خود اپنے سر لے لی ۔ یہ وقت جامعہ کے لئے بہت نازک تھا۔ عام قومی فضا میں مایوسی تھی، ڈر تھا کہ علی گڈھ سے دہلی لے جانے میں جامعہ ختم نہ ہو جائے ۔ جامعہ کے بہی خواہ بھی جامعہ کو بند کرنے کا مشورہ دے رہے تھے ۔ مالی امداد کی صورت کہیں سے نظر نہ آتی تھی ۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے جب ان چیزوں کا ذکر مہاتما گاندھی سے کیا اور کچھ مایوسی ظاہر کی تو گاندھی جی نے فرمایا کہ جامعہ کو تو چلانا ہی ہوگا۔ آپ کو روپیہ کی دقت ہے تو میں بھیک مانگ لوں گا۔ حکیم صاحب فرماتے تھے کہ اس سے میری ہمت بندھی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جامعہ کے کام کو ہرگز بند نہ ہونے دیا جائے ۔ بالآخر ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی (بنیادی جماعت) نے فیصلہ کیا کہ جامعہ دہلی میں منتقل کی جائے ۔ اس سلسلہ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کے دو جلسے ہوئے ان کی کارروائی حسب ذیل ہے ۔

روئداد جلسہ فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ ۲۸ جنوری ۱۹۲۵ء یوم چہارشنبہ بر دولت خانہ عالی جناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب امیر جامعہ دہلی "شریف منزل" بوقت پانچ بجے شام ۔

(۱) قرار پایا کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کا یہ جلسہ عالی جناب سیٹھ جمال محمد صاحب (مدراس) کا عطیہ نقد یکمشت ایک ہزار روپے اور پچیس ۲۵ روپے ماہوار کے مستقل امداد کے وعدہ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے ۔

(۲) امیر جامعہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب نے جامعہ کے متعلق زبانی کیفیت بیان فرمائی ۔ جس پر کچھ دیر گفتگو ہونے کے بعد قرار پایا کہ جامعہ کو جاری رکھنے یا اس کو بند کرنے کا سوال ایک کمیٹی کے سپرد کیا

جائے جو بعد مشورہ اس کے متعلق اپنی رائے پیش کرے۔

اسمار ممبران کمیٹی۔

(۱) حکیم اجمل خاں صاحب (امیر جامعہ) (۲) مولانا شوکت علی صاحب۔
(۳) مولانا محمد علی صاحب (۴) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب
(۵) ڈاکٹر انصاری صاحب (۶) عبدالمجید خواجہ صاحب شیخ الجامعہ

(۳) قرار پایا کہ کل شام کو فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ پھر کیا جائے۔

چنانچہ دوسرے روز پھر جلسہ کیا گیا جس میں مہاتما گاندھی بھی شریک ہوئے۔ اور بعد گفتگو قرار پایا کہ جامعہ کو جاری رکھا جائے اور اس کو مستقل بنانے کی تدابیر اختیار کی جائیں اور کمیٹی مزید تجاویز پر غور کر کے رپورٹ پیش کرے۔

دستخط عبدالمجید خواجہ عفی عنہ۔

حضرات ذیل شریک جلسہ تھے۔

(۱) حکیم اجمل خاں صاحب (۲) مولانا شوکت علی صاحب
(۳) مولانا محمد علی صاحب (۴) مولانا ابوالکلام آزاد صاحب
(۵) سید عبدالرؤف شاہ صاحب (۶) آغا محمد صفدر صاحب (سیالکوٹ)
(۷) محمد شعیب قریشی صاحب (۸) عبدالمجید صاحب (سندھ)
(۹) مولانا حسرت موہانی صاحب (۱۰) مولوی محمد شفیع صاحب (بہار)
(۱۱) عبدالعزیز انصاری صاحب (۱۲) عبدالمجید خواجہ صاحب

دوسرے دن کے مزید شرکار:۔

(۱۳) ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب (۱۴) ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب
(۱۵) مہاتما گاندھی (۱۶) مسٹر آصف علی
(۱۷) مولانا ظفر علی خاں۔ (دستخط) عبدالمجید خواجہ

رودیداد جلسہ فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ سہ شنبہ ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء
بر کوٹھی حبیب باغ علی گڈھ بوقت ساڑھے گیارہ بجے دن۔

حاضرین :-

(۱) مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب امیر جامعہ (۲) ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب دہلی
(۳) مولانا محمد علی صاحب دہلی (۴) عبدالمجید خواجہ علی گڈھ
(۵) حافظ عبدالرحیم صاحب علی گڈھ (۶) کنور عبدالوہاب خانصاحب علی گڈھ
(۷) مولانا عبدالماجد صاحب بدایوں (۸) تصدق احمد خاں شیروانی صاحب ،،

کافی بحث و غور کے بعد کثرت رائے سے قرار پایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو علی گڈھ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ اور شیخ الجامعہ کو ہدایت کی جائے کہ آئندہ جون میں جامعہ کو دہلی لانے کے لئے ضروری انتظامات شروع کر دیں۔

(دستخط) اجمل
۳۱ مارچ ۲۵ء

چھٹا سال

جولائی ۱۹۲۵ء سے جون ۱۹۲۶ء

جامعہ کے دہلی منتقل ہونے پر بہت سے لوگ اس کی خدمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ جامعہ کو علی گڑھ ہی میں رہنا چاہیئے اور بعض سرے سے اس کے جاری رکھنے کے مخالف تھے مگر پھر بھی بہت سے ایسے باہمت لوگ تھے جن کی وجہ سے جامعہ کا کام جاری رہا۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے خرچ کی ذمہ داری لی۔ مولانا محمد علی کے الفاظ میں "طبیہ کالج حکیم اجمل صاحب مرحوم کی جوانی کی اولاد ہے اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ بڑھاپے کی" اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ مرحوم ان دونوں اداروں کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ جامعہ کے دہلی آنے پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے معتمد کے فرائض اپنے ذمے لئے۔ وہ بھی جامعہ کے کاموں میں حکیم صاحب مرحوم کی مدد فرمانے لگے۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سی انتظامی تبدیلیاں ہوئیں جن کا ذکر آئے گا۔

مقام کی تبدیلی کی وجہ سے لڑکوں کی تعداد کم ہوگئی۔ قرول باغ

میں طبیہ کالج سے متصل چند کوٹھیاں کرایہ پر لی گئیں۔ اسی میں سب لوگ رہتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ان کوٹھیوں کو چھوڑ کر ایک بہت لمبی دو منزلہ عمارت لی گئی۔ اس میں ابتدائی ثانوی کالج کے سب طلبہ آگئے تھے۔ اس دفعہ انتخابات کی چہل پہل پہلی سی نہیں تھی ۱۹۲۴ء کا سا لطف کہاں۔ جلسے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ دعوتیں بے لذت ہوگئیں۔ جماعتوں میں وہ رونق نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی بڑی دکان ایک مقام پر دیوالیہ ہو کر دوسری جگہ آئی ہے اور وہ یہاں اپنے ٹوٹے پھوٹے سامان کی مرمت کر رہی ہے اس امید پر کہ اس کا کام پھر چل پڑے گا۔ علی گڈھ میں سہ پہر کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد "ڈرل" ہوتی تھی۔ دہلی منتقل ہونے کے بعد جب سب لڑکوں کے اتالیق کیلاٹ صاحب ہوئے تو انھوں نے صبح کی ورزش کا قاعدہ مقرر کیا۔ جامعہ کے چھوٹے بڑے سب لڑکے صبح کی نماز کے بعد ایک میدان میں جمع ہو کر ایک ساتھ ورزش کرتے تھے یہ طریقہ اب تک رائج ہے مگر اب ابتدائی مدرسہ ثانوی اور کالج کی ورزش الگ الگ ہوتی ہے۔ جامعہ کے کارکنوں میں بھی کمی ہوگئی تھی۔ اس لئے بعض کام کالج کے لڑکوں کو سنبھالنے پڑے مثلاً رسالہ جامعہ کے سابق مدیر کی ...... کی جگہ یوسف حسین خاں صاحب ہوئے۔ مکتبہ کا کام یکے بعد دیگرے اکبر علی صاحب اور منظور احمد صاحب نے سنبھالا۔ حافظ صاحب نے (جو اب تک اتالیق اور مدرس تھے) دفتری کام کی ذمہ داری لے لی۔ ثانوی کے بعض گھنٹے کالج کے طلباء پڑھایا کرتے تھے۔ حارث صاحب کی اذان کو لوگ یاد کرتے تھے لیکن انھوں نے ایک سال کے بعد صورت دکھائی۔ اس کام .... کے علاوہ انھوں نے مطبخ کی نظامت سنبھالی

اور اس میں جان ڈال دی۔ جگہ کی تبدیلی سے کچھ طبعیتیں تھوڑی بدل جاتی ہیں۔ ثانوی کے استاد عبدالکریم صاحب فاروقی کی زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ کلاس میں اپنے شاگردوں کو مزاحیہ باتوں سے محظوظ بھی کرتے تھے۔ ان دنوں فضا کو دیکھتے ہوئے ایک دن فاروقی صاحب ثانوی چہارم والوں سے کہنے لگے۔ (اس جماعت میں میں بھی شامل تھا) "ہٹاؤ جی ان جھگڑوں کو اس کی کمی ہے اُس کی کمی ہے کھولو اپنی کتابیں" ہم سب نے اپنی کتابیں کھول لیں "مگر بند کرو ان کتابوں کو ــــــ یہ بھی کوئی کلاس ہے، پہلے اس جماعت میں تیس لڑکے تھے اب دس ہیں۔ ان میں سے بھی ایک محمد علی ہے جسے انگریزی بالکل نہیں آتی۔ رہ گئے نو لڑکے ان کا کیا پڑھانا۔

(میری طرف خاص طور پر مخاطب ہو کر) "حیدرآباد سے مون سون کے آنے میں بھی کئی دن لگتے ہیں۔ یہ تم کیسے آن نکلے؟"

ایک لڑکے نے کہا "گڈس ٹرین میں بیٹھ کر"

اس پر فاروقی صاحب بولے "تب ہی تو کہتا ہوں گڈس ٹرین میں بیٹھ کر آنے والوں کو کہیں انگریزی آیا کرتی ہے پچھلے سال اتحادی دکان میں دودھ بیچا کرتا تھا اس سال بھی دودھ کی دکان کھول لے"

یہ باتیں وہ دلچسپی کے لئے کہا کرتے تھے۔ پھر بھی بعض دفعہ میں اداس سا ہو جاتا تھا۔ اب کی بھی ایسا ہی ہوا، فرمانے لگے "لو بھائی! محمد علی خفا ہو گیا۔ اچھا تو نکالو تم اپنی کتابیں۔ تو کل کہاں تک پڑھا تھا" سبق شروع ہو گیا لیکن اس دفعہ میری طبیعت پھر بھی اداس رہی۔ فاروقی صاحب اپنے شاگردوں کو خفا کرنے کے بعد خوش کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ سبق کا کچھ حصہ ختم کرنے کے بعد فرمانے لگے۔

"لڑکو تو فرض کرو جب ہوا تو کام نہیں چلتا۔ ہم لوگ تو سرکاری مدرسوں میں

واپس جانے سے رہے۔ پھر بھی آخر ہم کریں گے کیا! بہتر تو یہ ہے کہ دکانیں کھول لیں۔ محمد بھولی کی دوکان تو طے ہوگئی۔ عابد (مولانا شوکت علی کے بیٹے) تو لیڈر کا لڑکا ہے۔ یہ لیڈری رہے گا۔ بشیر پہلوانی کے لئے موزوں ہے۔ سمیع (حیدرآبادی طالبعلم) اورنگ آباد کا جامہ واراوڈ ہمر بیچے گا۔ اس طرح اور لڑکوں کا نام لیا۔ آخر میں فرمانے لگے " ہم یعنی خود ماسٹر صاحب محمد بھولی کی دوکان پر دودھ پیا کریں گے۔ اور کیا ایک بوڑھے کی گزر تو ہو جائے گی" اس پر سب لڑکے ہنس پڑے، میں بھی مسکرا دیا۔

طالب علموں کی دلچسپی جاری رکھنے کے لئے رسالہ جامعہ نے ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کیا، موضوع تھا۔

"اُردو زبان کس طرح ترقی کر سکتی ہے"

قلمی رسالہ "جوہر" علی گڈھ کی طرح یہاں بھی نکلنے لگا۔ میرے ذمّے مہتمی کے فرائض سپرد ہوئے۔ ایک دو دن کا تو کیا ذکر ہے پرچے کے شائع ہونے میں چند گھنٹوں کی بھی دیر نہ ہوتی تھی۔ ہر پیر کو صبح کی حاضری کے وقت اشتہار موجود۔ صرف ایک دن ایسا اشتہار لگانا پڑا کہ " جوہر آج صبح کی بجائے وقفے میں شائع ہوگا " بات یہ تھی کہ رسالہ پہلے سے شیخ الجامعہ صاحب کو دکھانا ضروری تھا۔ انھوں نے ایک مضمون بدلنے کے لئے فرمایا۔ راتوں رات دوسرا مضمون لکھا گیا اور وہ کہیں صبح جاکر صاف ہوا۔

دہلی آنے کے بعد انتہائی بے سروسامانی کی حالت تھی، پھر بھی جامعہ نے وقت کے تقاضوں کے تحت ہر چیز کی پہل کرنے میں حصّہ لیا ہے۔ یوں کہئے کہ تعلیمی معاملات میں رہنمائی کا کام جامعہ کے ذمّے آپڑا تھا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ اس کہانی کا مرکز یہی خیال ہے۔ تعلیم بالغان کا خیال جس نے آگے چل کر دیہاتی صورت

اختیار کرلی تھی، اس وقت جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں تھا، فوری طور پر ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ نادار طلباء سے ایسے کام لیں جس سے ان کے اخراجات کا ایک حصہ ادا ہو جائے۔ چنانچہ اسی سال حافظ فیاض احمد صاحب نے "مدرسۂ شبینہ" کی بنیاد ڈالی اور یہ کام میرے سپرد کیا۔ میں نے یہ کام ایک دو استاد اور ساتھیوں کی مدد سے شروع کیا۔

پہلا سوال تو دن بھر کام کرنے والے غریب بے پڑھے لکھے لوگوں میں شوق پیدا کرنا اور انھیں جمع کرنا تھا۔ میں نے ہر ایک کے گھر جانا شروع کیا۔ ان کے ہاں تھوڑی دیر تک بیٹھتا، باتیں کرتا اور انھیں یقین دلاتا کہ پڑھنا مشکل بات نہیں ہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ پڑھنے سے سال بھر میں کہانیاں، اشتہارات پڑھ سکتے ہیں اور خط میں مطلب کی باتیں لکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ پہلے سے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا جانتے تھے وہ جلدی تیار ہو جاتے تھے ان کی مدد سے نہ جاننے والوں کو تیار کر لیتا تھا۔ اس طرح تعداد بڑھنے لگی۔ صرف ایک مہینے کے عرصے میں چھوٹے بڑے تین سو آدمی آنے لگے۔ کہیں قصے کہانیاں سنائی جارہی ہیں تو کہیں اخبار، کسی طرف کتابیں پڑھوائی جارہی ہیں تو کہیں تصویروں کے ذریعے مفید باتیں سمجھائی جارہی ہیں۔ ان ہی بڑے لوگوں میں سے مدرسہ کی پنچایت بنائی تھی۔ چھٹی ہونے کے بعد ان کا جلسہ ہوتا تھا۔ پنچایت کے رکن، جہاں لوگوں کی تکلیفیں اور شکایتیں بیان کرتے تھے وہاں ہماری باتوں کو ان میں پھیلاتے بھی تھے۔ لوگوں کی غفلت پر دیہاتی طریقہ کے مطابق پنچایت کا فیصلہ سناتے تھے۔ شہری لوگوں میں ان کی اہمیت بڑھانے کے لئے مشترکہ جلسوں کا انتظام بھی تھا۔ مثلاً "جادو کی لالٹین" کے ذریعہ کسی بات کے سمجھاتے وقت جامعہ کے تمام طلباء۔ ان کے درمیان بیٹھ جاتے تھے، ان کے

اپنے جلسے اس اہتمام سے ہوتے تھے کہ بستی کے معزز لوگ اور جامعہ کے اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اس قسم کے جلسوں کا ان پر اتنا اچھا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی اندرونی تنظیم کو اور مضبوط کر لیا۔

اس سال کوئی اور قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ جامعہ کی پانچویں سالگرہ کسی قدر اہتمام سے منائی گئی۔ مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں "تامیلیں" کے زمانے میں دہلی میں موجود تھے۔ مشاعرے کا انتظام ہوا۔ ان دونوں شاعروں کے علاوہ برق، نادر، تاباں، شیدا، اکبر، سائل، مومن، عزمی وحشی، نثار، اسلم، عباسی، غرض یہ کہ دہلی کے تقریباً تمام مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔ سرفراز حسین صاحب عزمی، مزاحیہ اشعار سنایا کرتے تھے۔ اس مشاعرے میں حکیم صاحب کی طرف اشارہ کرکے فرمانے لگے۔

میں ان کی بزم میں کس طرح جاؤں
مرے گھٹنوں میں گٹھیا کا اثر ہے!

یہ سال تبدیلی کا تو تھا ہی۔ عبدالمجید خواجہ صاحب جامعہ کا کام چلتا کرکے عبدالعزیز صاحب (بیرسٹر) کو شیخ الجامعہ بنا گئے۔ حسن محمد حیات صاحب جو کئی سال سے جامعہ کے منسلک تھے دہلی نہ آسکے۔ ان کی جگہ رشید اطہر صاحب کام کرتے رہے۔

عبدالمجید خواجہ صاحب نے جامعہ کی بنیادوں کو ایک تعلیم گاہ کی حیثیت سے استوار کرنے میں جو خدمات انجام دی ہیں اس کے احسان سے جامعہ کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے اپنی قابلیت اپنے وقت اور اپنے مال سب سے اس کمزور پودے کی آب یاری کی تھی۔ لیکن گوناگوں، مجبوریوں کی وجہ سے وہ شیخ الجامعہ کے کام سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے۔

عبدالعزیز صاحب نے یہ کام مشکل پاکر اپنی ذمّہ داری طاہر۔ ایس۔ محمدی صاحب کے سپرد کر دی ۔جوان دنوں معاشیات کے پروفیسر اور بہت باقاعدہ کام کرنے والے آدمی تھے۔ اس بڑے کام پر یہ تھوڑے ہی عرصہ رہے لیکن انھوں نے شعبوں میں کام کرنے کی رفتار بڑھا دی اور لوگوں کو وقت کا پابند بنا دیا۔ فاروقی صاحب کی جگہ عبدالوحید صاحب نگراں مدرسہ ہوئے۔

اس اثنا میں حکیم اجمل خاں صاحب یورپ کے سفر کے لئے گئے ہوئے تھے۔ پیرس میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنے ساتھ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور محمد مجیب صاحب کو لے کر موصوف سے ملے۔ اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر یہ تینوں حضرات تعلیم سے فراغت کے بعد فروری ۱۹۲۶ء میں جامعہ تشریف لائے۔ انھیں لینے کے لئے سب لوگ اسٹیشن پر گئے۔ جامعہ میں سپاسنامے دیئے گئے۔ دعوتیں ہوئیں، جوہر کا خاص نمبر نکالا گیا جس کے تمام مضامین جامعہ کی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں تھے یعنی کس زمانے میں کس قسم کا رنگ رہا۔ کیا کیا مشکلیں پیش آئیں وغیرہ

اس ضمن میں ایک ہلکی سی چوک ہوگئی اور وہ یہ کہ اس ہڑبونگ میں طاہر۔ ایس محمدی صاحب کی خدمات کا اعتراف نہ کیا گیا اور چارج ان کے ہاتھ سے اس طرح لے لیا گیا جیسے ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

غرض ان لوگوں کے آنے کے بعد سے جامعہ کے دن پھر گئے۔ ان حضرات کا ایک ساتھ تقرر ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ بنائے گئے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مجلس کے علاوہ رسالہ جامعہ کی ادارت سنبھالی۔ اس پرچہ کی ادارت میں مولانا اسلم صاحب ان کے ساتھ شریک تھے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب تاریخ کے استاد مقرر

شیخ الجامعہ
۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک

۱۔ مولانا محمد علی جوہر

۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین

۲۔ عبدالمجید خواجہ

ہوئے۔

ذاکر صاحب اور ان کے ان ساتھیوں کی آمد سے حقیقت میں جامعہ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

ساتواں سال

اگست ۱۹۲۶ء سے جولائی ۱۹۲۷ء

جامعہ کو قرول باغ میں ڈیرے ڈالے ایک سال ہو چکا تھا نئی تجاویز سامنے تھیں، دو کا آغاز عمل میں آیا، ان میں سے ایک صدر بازار دہلی میں، جامعہ کے مدرسہ کی شاخ کا قائم ہونا ہے ہمارے اس ارادے کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے صدر بازار کی ایک فرم کے۔پی۔سعید کے مالک شجاع الرحمٰن صاحب نے مدد فرمائی۔ حافظ فیاض احمد صاحب کے انتظام میں یہ کام شروع ہوا اس کی صدر مدرسی کے فرائض فیاض حسین صاحب کے سپرد ہوئے۔ یہاں رات کا مدرسہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ بعد میں اس مدرسہ کے نگراں سید احمد علی صاحب آزاد ہوئے، ان دونوں کی نگرانی میں اس مدرسہ نے ترقی کی۔ دوسرا کام پیام تعلیم کا اجراء ہے۔ اس کا اجرا یوں ہوا کہ جامعہ میں جو کچھ کام ہوتے ہیں ان کی تفصیل اور جامعہ کا مقصد لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت تھی تاکہ سب لوگ واقف ہو جائیں۔ امداد ملے اور لڑکوں کی تعداد بڑھے چنانچہ اپریل ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی نگرانی میں پندرہ روزہ پرچہ جاری ہوا۔ اس میں پڑھنے پڑھانے کی تفصیل، چندوں کی فہرست جامعہ کے حالات شائع ہونے لگے۔

اگرچہ شروع میں اس کے صفحات کم تھے لیکن بعد میں اضافہ ہوا اور بچوں کے لئے ہر قسم کے مفید و دلچسپ مضامین شائع ہونے لگے۔ اس رسالے میں ملک کی عام تعلیمی رفتار پر جامعہ کے نقطۂ نظر سے تبصرہ بھی ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی ادارت سعید انصاری صاحب کے سپرد ہوئی۔ منیجری کا کام میرے ذمّہ ہوا۔ ہم دونوں اور شفیق الرحمٰن صاحب مرحوم کا تقرر جامعہ میں اسی سال ہوا تھا۔

رسالے کا خرچ چلانے کے لئے خریدار بنانے کی ضرورت تھی۔ پرانے طلبا جامعہ کو چندے دینے والے، مکتبہ سے کتابیں خریدنے والے اور دوسرے مشہور لوگوں کی فہرستیں حاصل کر کے نمونے کے پرچے اور خطوط لوگوں کے پاس بھجوائے کہ وہ خریدار بنیں۔ اسی زمانے میں چندہ جمع کرنے والے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کے ذریعہ سے بھی خریداروں میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت تک ان دونوں رسالوں کا انتظام مکتبہ سے علحدہ تھا۔

نئے انتظامات کے تحت جو شخص جس چیز کا اہل سمجھا گیا اس کام کے لئے ذمّہ دار بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب شعبہ "تصنیف و تالیف" کے ناظم مقرر ہوئے اور عبد العلیم احراری صاحب اور سعید انصاری صاحب اکادمی کے رفقا، (فیلوز) کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انھوں نے ایک ایسی تجویز نکالی جس پر عمل کرنے سے لوگوں میں ہر سال نئی نئی کتابیں پڑھنے، رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہو سکے اعلان ہوا کہ جو شخص سال بھر میں چوبیس روپے دے اُسے ہر تیسرے مہینے اُس کے پسند کی نئی نئی کتابیں دی جائیں گی۔ پھر رسالہ جامعہ مفت ملا کرے گا۔ پیام تعلیم کے لئے رعایت رہے گی۔ جس شعبہ کے تحت یہ سب کچھ ہونے لگا اس کا نام شعبۂ تصنیف و تالیف" کی بجائے آگے چل کر ادارہ اکادمی رکھا گیا۔ اس طرح دونوں رسالوں کا انتظام بھی اکادمی کے ذمّہ ہو گیا۔

اس خیال سے کہ لڑکے استادوں سے بہت کچھ سیکھیں "ہاؤس سسٹم" کا طریقہ جاری کیا گیا یعنی ایک استاد کے ذمے دس سے پندرہ کی تعداد میں لڑکے اقامت گاہ کے ایک ایک حصے میں رکھے گئے۔ یہ استاد ان کے کپڑے، حجامت، دانتوں کی صفائی دیکھتا، ان کے گھر کے کام میں مدد دیتا، جلسے میں بولنے والے لڑکے کی تحریر و تقریر درست کرتا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کام میں تبدیلی یوں کی گئی کہ ایک ہی عمارت کی بجائے چند کوٹھیاں کرائے پر لی گئیں۔ ہر ایک میں تیس تیس لڑکے اور دو اتالیق رکھے گئے۔ پھر سب باتوں کی ذمہ داری ان ہی کے سر رہی البتہ شہر سے آنے والے لڑکوں کے لئے پہلا طریقہ جاری رہا۔

پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں بھی چند لڑکے تھے۔ مجیب صاحب مدراس کے ایک استاد رام چندرن جی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ دونوں کی طبیعتیں ایک سی تھیں، بہت کچھ پڑھے لکھے مگر سادہ مزاج، محنتی اور ملنسار ماں کی طرح لڑکوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایک طرف مجیب صاحب وائلن بجا کر لڑکوں کو خوش کرتے تھے تو دوسری طرف رام چندرن جی لڑکوں کا جی بہلانے کے لئے ان کی بحث میں حصہ لیتے تھے۔ ہندو مسلمانوں کے میل جول کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتاتے ایک دن وہ نماز میں شریک ہوئے۔ لڑکوں نے کہا "آپ ہندو ہو کر ایسا کرتے ہیں" انھوں نے جواب دیا "جو شخص ایک خدا کی عبادت کرے بتوں کو نہ مانے وہ کسی مذہب کا ہو اس کے ساتھ خدا کی عبادت میں شریک ہونا اچھا ہی ہے تم لوگوں نے نماز میں یہی تو کہا کہ خدا بڑا ہے۔ پاک ہے، پالنے والا ہے اس سے کس کو انکار ہے"۔

ان لوگوں نے جامعہ والوں کے سامنے رہنے سہنے کا ایک طریقہ پیش کرنا چاہا اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کھانا بھی پکا لیتے تھے۔ جب رام چندرن جی

چلے گئے تو مجیب صاحب اکیلے رہ گئے پھر یہ بھی ویسے ہی رہنے سہنے لگے جیسے سب رہا کرتے تھے اقامت گاہوں کے علٰحدہ ہوتے ہی بزم کمال کی مرکزی حیثیت نہ رہی بلکہ ہر ایک اقامت گاہ میں بزم ادب کے نام سے علٰحدہ علٰحدہ جلسے ہونے لگے۔ کھانا ایک ہی جگہ پکتا تھا مگر تقسیم ہو جاتا تھا۔ اگلے سال سے یہ بھی سب جگہ الگ سے پکنے لگا۔

جامعہ کی چھٹی سالگرہ منائی گئی۔ شہر دہلی کے اکثر معزز تجار، رؤسا، اور دوسرے سر بر آوردہ لوگ موجود تھے، حکیم اجمل خاں صاحب (امیر جامعہ) نے پہلی بار عام مجمع میں جامعہ کی خالص تعلیمی پالیسی کا اعلان فرمایا، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (شیخ الجامعہ) نے سال بھر کی رپورٹ سنائی۔ ڈاکٹر انصاری صاحب (معتمد جامعہ) نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ جامعہ قومی تعلیم گاہ ہے اور تمام فرقہ دارانہ تحریکوں سے الگ ہے۔ حضرت صفی لکھنوی نے اپنی ایک تازہ نظم سنائی اس کے چند شعر یہاں درج ہیں۔

یوم تاسیس جامعہ ہے آج — نطق مہمان جامعہ ہے آج
جامعہ درس گاہ اسلامی — دل کشا شاہراہ اسلامی
قابل قدر ادارۂ ملی، — زیب آغوش خطۂ دلی
اپنی تعلیم پھر نصاب اپنا — کیوں نہ مکتب ہو کامیاب اپنا
جامعہ کی بنا[1] پڑے جلدی — آئیں پھر ہم قرد[؟] باغ صفی سے
حشر تک میکدے کا نام چلے — جام گردش میں آئے کام چلے

یوں ہی جب تک کہ بادہ نوش پئیں
ہاتھ سے شیخ جامعہ کے پئیں

ایک اور اہم چیز کھیل اور ورزش کا سالانہ جلسہ ہے۔ مارچ کے مہینے میں

---

[1] اس سے مراد جامعہ کی اپنی عمارت ہے۔

اسمبلی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ وٹھل بھائی پٹیل صدر تھے۔ اسمبلی کے سب لوگوں کو دعوت دی گئی کہ وہ جامعہ کے بچوں کے کھیل آکر دیکھیں اور وٹھل بھائی سے انعامات تقسیم کرنے کی درخواست کی گئی۔ آخری مقابلوں کے لئے کیلاٹ صاحب نے طرح طرح کے کھیلوں کی مشق کروا رکھی تھی۔ پروگرام چھپوا دیا گیا تھا۔ شہر سے سینکڑوں مہمان آئے ہوئے تھے۔ کھیل ہونے لگے۔ عبدالباقی صاحب خدا جھوٹ نہ بلوائے تو چار من وزن تھا۔ پورا ڈھکیل۔ کھیل میں چٹان کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی کو کیا گراتے، جو کوئی بھی انھیں دھکا لگاتا خود ہی گر جاتا۔ آخر میں نبی احمد صاحب رہ گئے۔ جو وزن میں ان سے آدھے تھے انھیں گرانے کے لئے باقی صاحب کو تھوڑی سی محنت کرنی پڑی۔ استادوں کی دوڑ بھی بہت دلچسپ تھی۔ جو صاحب پہلے آئے انھوں نے اپنا انعام ذاکر صاحب کو دیدیا۔

قومی ہفتہ یوں تو ہر سال منایا جاتا تھا لیکن رام چندرن جی کی تجویز کے مطابق اس سال سے ایک خاص رنگ میں منایا جانے لگا۔ جنگ عظیم ۱۹۱۸ء کے بعد جب انگریزوں نے آزادی دینے کا وعدہ پورا نہ کیا تو اس بات کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے باشندوں کا بہت بڑا جلسہ جلیانوالہ باغ (امرتسر) میں ہوا تھا۔ بس اسی بات پر وہاں کے گورنر نے نہتے لوگوں پر گولی چلا دی۔ سینکڑوں آدمی شہید ہو گئے۔ سارے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا۔ جگہ جگہ جلسے کر کے غصّے کا اظہار کیا گیا۔ اور اسی وقت سے آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی، اس دن کی یادگار ہر سال ۶ اپریل سے ۱۳ اپریل تک منائی جاتی ہے اور اسے قومی ہفتہ کہتے ہیں۔ کام کرنے والے لوگوں نے سوچا کہ محض جلسے کر کے یادگار منانے سے اس کا اثر جاتا رہتا ہے کوئی کام

ہونا چاہیئے چنانچہ جامعہ میں ۱۳ اپریل کو چپراسیوں، بیروں، باورچیوں، بہشتیوں مہتروں۔ کو چھٹی دیدی جاتی تھی۔ اور سب لڑکے اور استاد اپنا کام آپ کرتے تھے۔ خدمت گاروں کو چھٹی دیدی جاتی تھی۔ لڑکوں کی ٹولیاں بنائی جاتی تھیں ہر ایک ٹولی کے ذمے رات کی چوکیداری، صبح کی صفائی، کمروں اور صحن کو بڑے پیلنے پر صاف کرنا۔ پانی بھرنا۔ کھانا پکانا، بازار سے سودا سلف لانا۔ یہ سب کام ہوتے تھے۔ ایک ٹولی قریب کے گاؤں میں جاکر وہاں کی گلیوں کی صفائی کرتی تھی۔ کھانے کے وقت سب نوکروں کو اپنے ساتھ بٹھاکر لڑکے کھانا کھلاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ خدمت گاروں کو ہم اپنے سے کم تر نہ سمجھیں، لڑکے تو اس بات کا ذرا بھی بُرا نہیں مانتے تھے کیونکہ یہی نوکر چاکر رات دن انھیں آرام پہنچاتے ہیں۔ ان سب باتوں سے یہ سکھلایا جاتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہم ہر طرح کا کام اپنے ہاتھ سے کر سکیں اور مل جُل کر ہر چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دے لیں۔

غرض سارے کام اس انہماک سے ہوتے تھے کہ اگر کوئی اجنبی صبح سے چکر لگاکر دیکھنا شروع کرے تو گھنٹوں اس کا جی نہ بھرے۔ دوپہر کا کھانا ختم ہونے تک یہ دلچسپ کام اسی طرح جاری رہتا تھا۔ پھر شام کے وقت جلسہ ہوتا تھا جس میں آزادی کی تحریک کے پچھلے اور حال کے واقعات، قومی نظمیں سنائی جاتی تھیں۔ ہر ٹولی کا نامہ نگار دن بھر کے کام کی روئداد سناتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ جامعہ میں شفیق صاحب مرحوم کی توجہ سے ایسے کام ڈھیلے نہیں ہونے پاتے تھے۔ وہ مذاق مذاق میں دلوں کو گرما دیتے تھے۔ اگر کوئی اُستاد کام کرنے سے جی چُراتا تو اس کے کمرے میں خود ہی صفائی کرنے لگتے تھے۔

آجکل اس کام نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا ہے یعنی طلبار اپنا پروجیکٹ بنا کر جماعتوں میں دو ہفتے پہلے سے تیاریاں کرتے ہیں، ان ہی تیاریوں میں لکھنے پڑھنے کا کام پورا ہو جاتا ہے، مثلاً گزرے ہوئے مشہور لوگوں کے حالات سنائے اور لکھائے جاتے ہیں۔ سوانح عمریوں کی چھوٹی چھوٹی کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کروایا جاتا ہے۔ یہ اُردو اور تاریخ کا کام ہوا۔ نقشے بنوا کر تاریخی مقامات اور ان کا مختصر حال تبلایا جاتا ہے۔ یہ جغرافیہ ہوا۔ حساب کے ماسٹر اعداد و شمار جمع کرواتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ملک کی آمدنی و خرچ ہر ایک صوبے کی آبادی، اور رقبے کا مقابلہ خاص طور پر کسی دیہات کے مختلف اعداد و شمار لے کر یہ سمجھایا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں کون کون سی باتیں اصلاح چاہتی ہیں مثلاً پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد کم ہونے سے یہ نتیجہ نکلا کہ پڑھائی کی ضرورت ہے اگر بیکاروں کی تعداد زیادہ ہے تو ان کے لئے کام مہیا کرنے کی ضرورت ہے وغیرہ۔

سال کے آخر میں جامعہ کے "مدرسہ شبینہ" کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں طلبار نے تقریریں کیں، انعامات حاصل کئے، اس کے پڑھانے والوں میں محمد مجیب صاحب بھی تھے۔ امتحانات، ذاکر صاحب، اور دوسرے ساتھیوں نے لے لئے تھے۔

اس سال سیشن کے کھلنے اور بند ہونے کی تاریخوں میں تبدیلی ہوئی یعنی یہ سیشن جولائی کی بجائے اگست سے شروع ہونے لگا۔ اس طرح سردیوں کی کی چھٹیاں عین وسط میں پڑنے لگیں۔

اس سال کا ایک افسوسناک واقعہ بھی .... ہے۔ جامعہ کے طالبعلم شاہ افتخار حسین کچھ دن بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ آپ علی گڈھ کے

زمانے سے جامعہ میں تھے اور جامعہ کے بڑے ہمدرد طالب علم تھے. جامعہ کی نیک نامی سے خوش ہوتے اور اس کی خرابیوں سے انھیں تکلیف ہوتی تھی۔

جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی منتقل کرنے سے پہلے بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ جامعہ کو بند کر دیا جائے تعطیلات کا زمانہ تھا۔ یہ چیز افتخار مرحوم کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے عبدالمجید خواجہ صاحب کو جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے ایک خط لکھا تھا کہ خدا کے لئے جامعہ کو بند نہ ہونے دیجئے میں ناچیز خدمات پیش کرتا ہوں اور انشاء اللہ تعالیٰ جامعہ کو زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اور جو کچھ مجھ سے ہوسکے گا کروں گا۔ وہ گھر سے کافی رقم منگا کر غریب طلبار کی مدد کرتے تھے۔ لڑکوں نے آپ کے نام پر "شاہ افتخار میموریل فنڈ" جاری کیا تھا۔ اور تعلیمی مرکز کے چند کمرے ان کی یادگار کے طور پر تعمیر ہوئے۔

شاہ مرحوم کی تیمارداری انور خاں صاحب (مدراس) نے جس محنت سے کی تھی یہ سب کے لئے سبق آموز ہے۔

۱۷ / مارچ ۱۹۲۶ء کو حکیم اجمل خاں صاحب کے دولت خانے پر فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) کا جلسہ ہوا تھا جس میں جامعہ ملیہ کے دستور اساسی کا ایک مسودہ جلسے کے سامنے پیش کیا گیا اور بحث کے بعد منظور ہوا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ اس دستور اساسی کے تحت جن ضوابط اور قوانین کی ضرورت ہے انھیں ترتیب دے لیا جائے اور جامعہ کو باضابطہ رجسٹرڈ کرا لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نئے دستور پر اس لئے عمل نہ ہو سکا کہ فاؤنڈیشن کمیٹی کی بجائے نئی تنظیم کے ساتھ "مجلس اُمنا" قائم ہونے کے لئے ایک ایسے ریزولیوشن کی ضرورت تھی جس میں فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) خود کو ختم کرنے اور اپنے اختیارات وحقوق مجلس اُمنا کو منتقل کرنے کا ذکر ہوتا چنانچہ ایک سال

کے بعد ۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا جس میں اختیارات کی منتقلی کے ذکر کے بعد فاؤنڈیشن کمیٹی نے خود کو ختم کرنے کا ریزولیوشن منظور کیا اس کا ذکر روداد کی صورت میں اگلے سال آئے گا۔

اس سال معزز مہمانوں کی آمد کا بہت زور رہا۔ سب سے پہلے مسز سروجنی نائیڈو اور مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے۔ چار ہو رہی تھی ایک لڑکے کے جی میں آئی کہ کچھ کہے۔ سروجنی نائیڈو کے قریب جاکر کہنے لگا "آجکل بلوے بہت ہوتے ہیں۔ آپ لوگ ہندو مسلمانوں میں میل جول نہیں بڑھاتے ہیں۔ بڑے ہوکر ہم اس کام کو کریں گے" سب نے تالی بجائی۔ سروجنی نائیڈو نے لڑکے کو گلے سے لگا کر کہا "اس ہمت کی تعریف کرتی ہوں مگر تمہارے بڑے ہونے تک ہم لوگوں سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کریں گے"۔

اس زمانے میں آزادی کی تحریک کا پہلا سا زور نہ تھا۔ قومی مدرسوں کے کام بھی ٹھنڈے پڑ گئے تھے مگر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے جامعہ میں پھر سے جان پڑ گئی تھی۔ چنانچہ کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر انجمن اتحاد کی دعوت پر جب جامعہ میں تشریف لائے اور یہاں کے بچوں میں ایک خاص رنگ دیکھا تو کہنے لگے " دوسرے قومی مدرسے بے جان ہو گئے ہیں، مگر یہاں زندگی ہے۔ خدا کرے کہ اس مدرسے کی بنیادیں مضبوط ہو جائیں"۔

اسی سال علیا حضرت سلطان جہاں بیگم صاحبہ بنفس نفیس تشریف لائیں۔ لڑکوں کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے رات دن ایک کرکے پنڈال سجایا۔ اپنی اقامت گاہوں میں سجاوٹ کی۔ بیگم صاحبہ لڑکوں کے رہنے سہنے کے طریقوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ تقریر کرتے وقت جامعہ والوں کو اسی طرح

سمجھایا جیسے کوئی اپنے خاندان والوں کو سمجھایا کرتا ہے۔ وہ لڑکوں کو "میرے بچے" کہہ کر مخاطب فرماتی تھیں۔ اپنی اس آرزو کا اظہار فرمایا کہ جامعہ بچیوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کرے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ عمر بھر لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوشش فرماتی رہیں۔

جامعہ کی مالی حالت درست کرنے کی طرف کافی توجہ کی گئی۔ چندوں کی وصولیابی کے لئے منظم طریقے پر وفد بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا۔ گذشتہ سال گرمیوں کی چھٹی میں ایک وفد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب اور خواجہ عبدالمجید صاحب کی سرکردگی میں حیدرآباد گیا تھا جہاں نواب اکبر یار جنگ، حیدر نواز جنگ اور مسعود یار جنگ کی وجہ سے اچھی خاصی کامیابی ہوئی۔

دوسرا وفد خواجہ عبدالحئ صاحب کی سرکردگی میں کاٹھیاواڑ، اور مدھیہ پردیش گیا تھا۔ نیز سردیوں کی چھٹیوں میں ڈاکٹر ذاکر صاحب۔ عبدالعلیم صاحب احراری، اور حامد علی خاں صاحب کے ہمراہ بہار کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ جہاں مولوی شفیع داؤدی صاحب کی کوششوں سے چندے کی ایک معقول رقم فراہم ہوگئی۔

ان وفود کے پیش نظر محض چندہ جمع کرنے کا کام نہیں تھا، بلکہ جامعہ ملیہ سے لوگوں کو روشناس کرانا، جامعہ کے مقاصد بتانا، قومی تعلیم کے شوق کو پھر سے زندہ کرنا، تعلیمی کام کرنے والوں سے تبادلہ خیال کرنا تھا۔

آٹھواں سال

اگست ۱۹۲۷ء سے جولائی ۱۹۲۸ء

جامعہ میں ڈراموں کی ابتدا کس طرح ہوئی، پڑھنے میں تو شاید دلچسپ معلوم ہو مگر غور کیجئے تو یہ ایک عجیب آغاز معلوم ہوتا ہے۔ خیال کیجئے کہ ایک دن شیخ الجامعہ صاحب کا اعلان آتا ہے کہ تیسری جماعت کے بچے مدرسہ کے آخری گھنٹے میں ایک نقل دکھائیں گے۔ پوری جامعہ ایک جگہ جمع ہوتی ہے سرے پر ایک میز ہے جس پر سٹو، پتیلی، گلاس اور کچھ برف رکھی ہے۔ یہ موضوع کہ "بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیونکر ہوتی ہے۔ لڑکوں نے اس طرح سمجھایا جیسے کوئی سائنس کا ماسٹر چیزیں دکھا دکھا کر سمجھاتا ہو۔ درمیان میں ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہو جاتی تھیں۔ اس سے لڑکوں کے حوصلے بڑھے۔ وہ میرے سر ہو گئے کہ ایسی ہی نئی نئی باتیں کروایئے۔ میں چاہتا بھی یہی تھا اس وقت تک ہمارے ملک میں بچوں کے لئے ایک دو ہی ڈرامے لکھے گئے تھے۔ میں نے پہلی دفعہ "قوم پرست طالب علم" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا۔

گاندھی جی نے فرمایا تھا کہ لڑکوں کو تعلیمی کاموں میں لگا رہنا چاہیئے. لیکن ضرورت پڑے تو بڑے لڑکوں کو اپنے بڑوں کا ساتھ دینے کے لئے سیاست کے میدان میں کود پڑنا چاہیئے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر میں نے یہ ڈراما لکھا. دیکھنے والے بہت تھے ہال ناکافی تھا. میدان میں کرنے کے لئے کئی پردوں کی ضرورت تھی. لڑکوں نے خوشی خوشی چندہ اکٹھا کیا. کچھ مدد جامعہ نے بھی دی. عید کا زمانہ تھا. کھلے میدان میں جامعہ کے تمام لوگ اور مہمان بیٹھے ہوئے تھے. ان سب کے بیچوں بیچ مولانا محمد علی بھی آکر بیٹھ گئے. سب سے پہلے لڑکوں نے قومی ترانہ گایا پھر ایک بڑے طالب علم کے واقعات دکھائے گئے کہ اس نے قومی جلسہ میں حصّہ لیا. گرفتار ہوا. مولانا حسرت موہانی کی طرح جیل میں چکی پیسی. رہائی ہوئی. مدرسے کے لڑکوں نے دعوت دی. پھر اُسی لڑکے نے بڑے ہوکر ایک ہندو کی دولت کی حفاظت کی. مولانا محمد علی یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے. بیچ بیچ میں بلند آواز کے ساتھ کچھ تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے. کیوں کہ یہ سب باتیں ان پر بیت چکی تھیں. کہتے تھے یہ لڑکے تو میری نقل کر رہے ہیں اس سے لوگوں میں اور بھی دلچسپی بڑھ گئی. اس ڈرامے میں لکھنؤ کے عرفان نے قوم پرست طالب علم کا اور سی. پی. کے رفیق نے ڈاکو کا کام اچھا کیا تھا نبی احمد نے مولانا شوکت علی کی نقل کی تھی. ان کا جسم بھی بھاری بھرکم ہے اس لئے ان کے بولنے سے پہلے ہی لوگ محض ان کی ہیئت دیکھ کر ہنستے تھے۔

اسی زمانے میں ایک دن کی بات ہے کسی لڑکے نے مجھ سے پوچھا۔

"ماسٹر صاحب! یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن جس طرح بڑوں کے ڈرامے میں عورتوں کا "پارٹ ...... ہوتا ہے اس طرح ہمارے ڈراموں میں لڑکیوں کا کام نہیں ہوتا یہ کیا بات ہے"

میں نے جواب دیا

"ہمارے مدرسہ میں لڑکیاں نہیں پڑھتی ہیں۔ اس لئے ان کا کام نہیں رکھا گیا۔"

"تو کیا ہوا ہمارے ہاں کئی لڑکے ایسے ہیں جو لڑکیوں کی نقل کر سکتے ہیں" ایک لڑکے نے جواب دیا۔

"یہ ٹھیک ہے لیکن مردوں کی نقل مرد اور عورتوں کی نقل عورتیں کریں تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں جب لڑکیاں پڑھنے لگیں گی تو ان کا بھی خیال رکھا جائے گا۔ اور دیکھو ہم نے اب تک جتنے ڈرامے کئے ہیں عورتوں کے کام بغیر سب ٹھیک معلوم ہوتے تھے۔ ہر ایک ڈرامے میں عورتوں کا کام لازمی نہیں ہے۔"

لڑکوں کی سمجھ میں بات آگئی اور معاملہ رفع دفع ہوا۔

کام کرنے والے اپنا رنگ جمائے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ رام چندرن جی اور دیوداس جی جب جامعہ میں آئے تو انھوں نے تکلی اور چرخہ کو رواج دیا۔ بعض لوگوں نے پوچھا آخر اس سے فائدہ کیا۔ انھوں نے وہی جواب دیا جو اس کام کے کرنے والے ایک دفعہ نہیں بیسیوں دفعہ دہراتے رہنے میں اپنی خوشی سمجھتے ہیں یعنی ہمارے ملک میں کام کے ذرائع ایسے نہیں ہیں جس میں سب لوگ حصہ لے سکیں۔ کسان سال کا کچھ حصہ کھیتی کا کام کرکے باقی وقت بیکار رہتے ہیں۔ پڑھے لکھے نوجوان نوکری یا کام کی تلاش میں کئی کئی سال گزار دیتے ہیں

خیالی پلاؤ پکانے سے تو یہ اچھا ہے کہ کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔ ہاتھ سے کام کرنے کی عادت کا اور عادتوں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔ پر یہ ایک پنتھ دو کاج ہے۔ یعنی ایک تو کرنے کے لئے ایک مفید شغل ملا دوسرے کھادی کو ترقی ہوئی۔ بیکار رہنا پھر دوسرے ملک کے کپڑے پہننا ایسا ہی ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ دے کر ننگا ہو جائے۔ خیر یہ سب دلیلیں نہ سہی لڑکے تو اس لئے خوش تھے کہ انھیں ایک تماشہ ہاتھ آیا۔ جدھر دیکھو تکلیاں ہی تکلیاں نظر آتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کھدر پہن رکھا ہے وہ ایک قرض ہے اور اسے سوت کات کر ادا کرنا ہے۔ استادوں میں سعید انصاری صاحب اور شفیق صاحب مرحوم نے اس کام کو بہت پھیلایا۔ آج کل تو یہ بنیادی تعلیم والے اسے تعلیمی مقصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کا ذکر استادوں کے مدرسہ کے سلسلے میں آئے گا۔

جب رام چندرن جی جانے لگے تو انھوں نے ایک الوداعی جلسے میں فرمایا "آپ صاحبان کے برادرانہ سلوک نے مجھے یقین دلایا کہ ہمارے اختلافات کی بنا محض جہالت، ناواقفیت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندو مسلمان طالب علم ہی دراصل دونوں فرقوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے موزوں ثابت ہوں گے" مولانا محمد علی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "جس طرح رام چندرن جی نے مسلمانوں کی خدمت کی اسی طرح مسلمانوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کی خدمت کریں کیونکہ بنی نوع انسان کی خدمت ہی اسلام کی تعلیم ہے۔"

دست کاری کو ترقی دینے کے لئے نجاری کا شعبہ قائم کیا گیا۔ لکھنؤ کے آرٹ اسکول کے تعلیم یافتہ ماسٹر عبدالحی صاحب اس کے نگراں تھے۔

طلبا کو اس کام کی موٹی موٹی باتیں سکھلانے کے علاوہ نمائش کے لئے اچھی اچھی چیزیں تیار کرواتے تھے۔ لکڑی کی جامع مسجد اور قطب مینار نے تو کئی جگہ انعام حاصل کئے ہیں۔ جامعہ کی نمائشوں میں ماسٹر صاحب کے شاگردوں کا کام نمایاں نظر آتا تھا۔

ان دنوں جامعہ میں تنخواہیں کم تھیں اور کئی کئی مہینے نہیں ملتی تھیں ماسٹر صاحب قرول باغ سے تین میل دور پھاٹک حبش خاں میں رہتے تھے۔ آپ صبح اور شام پیدل آیا جایا کرتے تھے۔ ڈرائنگ کا کام بھی ہر ایک جماعت میں لازمی کر دیا گیا۔ اس کے سکھانے والوں کی محدود تعداد کا خیال کرتے ہوئے یہ مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اس شعبہ میں بھی کوئی "قوم پرور" استاد مل جائے گا، مگر آخر ایک صاحب مل ہی گئے جو قومی جوش کے ایک مجسم پیکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جامعہ میں بعض چیزیں لازمی ہو جانی چاہئیں مثلاً کھدر کا لباس، کھدر کی ٹوپی۔ انھیں سمجھایا بھی گیا کہ جہاں تک قومی رنگ کا تعلق ہے وہ تو جامعہ کی خصوصیت رہے گی لیکن جزئیات میں پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہاں ہر اُستاد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے طور پر لڑکوں کو کھدر کے استعمال کے لئے راضی کرلے۔ جو طالب علم کھدر کی ٹوپی پہننے سے کتراتے تھے سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ اختر حسن صاحب فاروقی کا ذکر ہے، قومی پرچم، جامعہ کا پرچم آپ کی حفاظت میں رہتا ہے۔ آپ ہر موقع پر جھنڈا اپنی نگرانی میں لگواتے ہیں۔

انہی دنوں رسالہ "جوہر" جو کچھ عرصہ کے لئے بند ہو گیا تھا دوبارہ نکلنے لگا۔

مدرسہ کی انجمن "بزم ادب" کی طرف سے محمد قاسم صاحب سندھی نے رسالہ گلشن جاری کیا۔ سندھی ہونے کی وجہ سے اُردو سیکھنے میں آپ کے لئے

وہ آسانی نہ تھی جو اور لڑکوں کو مادری زبان کی وجہ سے ہوتی ہے لیکن اس کام کے شوق نے آپ کی ہمت قائم رکھی اور ایک عرصہ تک رسالہ نکالتے رہے۔

میلاد النبی کا جلسہ عام رواج کے مطابق ہوا۔ مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب کے علاوہ رام چندرن جی نے بھی تقریر فرمائی۔

فلسفہ اسلام پر مولانا محمد علی کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا، مولانا نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:-

توحید کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ خدا کو ایک مانا جائے بلکہ اپنے نفس کی غلامی سے اور غیروں کی تقلید سے آزادی حاصل کرنا ہے۔

انجمن اتحاد کی طرف سے گرو کل کانگڑی کے سالانہ جلسہ میں حصہ لینے کے لئے طلباء بھیجے گئے تھے۔ ہمارے کالج کے سعید انصاری صاحب اور عبدالحمید صاحب زبیری شریک ہوئے تھے۔ زبیری صاحب نے پہلا انعام جیتا اور بحیثیت مجموعی اول آنے پر ہماری ٹیم نے ٹرافی بھی حاصل کرلی۔

ماسٹر برکت علی صاحب نے اسی سال "انجمن حکمیات" قائم کی۔ آپ نے یکے بعد دیگرے کئی چیزیں چلانے کی کوشش کی۔ ایک عرصہ تک غیر مقیم طلباء کے کھیلوں کو منظم کرتے رہے۔ ان ہی لڑکوں کی طرف سے آپ نے ۱۹۳۰ء میں "انصاری میموریل ہاکی شیلڈ" کی بنا ڈالی۔ برکت صاحب نے جامعہ میں کرکٹ کے کھیل کو فروغ دیا۔ ان کی فرض شناسی کا یہ حال تھا کہ جس زمانے میں مدرسہ کی حاضری لیا کرتے تھے ایک روز صبح کو ان کی پھوپھی کا انتقال ہوگیا۔ مدرسہ والوں کو اطلاع دینے کے لئے وقت نہ تھا۔ خود ہی تشریف لائے حاضری لی پھر میت کے انتظام کے لئے چلے گئے۔

اس سال سیر و تفریح کا انتظام بھی اچھا رہا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے مزید انتظامات کی راہ نکل آئی۔ ہر ایک اقامت گاہ میں اندرونی کھیلوں کی رسم افتتاح منائی گئی۔ ہر جگہ ایک بڑے کمرے میں "لوڈو" سیڑھی کا کھیل، شطرنج، کیرم بورڈ اور نہ جانے کون کون سے کھیلوں کا انتظام تھا۔ برسات میں کبھی کبھی قرول باغ سے دس میل دور اوکھلا جہاں جمنا سے نہر نکلتی ہے تفریح کے لیے چلے جاتے تھے۔ بعض لڑکے کہا کرتے تھے "کاش جامعہ اسی جگہ ہوتی" لیکن یہ محض آرزو کا اظہار ہوتا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آتی تھی۔ کہ دس سال بعد اس سارے علاقے پر ہمیں چھائے ہوئے نظر آئیں گے اور خیال بھی کیسے ہوتا یہ وہی زمانہ تھا کہ کئی کئی مہینے استادوں کی تنخواہوں کی ادائیگی نہ ہوتی تھی۔ مگر ان استادوں کی ہمت دیکھیے۔ لڑکوں کے پڑھنے پڑھانے میں ان کے کھیل کود سیر و تفریح اور خوشیوں میں ذرا فرق نہ آنے دیا۔ بلکہ ہر سال نئی نئی چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا۔

مدرسے سے تھوڑی دور بوعلی بختیاری کے پُرانے محل کے پاس ایک پختہ سرکاری تالاب تھا۔ اجازت لے کر اس میں پیراکی کا انتظام کیا گیا۔ شام کو بڑی بہار رہتی تھی۔ محمد حسین صاحب حیدرآبادی (طالب علم) اور ان کے ساتھی پیرنا سکھایا کرتے تھے۔ پیرنے کو تو ہر کوئی پیر لے لیکن ڈوبتے کو نکالنا کمال کی بات ہے۔ حسین صاحب کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کبھی کبھی بچوں کی اس تفریح کو دیکھنے کے لیے مولانا محمد علی بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن ذاکر صاحب کے جی میں آئی کہ پیرنا سیکھیں۔ لنگی کس تالاب کے کنارے پیر لٹکائے بیٹھ گئے۔ حسین صاحب چپ چاپ انتظار میں کھڑے رہے۔ ذاکر صاحب فرمانے لگے "جناب پیراکی کے سارے اصول اور قاعدے ازبر یاد ہیں لیکن جب تک

دو ایک غوطے نہ کھائیں عمل کی جرأت نہیں ہوتی ہے"

اس سال جو طلبا جامعہ میں رہ چکے ہیں وہ میر باقر علی داستان گو کو کبھی نہ بھولیں گے۔ موصوف دلی کے پرانے لوگوں میں سے تھے۔ داستان کہنے کا ملکہ تھا۔ بیان کیا کرتے تھے بس آنکھوں کے سامنے ہو بہو نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کہانی کے لوگ ہمارے سامنے چل پھر کر سب کچھ کہہ رہے ہیں دکھا رہے ہیں جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں سنے جائیں۔ یہ سناتے بھی تھے کم سے کم تین گھنٹے۔ چاندنی راتوں میں خاکسار منزل (چھوٹے بچوں کا اقامت خانہ) کی چھت پر تمام طلبا، اور اساتذہ جمع ہو جایا کرتے تھے۔ خاص شہر دلی کے پرانے قصے سناتے تھے کبھی بادشاہوں کے تو کبھی "کرخندار دں" (عام لوگوں) کے۔ کہانی میں بوڑھے بچے، عورت مرد سب کا ذکر ہوتا تھا اور لطف یہ کہ جس کی زبان بولتے ویسا ہی لب لہجہ اختیار کرتے ایک اور خاص بات۔ یہ تھی کہ بیچ بیچ میں لڑکوں کو مخاطب کر کے نصیحت کرتے کہ "بچو تم بھی ایسا کرنا یا نہ کرنا" جیسا موقع ہو۔

رمضان کی دلچسپیوں نے ایک خاص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ ہر ایک اقامت گاہ والے باری باری سے جامعہ کے تمام اساتذہ منشی صاحبان اور مانیٹروں کو افطار پر مدعو کرتے تھے۔ ایسی چہل پہل اور ملاقات کے موقعے اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔

اب مہمانوں کا حال سنئے۔

دہلی منتقل ہونے کے بعد گاندھی جی جامعہ میں پہلی دفعہ تشریف لائے تو طلبا اور اساتذہ نے کھدر کے کام کے لئے ستر روپے کی تھیلی نذر کی اور سپاسنامہ پیش کیا۔ آپ کے ہمراہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں (امیر جامعہ) ڈاکٹر انصاری (معتمد جامعہ) سیٹھ جمنالال بزاز اور مہادیو دیسائی تھے۔

"ڈائس" تک پہونچنے کے لئے جو راستہ بنایا گیا تھا اس کے دونوں طرف قطار میں طلبا تکلی چلا رہے تھے۔ گاندھی جی نے ہر ایک کے کام کو غور سے دیکھا اور خوش ہوئے۔ حکیم اجمل خاں نے آپ کے خیر مقدم میں تقریر کی اس کے بعد کالج کے ایک لڑکے نے سپاسنامہ پیش کیا۔

"مہاتما جی ——— آج آپ نے جامعہ میں تشریف لاکر ہمارے دلوں کو سچی خوشی سے بھر دیا ہے۔ آپ کے تشریف لانے سے ہماری ہمتیں بڑھ گئی ہیں اور ہمارے ارادے بلند ہو گئے ہیں ہم آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دیس کی خدمت کے لئے آپ کو بہت دن قائم رکھے۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ ہماری جامعہ نے ایک بہت بڑے کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ ہم کو ایسی تعلیم دینا چاہتی ہے جس سے ہم خدا کے نیک بندے، اپنے دیس کے سچے خادم اور سارے انسانوں کی بھلائی چاہنے والے بن جائیں۔ وہ ہمیں یہ سکھانا چاہتی ہے کہ ہم اپنے علم و ہنر سے اپنے اخلاق کو سنواریں، محنت اور مشقت سے اپنے اور اپنے عزیزوں کے لئے حلال کی روزی کمائیں اور خلوص اور ہمدردی سے اپنی قوم کی ترقی اور اپنے ملک کی آزادی کی کوشش کریں۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ آج کل زمانہ کی ہوا ہمارے خلاف ہے۔ ملک میں لڑائی اور فساد کی آندھیاں چل رہی ہیں جس سے پیار و محبت کی کھیتی مرجھائی جاتی ہے۔ ہم آپ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ پودے جنھیں آپ نے اور دوسرے بزرگوں نے جگر کے خون سے سینچا تھا اگر سوکھ بھی جائیں تو ان کے بیج برباد نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمارے دلوں
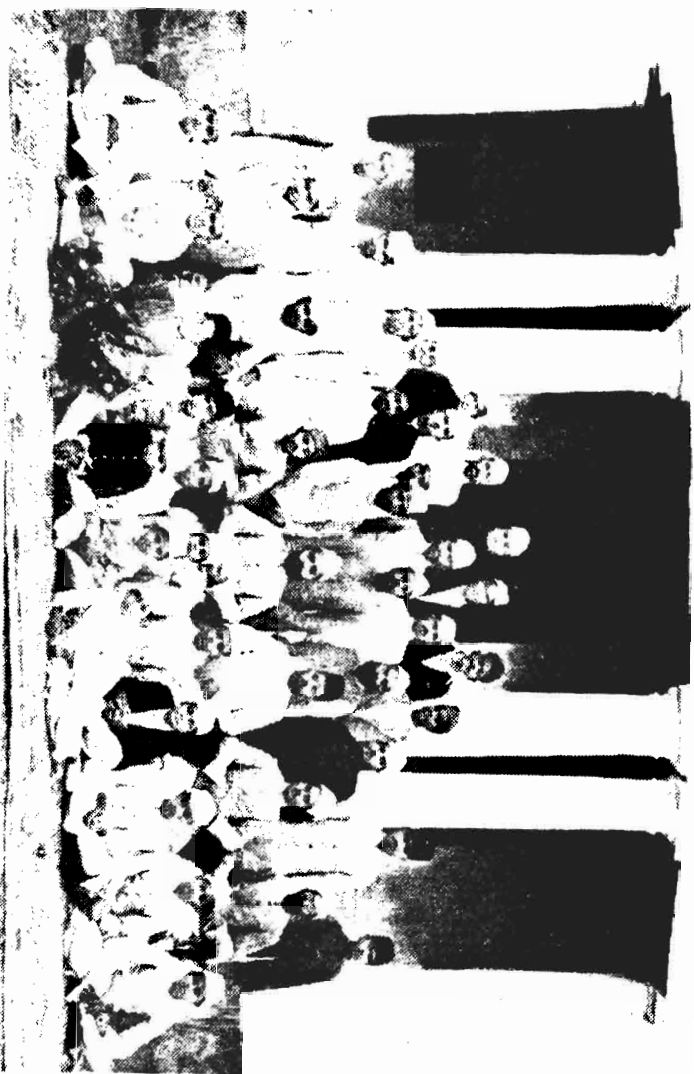
شوکت منزل کے طلباء اور جامعہ کے اساتذہ ۱۹۲۸ء میں

میں محفوظ ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ان سے پھر نئے پودے نکلیں گے۔ اور زہریلی ہواؤں سے بچ کر مضبوط اور تناور درخت بن جائیں گے۔ ہم آخر میں پھر نہایت ادب سے آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ عزت جلد جلد حاصل ہوا کرے گی"۔

ہم ہیں آپ کے فرمانبردار
طلبائے جامعہ ملیہ اسلامیہ

گاندھی جی نے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا:

"جو لڑکے میرے پاس بیٹھے ہیں وہ میرے ایک پُرانے دوست اور رفیق کار کے پوتے ہیں جن کا نام احمد محمد کاچلیہ ہے۔ انھیں میں اپنے حقیقی بھائی کے برابر سمجھتا تھا اور ان بچوں کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہو جانا ایک بالکل قدرتی امر تھا۔ ان ہی بچوں کے سلسلہ میں کچھ باتیں آپ سے کہنی چاہتا ہوں جس زمانے میں میں نے جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ شروع کی تھی اس وقت وہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں میں "کاچلیہ" سے بڑھ کر باہمت اور مستقل مزاج کوئی آدمی نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ملک کی عزت و آبرو کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا تھا۔ انھوں نے نہ تو اپنے کاروبار اور مال و دولت کی کوئی پروا کی اور نہ اپنے دوست احباب کا خیال کیا بلکہ بلا کسی تامل اور اندیشے کے انھوں نے اپنے آپ کو اس کشمکش میں ڈال دیا۔ اس وقت بھی بدقسمتی سے ہندو مسلم اختلافات گاہے گاہے پیدا ہو جاتے تھے لیکن "کاچلیہ" نے دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ قائم رکھا اور ان پر بیجا حمایت اور پاسداری کا الزام کبھی نہیں لگا۔

انھوں نے حبّ وطن اور رواداری کی خصوصیات نہ کسی اسکول

میں رہ کر حاصل کی تھیں اور نہ انگلستان جاکر بلکہ انھوں نے یہ سب کچھ خود اپنے گھر میں سیکھا تھا۔ اس لئے کہ وہ گجراتی زبان بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے۔ مقدمات کی پیروی میں جس طریقے سے وہ دلائل کا جواب دیتے وکلاء اور بیرسٹر بھی اسے سن کر دنگ رہ جاتے اور بعض وقت ان سے خود ان کے کاموں میں بھی بڑی مدد ملتی رہتی تھی۔ انھوں نے ستیہ گرہ مومنٹ کی رہبری بھی کی اور اسی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کا ایک بیٹا تھا جس کا نام علی تھا اور جسے وہ میرے سپرد کر گئے تھے گیارہ سال کا یہ لڑکا سچا اور پکا مسلمان تھا۔ رمضان کے مہینے میں وہ کبھی ایک روزہ بھی نہ چھوڑتا تھا۔ پھر بھی اسے ہندو ساتھیوں سے کوئی نفرت نہ تھی آج کل ہندو مسلمان دونوں ہی میں مذہبیت کے معنی دوسرے مذاہب سے نفرت و حقارت کے ہیں۔ علی میں اس قسم کی نفرت و حقارت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ بہر حال بیٹے اور باپ دونوں کے نام آج میرے لئے انتہائی مسرت و خوشی کا باعث ہیں اور خدا کرے ان کی یہ مثالیں آپ کے لئے تقلید اور رہنمائی کا سبب ہوں۔

اُس زمانہ میں جب کہ ہندو اور مسلمان ایک ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کے لئے اور اپنے وطن کی خاطر اپنا خون بہانے کو تیار تھے میں نے طلباء کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے چھوڑنے کی دعوت دی تھی۔ اس تمام عرصے میں مجھے کبھی اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ میں نے ان طلباء کو ان کی تعلیم گاہوں سے کیوں بلایا اور یہ پختہ یقین ہے کہ جن طلباء نے اس آواز پر لبیک کہا تھا انھوں نے اپنے وطن کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان

کا آئندہ مورخ ان کے ایثار اور قربانی کو نہایت جلی حرفوں میں لکھے گا۔
میں اس قابلِ فخر زمانے کے کچھ آثار یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہے کہ آپ اس جھنڈے کو قائم رکھنے کے لئے اپنی پوری محنت اور جاں فشانی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کی تعداد اگرچہ بہت کم ہے لیکن دنیا میں اچھے اور سچے آدمی کبھی بہت نہیں ہوئے ہیں میں آپ کو بھی نصیحت کروں گا کہ قلت تعداد کا آپ کچھ خیال نہ کیجئے بلکہ اس بات کو پیش نظر رکھئے کہ ملک کی آزادی کا انحصار آپ پر ہے۔ آزادی کا آپ کے پڑھنے لکھنے یا تکلی چلانے سے بہت کم تعلق ہے ہندوستان کی آزادی کے لئے جن بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ دو ہیں خدا کا خوف اور انسان یا انسانوں کی جماعت سے جس کا نام حکومت یا سلطنت ہے بے خوف ہونا ہے ان دو چیزوں کی تعلیم اگر آپ کی اس درسگاہ میں ہو سکتی ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ پھر اور کس درسگاہ میں ہو سکتی ہے۔ میں آپ کے پروفیسروں کو جانتا ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان دو چیزوں کی تعلیم یہاں ضرور ہوتی ہے۔
مجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ آپ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے میں خوش ہوں کہ آپ عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح اپنے خالق کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہے گی اور آپ ہمیشہ اس کی یاد اپنے دل میں رکھیں گے۔
حکیم صاحب کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ میرے لئے دہلی آنا بہت دشوار تھا لیکن آپ کے ہاں آنے میں مجھے انتہائی مسرت و اطمینان حاصل ہوا میں آپ کی خوشی کے لئے یہاں نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے کو خوش کرنے کے لئے آیا ہوں میں ایک ذاتی غرض کو یہاں لے کر آیا ہوں اور وہ آپ سے یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ جامعہ سے باہر نفرت اور زہر کا طوفان پھیلا ہوا ہے باوجود اس کے کہ مسلمان ہندوؤں اور ہندو مسلمانوں

کا گلا کاٹنے پر تیار رہیں لیکن اب آپ اپنے آپ کو اس سے متاثر نہ ہونے دیں اپنے خالق کو کبھی نہ بھولیں اور اپنے دلوں میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا نہ ہونے دیں اس امید پر میں آپ کے یہاں آیا ہوں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے کھادی اور تکلی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بنیادی چیزوں کے آگے جو میں نے آپ کو ابھی بتائی ہیں کھادی اور تکلی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ آپ ہزار تکلی چلائیں اور کھادی پہنیں لیکن اگر آپ ان باتوں پر عمل نہ کریں جو میں نے ابھی آپ کے سامنے بیان کی ہیں تو آپ کی یہ کھادی اور تکلی کسی کام کی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب نے کھدّر پہننے کی جو ضرورت جتائی ہے اسے آپ ہرگز نہ بھولیں گے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ کھادی کے ذریعہ آج ہم ساٹھ ہزار سوت کاتنے والوں کو روزی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔ جولاہے دھوبی اور دوسرے پیشے والے اس سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یاد رکھئے کہ ان میں بہت سے مسلمان بھی ہیں اگر چرخے کا رواج نہ ہوتا تو بہت سی جگہوں میں مسلمان عورتیں بھوکوں مر جاتیں غریب ہندو اور مسلمانوں سے اپنے آپ کو قریب کرنے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں کہ کھادی پہنیے۔

علاوہ اس کے ہمیشہ پاک و صاف رہیئے۔ پاکی اور صفائی نہ صرف ظاہری اور جسمانی ہو بلکہ اندرونی اور دل کی ہو، آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری کیا مراد ہے اپنے وعدوں کو پورا کیجئے خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن آئے اور ان باتوں کو ہمیشہ اپنی یاد میں تازہ رکھئے جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہیں"

ہر خوشی کے ساتھ رنج بھی لگا ہوا ہے۔ جامعہ کے سب لوگ ہنسی خوشی اپنے کاموں کو انجام دے رہے تھے کہ اچانک مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کی خبر ملی۔ وہی حکیم صاحب جو پہلے "امیر جامعہ" تھے، علی گڈھ سے سسکتی ہوئی جامعہ

کو دہلی لاکر مسیحائی دکھائی۔ جامعہ کی مالی حالت ۱۹۲۴ء سے خراب ہوگئی تھی۔ بعض دفعہ تو اتنی تنگی ہوجاتی تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب ہوگا کیا۔ لیکن حکیم صاحب کا خیال کر کے ڈھارس بندھتی تھی۔ اور ہوا بھی یہی ایسے موقعوں پر مرحوم نے اپنے خاص خاص دوستوں سے بڑی بڑی رقمیں دلوائیں ان کے پیچھے صرف ایک جامعہ ہوتی تو اس کے اخراجات کا فراہم کرنا کچھ مشکل نہ تھا مگر ایک طرف طبیہ کالج کا چلانا، دوسری طرف امیر ہو یا غریب جو کوئی بھی علاج کے لیے ان کے گھر پر جاتا اس سے کوئی فیس نہ لیتے۔ دہلی کے رئیس کہلاتے تھے مگر دراصل دل کے رئیس تھے۔ اور غریبوں کے خادم۔

شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں ان کی تصویر لگی ہوئی ہے جس کے نیچے یہ شعر ہے:

"یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند"

جب کوئی محسن جدا ہوجاتا ہے تو اس کی یادگار قائم کی جاتی ہے۔ حکیم صاحب نے قوم کے جسمانی علاج کے لیے یادگار طبیہ کالج کو اپنی زندگی ہی میں مضبوط بنیادوں پر قائم کردیا تھا۔ لوگوں نے کہا ان کی وفات کے بعد روحانی علاج کے لیے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو ان کے یادگار کے طور پر ایک پائیدار شکل دینی چاہیے۔ تجویز اچھی تھی۔ اس بات کو پھیلانے کے لیے فروری ۱۹۲۸ء میں اسی دہلی میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ مشہور رہنماؤں کا اتنا بڑا مجمع یا تو میں نے کانگریس کے سالانہ جلسوں میں دیکھا ہے یا اس جلسہ میں، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا محمد علی، مسٹر سری نواس آئنگر، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسز سروجنی نائیڈو، مہاراجہ محمود آباد، مسٹر وجے راگھو آچاریہ، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، جناب مولوی مرتضیٰ بہادر، مسٹر پرکاشم، مولانا شفیع داؤدی، مولانا عبدالقادر

قصوری، لالہ شنکر لال، مولوی عبدالقادر، سردار سردول سنگھ اور بہت سے حضرات شریک تھے، جلسے کے صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے آپ نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا "کہ حکیم صاحب ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ بھی ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے کام میں حصہ لیں۔"

پنڈت جی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے جامعہ کے اغراض ومقاصد بتلائے اور فرمایا کہ مذہبی تعلیم، رواداری، بھائی چارہ اردو کے ذریعے تعلیم دینا اور ہندو مسلم اتحاد جامعہ کی خصوصیات ہیں۔ پھر فرمایا کہ اس وقت جامعہ والے کرائے کی کوٹھیوں میں ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ حکیم صاحب کی یادگار میں آٹھ لاکھ روپے جمع ہو جائیں تو اپنی عمارتیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اس کی تائید میں پنڈت مدن موہن مالویہ، مہاراجہ محمود آباد، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار سردول سنگھ نے تقریریں کیں۔ اس وقت چودہ ہزار روپے کے وعدے ہوئے تھے۔ وعدہ کرنے والوں کے نام ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے پڑھ کر سنائے۔

مالی اور انتظامی اعتبار سے اگلے سال جامعہ میں جو انقلابی تنظیم ہوئی اس کا ذکر کرنے سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ جامعہ کے استحکام کے لئے جو صورتیں اختیار کی جا رہی تھیں، ان کے تحت رضاکارانہ طور پر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی عابد صاحب اور مجیب صاحب نے اپنی تنخواہوں میں کمی کر لی۔ نیز مجیب صاحب نے گرمیوں کی تعطیلات کی پوری تنخواہ جامعہ کے کتب خانہ کو دیدی کہ کتابیں خریدی جائیں۔ قرول باغ میں رات کا مدرسہ کام کر رہا تھا اس کی مستقل عمارت کے لئے جامعہ نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ ۲۱ ستمبر ۱۹۲۷ء کو ایک قطعہ زمین خرید لیا بعد میں یہاں شاندار عمارت بنی ۱۹۳۰ء میں جامعہ کا مدرسہ ابتدائی اسی عمارت میں منتقل ہوا۔ جامعہ کی پوری آبادی کے لئے دہلی سے چند میل دور کسی پر فضا مقام پر زمین حاصل کرنے کی

باتیں ہونے لگیں، خیال کیجئے ایک طرف یہ تحریک کہ اساتذہ اپنی تنخواہ کم کرلیں دوسری طرف یہ تجویزیں کہ عمارت کے لئے زمین خریدی جائے! اب تک فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) اپنی انتظامی جماعت (سنڈیکیٹ) اور تعلیمی جماعت (اکیڈمک کونسل) کے ذریعے جامعہ کے کاموں کو چلا رہی تھی، نئی تنظیم میں مجلس تاسیس ایک نئی مجلس امناء کا انتخاب کر کے اور اپنے تمام اختیارات اور حقوق اس کے سپرد کر کے خود ختم ہو گئی ضابطہ کی کارروائی اس طرح ہے۔

روئداد جلسہ فاؤنڈیشن کمیٹی منعقدہ ۲۹ اپریل ۱۹۲۸ء۔

فاؤنڈیشن کمیٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ایک اجلاس ۲۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو دفتر جامعہ میں بوقت ساڑھے چھ بجے شام منعقد ہوا ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے صدارت فرمائی۔ مندرجہ ذیل حضرات شریک جلسہ تھے۔

۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب ۲۔ مولانا محمد علی صاحب
۳۔ مولانا شوکت علی صاحب ۴۔ قاضی نجم الدین صاحب
۵۔ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب ۶۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

ڈاکٹر انصاری صاحب نے جامعہ کی موجودہ مالی حالت اور اجمل جامعہ فنڈ کے لئے مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر صاحب اور دیگر اکابر نے جو اپیل قوم سے کی ہے اس کا مفصل ذکر کیا اور جامعہ کے آئندہ انتظام و انصرام کے متعلق مہاتما گاندھی اور دیگر اکابر سے جو گفتگو ہوئی تھیں اُس کا تذکرہ فرمایا۔ کافی غور و بحث کے بعد فاؤنڈیشن کمیٹی نے مندرجہ ذیل قرار داد منظور کی۔

"مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم کی یادگار کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو استحکام دینے اور اس کو مالی دشواریوں سے مستغنی کرنے کی غرض سے اس کی ضرورت ہے کہ باضابطہ طریقہ پر پوری جدوجہد کی جائے۔ اور اس

تمام کام کو ایک منتخب جماعت امناء کے سپرد کیا جائے۔ جن کے ہاتھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تمام نظم و نسق ہو۔ لہٰذا جمعیتہ تاسیس آج بتاریخ ۲۹ اپریل سنہ ۲۶ء کو اصحاب ذیل کو بطور جمعیتہ امناء کے منتخب کرتی ہے۔

نام	عہدہ
۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب	صدر مجلس اُمناء
۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	معتمد مجلس اُمناء
۳۔ سیٹھ جمنالال صاحب بزاز	خازن
۴۔ مولانا محمد علی صاحب	رکن
۵۔ مولانا شوکت علی صاحب	"
۶۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد	"
۷۔ عبدالمجید خواجہ صاحب	"
۸۔ مولوی محمد شفیع داؤدی صاحب	"
۹۔ سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب	"
۱۰۔ سیٹھ جمال محمد صاحب	"
۱۱۔ شعیب قریشی صاحب	"
۱۲۔ مولوی مسعود علی صاحب	"
۱۳۔ مولوی کفایت اللہ صاحب	"
۱۴۔ مولوی محمد عرفان صاحب	"
۱۵۔ جواہر لال نہرو صاحب	"
۱۶۔ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب	"
۱۷۔ تصدق احمد خاں صاحب شیروانی	"
۱۸۔ قاضی نجم الدین صاحب	"

۱۹۔ مولوی محمد نسیم صاحب — رکن
۲۰۔ مولوی عبدالقادر صاحب قصوری — "
۲۱۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب — "
۲۲۔ مولوی عبدالحق صاحب — "
۲۳۔ مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب — "
۲۴۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب — "
۲۵۔ محمد مجیب صاحب — "
۲۶۔ اے۔ جے۔ کیلاٹ صاحب — "
۲۷۔ حسن محمد حیات صاحب — "
۲۸۔ چودھری خلیق الزماں صاحب — "
۲۹۔ مولوی سید مرتضیٰ صاحب — "
۳۰۔ مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی — "

مجلس تاسیس، اصحاب ذیل کو مجلس امنا کی پہلی مجلس انتظامیہ کا رکن منتخب کرتی ہے۔

۱۔ صدر مجلس اُمنا — ڈاکٹر انصاری صاحب
۲۔ معتمد مجلس اُمنا — ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
۳۔ خازن مجلس اُمنا — جمنالال بجاج صاحب
۴۔ مسجّل جامعہ — ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب
۵۔ مولانا محمد علی صاحب۔ — رکن
۶۔ مولانا شوکت علی صاحب — "
۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب — "

۸۔ عبدالمجید خواجہ صاحب رکن
۹۔ مولوی محمد شفیع داؤدی صاحب "

مجلس تاسیس قرار دیتی ہے کہ اس کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں مذکورہ مجلس امنا کو منتقل ہو جائیں اور اس کے بعد جمعیۃ تاسیس خود قائم نہ رہے چنانچہ وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں مجلس امنا کو منتقل ہو گئیں اور اس کے بعد مجلس تاسیس ختم ہو گئی۔

نیز قرار پایا کہ نئی مجلس انتظامیہ اپنے آئندہ اجلاس میں جامعہ کا نیا دستور اساسی تیار کرے اور مجلس امنا کے سامنے بغرض منظوری پیش کرے۔

ساڑھے آٹھ بجے جلسہ برخاست ہوا۔

دستخط ذاکر حسین

۳۰۔ اپریل ۱۹۲۸ء

نواں سال

اگست ۱۹۲۸ء سے جولائی ۱۹۲۹ء

ڈراموں کے پچھلے سال کے ہنگامی آغاز نے مستقل۔۔صورت اختیار کر لی ان ڈراموں میں سے جو جامعہ کی اہم تقریبوں کے موقع پر کھیلے گئے قطع نظر کرکے دیکھیں تو جتنے ڈرامے اس سال ہوئے کسی اور سال نہ ہوئے ہوں گے یہ کام مدرسے تک محدود نہ رہا۔ کالج کے طلبہ کو بھی شوق ہوا اور تو اور استادوں نے بھی ایک ڈرامہ کھیلا۔ میں اس وقت تک کالج کے لڑکوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ساتھی بھی ایسے تھے جنھیں جامعہ سے خاص لگاؤ تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ سارے لڑکے ایک کمرے میں جمع تھے امتیاز صاحب نے کہا:۔

" ماسٹر جی ہو جائے ایک ڈراما " مطلب یہ کہ کالج کے لڑکوں سے بھی ڈراما کروائیے۔

میں نے کہا " بڑے لڑکوں کے لئے ایسا ڈراما نہیں ہے جس میں عورتوں کا پارٹ نہ ہو"

" تو کیا ہوا موجودہ ڈراموں میں سے کسی میں ایسی ردوبدل کیجیے جس سے

ہمارا کام بن جائے ۔" عبدالکریم پشاوری نے کہا۔

اس وقت تک کالج کے لڑکوں کے لئے خاص طور پر ڈرامے لکھے نہیں گئے تھے۔ بعد میں حیدرآباد (دکن) کے اساتذہ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب ...... نے کئی ڈرامے اس مطلب کے لکھے ہیں جن میں عورتوں کا پارٹ نہیں ہے ۔ میں اس وقت اور کیا کرتا۔ آغا حشر کے ایک ڈرامے میں تبدیلی کر کے لڑکوں کے سامنے رکھ دیا پارٹ تقسیم ہوئے۔ ان بڑے لڑکوں کو سکھلانے میں چھوٹوں کے مقابلہ میں زیادہ دشواری پیش آئی۔ کوئی تو شرماتا کوئی کہتا آپ بتلاتے جائیے۔ اس وقت تو سنائے دیتا ہوں اصل کام اسٹیج پر دکھاؤں گا۔ ایک صاحب فرماتے میرا کام ہی کتنا ہے اوروں سے مشق کروائیے۔ کوئی تھیٹر کی نقل میں زور زور سے بولتا تو کوئی ایسے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے یہ لوگ قابو میں آئے۔ ڈراما تو جیسا کچھ ہوا اس وقت بڑا مزہ آیا جب پیام تعلیم کے مدیر حسین حسان صاحب معمولی عینک لگائے بغل میں اخباروں کا پلندہ لئے عینک میں سے گھورتے ہوئے عدالت میں داخل ہوئے۔ یہ فرض کیا گیا تھا کہ یہ "پیسہ" اخبار کے مدیر ہیں اور ایک مقدمہ میں انھیں گواہی دینی ہے۔ انھیں سکھانے کی ضرورت اس لئے نہ پڑی کہ یہ حضرت سچ مچ بن جیسے تھے ویسا ہی کام دیا گیا تھا۔

لوگوں نے کہا اب تو استادوں کو بھی خاموش نہ رہنا چاہیئے۔ ایک سال ہوا پروفیسر وہاج الدین صاحب نے (حیدرآباد) استادوں کے لئے ایک اچھا سا ڈراما لکھا تھا "نکاح بالجبر" پروفیسر محمد مجیب صاحب نے استادوں کو راضی کر لیا۔ خود بھی اس ڈرامے میں کام کیا، اوروں کو بھی سکھلایا۔ خود تو "جوتشی" بنے تھے۔ مجھے مرزا نوشہ" بنایا۔ نیازی صاحب میرے داماد بنے تھے۔ اور کریم اللہ صاحب برادر نسبتی۔ علیم صاحب ارسطو کے شاگرد علامہ خجندی بنے تھے۔ کالج سے بھی دو

لڑکے لیے تھے۔ انور خاں صاحب کو حکیم چلپی اور نصیر صاحب کو جعفر کا نام دیا گیا تھا۔ بیوی شروع سے آخر تک پردے میں رہی اس لیے عورت کی نقل کا جھگڑا نہ رہا۔ مجیب صاحب اداکاروں کے سجانے (میک اپ) میں کمال رکھتے ہیں۔ اداکاروں کا انتخاب بھی اچھا تھا۔ علیم صاحب نے عربی میں بی۔اے کیا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق لفظوں کو ٹھیک ٹھیک بولنے کا ملکہ تھا۔ پارٹ خاصا طویل تھا۔ خوب یاد کیا تھا۔ نقل اس بات کی تھی کہ کوئی شخص بحث میں ان کے سامنے غلط لفظ بولے تو یہ اس کی خبر لیتے تھے۔

بہت چھوٹے بچے یعنی تیسری اور چوتھی جماعت والوں نے کہا کہ ایک ڈراما ایسا بھی کروایئے جس میں ہم ہی ہم ہوں اس مطلب کے لیے غلام عباس صاحب کا لکھا ہوا ڈراما ''ثریا کی گڑیا'' بہت موزوں تھا۔ اس میں کام کرنے والے دو بچیاں اور ایک بچہ ہے۔ ایک بچی جس کی عمر سات سال کی ہوگی اپنی سہیلی کو گڑیوں کا گھر دکھانے کے لیے چائے پر بلاتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی (عمر چھ سال) دعوت کی چیزیں ہضم کرنے کے لیے طرح طرح سے پریشان کرتا ہے۔ اسی دوران میں بہن کو ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ بھائی کو کل پرزوں کے ذریعہ چلنے والی گڑیا بنالیتی ہے۔ سہیلی کے آنے پر یہ زندہ گڑیا طرح طرح کے کھیل تماشے دکھاتی ہے۔ چائے کا سامان، گڑیوں کا پٹارہ، ایک پردہ اور صرف تین بچوں کے ذریعہ یہ تمثیل نہ صرف مدرسے بلکہ گھروں میں آسانی سے کھیلی جاسکتی ہے۔ زبان میں مٹھاس ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں۔ اس عمر میں بچے جس طرح بولتے اور اپنی ادائیں دکھاتے ہیں اسی انداز میں لکھا ہے بڑی خوبی یہ ہے کہ نری گفتگو ہی نہیں ہے اداکار کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے بولتے ہیں اس لیے اور بھی لطف آتا ہے۔

جامعہ میں اس وقت چھوٹی بچیاں نہیں پڑھتی تھیں اس لیے میں نے اس

ڈرامے " سہیلیوں" کو بدل کر " دوست" کر دیا۔ گڑیوں کا کھیل چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں سب ہی کھیلتے ہیں اس لئے اس تبدیلی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میاں مسعود (جو اب جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر ہیں) زندہ گڑیا بنے تھے۔ نگینہ کے شاہد، مسعود کے بڑے بھائی اور قائم گنج کے شفیق شاہد کے دوست بنے تھے۔

دوسرا ڈراما " اسکول کی زندگی" عید کے موقع پر کھیلا گیا تھا میں جس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا Nagnatham at School نامی کتاب نصاب میں تھی اسی کے پلاٹ سے یہ ڈراما تیار کیا تھا۔ بھولے ناگناتھن کا کام عرفان نے دو شریر لڑکوں کا کام قائم گنج کے سراج اور سعد انصاری صاحب کے بھائی شعیب نے... کیا تھا۔ طیب صاحب نے کیلاٹ صاحب کی، نبی احمد صاحب نے ڈاکیہ کی نقل خوب اتاری تھی۔

یہ پہلا سال تھا کہ "یوم تاسیس" منانے کے سلسلے میں ہر ایک جماعت سے تعلیمی کام لیا گیا ذاکر صاحب نے ایک مہینہ پہلے استادوں سے بات چیت کر کے اپنی تجویزیں ان کے سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ یہ کہ

۱۔ ہر ایک جماعت لکھنے پڑھنے سے متعلق کوئی چیز تیار کر کے جامعہ کو تحفہ کے طور پر دے۔ ایک جماعت کئی چیزیں دے سکتی ہے۔

۲۔ جلسہ کے دن ان سب تحفوں کی نمائش کی جائے تاکہ ایک دوسرے کے کام سے لڑکے اور مہمان واقف ہو جائیں۔

۳۔ ایک طرف مکتبہ والے بھی صرف جامعہ کی چھاپی ہوئی کتابیں سجائیں۔

۴۔ اور لڑکوں کو مشغول رکھنے کے لئے ایک ڈراما کھیلا جائے۔

۵۔ پیام تعلیم والے خاص نمبر نکالیں جس میں زیادہ تر جامعہ کے استاد اور لڑکوں کے مضامین ہوں۔

جب لڑکوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا عید کی تیاریاں ہو رہی ہیں کچھ کرنے کی خوشی میں پہلے سے زیادہ پڑھا لکھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ لکھنے پڑھنے کا شوق بڑھتا ہی گیا۔ جماعتوں میں بے رونقی نہ رہی۔ کھلنڈرے لڑکوں کی تو بن آئی۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتے تھے۔ یہ کام زیادہ تر بڑے لڑکوں یعنی ثانوی اور کالج والوں کا تھا۔ چلانے کو تو یہ کام ذاکر صاحب نے چلا دیا لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ یہ اسی صورت میں پائدار ہوگا جبکہ اس کی بنیادیں مضبوط ہوں یعنی اس سلسلے میں ابتدائی مدرسہ کو بہتر بنایا جائے ان کے خیال میں بالکل صحیح تھا کیونکہ ثانوی اور کالج میں پڑھنے والے پہلے ابتدائی منزل سے گزرتے ہیں اگر اس منزل میں ٹھیک سے کام کر لیا تو آگے چل کر سہولت رہتی ہے جامعہ کے استادوں کی یہ آرزو گیارھویں سال سے پھلنے پھولنے لگی اس کا ذکر تو اپنے وقت پر آئے گا اس وقت ۱۹۳۰ء کا "یوم تاسیس" کا کام سامنے ہے۔

تاریخ اور جغرافیہ میں مسلمانوں کی حکومتوں کے نئے اور پرانے نقشے چندرگپت کا زمانہ اور راجپوتوں کی ریاستوں کے نقشے ... اشوک کی سلطنت کے نقشے بنائے گئے۔ لال قلعہ (دہلی) کی چیزیں دکھلا کر مضمون لکھوایا گیا ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی میں جو پرانی درسگاہیں رہ گئیں یا جو نئی قائم ہوئیں ان کا حال گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد لکھا گیا۔ اسلامیات والوں نے مشہور حدیثیں جمع کیں آں حضرتؐ کے آخری خطبہ کو بہت خوش خط لکھوا کر آویزاں کیا۔ اردو والوں نے اس زبان کے پانچ مشہور مصنفوں کے (جو عناصر خمسہ کہلاتے ہیں) حالات لکھے اور ان کی تصویریں بنائیں۔ سائنس والوں نے کام کے چارٹ بنائے منشی علی محمد خان صاحب ہندوستان کے بہترین خوش نویسوں میں سے تھے۔ آپ کا تعلق شروع سے آخر تک جامعہ ہی سے رہا۔ لڑکوں نے آپ کی نگرانی میں اچھے اچھے کتبے اور قطعات تیار کئے۔ ڈرائنگ والوں کی تو بن

آئی۔ جولڑکے ڈرائنگ اچھی جانتے تھے وہ تو آرٹسٹ بنے ہوئے تھے۔ طاہر علی، مسعود اختر، ضمیرالدین نے اسلامی ملکوں کے بڑے بڑے رہنما، ہندوستان کے مشہور لوگوں کی منہ بولتی تصویریں بنائی تھیں۔ شعبہ نجاری نے اس سجاوٹ میں چار چاند لگا دیے۔ لکڑی کی خوبصورت ڈھال (شیلڈ) کے چاروں طرف نقاشی اور بیچ میں جامعہ کی مہر کندہ کر کے رنگ وروغن کر دیا تھا۔ لکڑی کا کچھ اور سامان بھی تیار کیا تھا۔

کرائے کی عمارتوں میں بھلا خوبصورت ہال کہاں سے لاتے۔ صحن میں شامیانے لگا کر سب چیزیں سجائی تھیں۔ ایک طرف جلسے کا انتظام تھا۔ مشہور لوگوں میں سے کون نہیں تھا، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سری نواس آئنگر، ستیہ مورتی، این بسی کیلکر، مولانا ظفرالملک، مسز اینی بیسنٹ، مسٹر آصف علی سب ہی تھے۔

پہلے تو دسویں جماعت تک کے طلبار کا تقریری مقابلہ ہوا۔ پھر پنڈت مدن موہن مالویہ نے قومی جھنڈا لہرایا۔ جوں ہی جھنڈا لہرایا گیا، لڑکوں نے قومی ترانہ گایا، جلسہ کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے کیونکہ حکیم صاحب مرحوم کی وفات کے بعد آپ ہی امیر جامعہ ہو گئے تھے "اجمل یادگار فنڈ" میں بہت سستی کے ساتھ چندہ جمع ہو رہا تھا یہ سال استادوں نے بڑی مشکلوں سے گذارا۔ یہ ساری دھوم دھام لڑکوں کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کے لئے ہو رہی تھی۔ ورنہ اس زمانے میں جامعہ کی مالی حالت انتہائی حد تک خراب ہو گئی تھی۔ قوم کے رہنما تعلیم کی طرف سے غافل تھے اس کی ایک مثال یوں بھی سمجھئے کہ چند مالی قوم کی بھلائی کے لئے مصیبتیں اٹھا کر باغ کے پودوں کو سینچ رہے ہوں قوم سیر کرتی ہوئی ادھر آنکلے اور پوچھے بھی نہیں کہ حال کیسا ہے تو اس نعت مالی جو کچھ کہے اس کا کہا برا نہیں لگتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اپنے ساتھی

مالیوں کا کام دکھلانے کے بعد بعض کرڑی باتیں اس انداز سے کہیں لوگوں نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"جامعہ ملیہ ایک خاندان کی طرح ہے استاد لڑکوں کے ساتھ وہی برتاؤ کرتے ہیں جس طرح خاندان کے لوگ اپنے عزیزوں سے کرتے ہیں۔ گذشتہ سال اس خاندان پر ایک بڑی مصیبت آئی وہ یہ کہ اس خاندان کا سرپرست مرگیا یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا ان کے اس انتقال سے ہمیں جتنا صدمہ ہونا چاہیے تھا اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔ ہم بہت مشکلوں میں ہیں۔ حکیم صاحب باوجود اپنی ذاتی مصروفیتوں اور قومی وملکی کاموں کے اتنا وقت پھر بھی نکال لیتے تھے کہ قرول باغ آئیں اور جامعہ کے چھوٹے بچوں سے باتیں کرنے میں اپنے قیمتی وقت کا ایک حصہ صرف کریں۔

ہمارے ہندوستانی رہنماؤں میں حکیم صاحب ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں ہندوستان کی ایک بڑی تعداد سے وہ ذاتی اور شخصی تعلقات تھے جو غالباً اور کسی کو حاصل نہیں ہیں لیکن باوجود ان تعلقات کے اس قوم نے ان کی یادگار قائم رکھنے کیلئے کوئی سرگرمی نہیں دکھلائی اس میں کچھ مانگنے والوں کا بھی قصور ہے تعلیم کا یہ پیشہ جتنا معزز تھا اتنا ہی ذلیل ہوگیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تعلیم گاہ کے لئے چندہ دینا فخر سمجھا جاتا تھا لیکن ہماری گداگری نے اس پیشے کو ذلیل ورسوا کر دیا ہے اب ہم نے خود اپنے گریبان میں منہ ڈالا اور یہ عہد کیا ہے کہ چاہے جتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں اس یادگار کو قائم رکھیں گے تا آں کہ قوم خود ہی اس کی طرف توجہ کرے۔ اس مقصد کے لئے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے جس میں یہ شرط رکھی ہے کہ جامعہ کے جو کارکن اس کے ممبر ہوں گے اُن میں سے کوئی شخص ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ کسی حالت میں نہ لے گا اور اس وقت اس کا کوئی

رکن چھتر روپے سے زیادہ نہیں لے رہا ہے۔
روپے دو ہی طرح سے وصول ہوتے ہیں ایک ٹیکس سے دوسرے نذر سے
ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے کام سے ہم اپنے کو اس بات کا مستحق بنائیں گے کہ قوم ہمیں نذر
دے۔ ممکن ہے آپ لوگوں کو میری یہ باتیں غرور سے بھری ہوئی معلوم ہوں لیکن
میں بہت خاکسار واقع ہوا ہوں اور اس وقت ایسا کہنے پر مجبور ہوں امید ہے کہ
آپ معاف فرمائیں گے۔"

ایک طرف تو ذاکر صاحب نے ایسی تقریر کی اور دوسری طرف جلسہ ختم
ہونے کے بعد جب چائے کا وقت آیا تو بڑی محبت کے ساتھ لوگوں کو چائے
پلانے لگے اور کیوں نہ پلائیں اپنوں سے گلہ بھی ہوتا ہے اور محبت بھی۔ دنیا کا دستور
ہی یہ ہے ڈاکٹر صاحب موقع و محل کے لحاظ سے بات ہی ایسی کرتے ہیں کہ دل
میں اُتر جاتی ہے۔ مدرسہ میں مختلف موقعوں پر مثلاً "الوداعی دعوت"، "انجمن اتحاد
کی مسند نشینی"، مدرسہ کے جلسوں میں انھوں نے جو خاص خاص تقریریں کی
ہیں ان کے کچھ ٹکڑے اس کتاب میں کہیں کہیں نظر آئیں گے۔

رات کے وقت استادوں اور لڑکوں نے دو ڈرامے کھیلے ان کا ذکر اسی
سال کی کہانی میں ڈراموں کے سلسلے میں آچکا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا حافظ فیاض احمد صاحب کی نگرانی میں جامعہ کی ایک شاخ
شہر میں قائم ہو چکی تھی۔ رسالہ ہونہار کے مدیر فیاض حسین صاحب جامعی کی
نگرانی میں یہ مدرسہ ترقی کر رہا تھا۔ یہاں کے لڑکوں نے "معلومات عامہ"
کا اہتمام کیا اور مہمانوں کے سامنے "مبارک باد" کا کھیل دکھایا ان کے ہاتھوں
میں "گتے" کے ٹکڑے تھے ان سے "مبارک باد" کا لفظ طرح طرح کی ورزش
کرنے سے بنتا تھا۔

جلسہ تاسیس جامعہ

مالی حالت کے خراب ہونے کی وجہ سے وظیفہ پانے والے خود دار طالب علموں نے تہیہ کیا تو اگر چھوٹے موٹے کسی نہ کسی کام کو انجام دے کر فیس کا ایک حصہ ادا کریں گے اس مطلب کے لئے "انجمن کاسپن" کی بنا رڈالی۔ ولایت کی بعض درسگاہوں میں بھی ایسا ہی انتظام ہے۔ دوسروں کے محتاج ہوکر تعلیم پانے میں کوئی نہ کوئی اندیشہ لگا رہتا ہے۔ کچھ نہ کچھ کماتے رہنے سے اور چیزوں کی طرح اس کا شوق بھی بڑھتا رہتا ہے۔

گاندھی جی نے اپنے پوتے "رسیک لال" کو تعلیم دلانے کے لئے جامعہ بھیجا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو گاندھی جی جامعہ میں تشریف لائے۔ لڑکوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔

"میرا غم دور کرنے کے لئے یہ بچے بہت ہیں"

گاندھی جی جب بھی دہلی تشریف لاتے تھے جامعہ کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ "جامعہ کو مسلمانوں کی زندگی کا صحیح نمونہ ہونا چاہیئے اگر غیر مسلم کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنی ہوں تو وہ سب جامعہ میں ملنی چاہیئں"

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اس دفعہ ایک ہفتہ تک جامعہ میں رہے، آپ نے انجمن اتحاد میں "مذہب کی حقیقت" پر تین خطبے دیئے۔ جامعہ اور ندوہ کے تعلقات کو مضبوط بنانے کے لئے طلباء اور اساتذہ میں علیحدہ سے تقریریں کیں۔

ذاکر صاحب نے تاسیس کے موقع پر جو تقریر کی تھی اس کا اثر ہوا۔ مختلف صوبوں سے دعوت آئی کہ چندہ کرنے کے لئے وفد بھیجے جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، ڈاکٹر ذاکر صاحب اور جامعہ کے استادوں نے کئی صوبوں کے دورے کئے۔ مدراس میں سیٹھ جمال محمد صاحب کی توجہ سے کافی روپے جمع ہوگئے تھے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے سیٹھ صاحب اپنے خرچ سے ایک مدرسہ چلا رہے تھے پھر بھی آپ نے جامعہ کی طرف توجہ کی اور جامعہ ہی پر کیا

منحصر ہے جس کسی نے بھی مسلمانوں کی بہتری کے کسی کام کے لئے چندہ مانگا سیٹھ صاحب نے فراخ دلی کے ساتھ ہاتھ بٹایا۔

شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی تقریر میں "انجمن تعلیم ملی" کا ذکر کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس انجمن کے وجود میں آنے کا پس منظر اور اس کے قیام کی ضرورت بتائی جائے۔ جس وقت حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال ہوا ہے تو جامعہ مقروض تھی حکیم صاحب زندہ ہوتے تو اس کی ادائیگی کا کوئی نہ کوئی انتظام کرتے۔ جامعہ کے کام کرنے والے پریشان تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا ہوگا ڈاکٹر انصاری نے جامعہ کی سرپرستی کا فرض اپنے ذمہ لے لیا۔ حکیم اجمل خاں فنڈ کے لئے روپیہ جمع کرنے میں کامیابی نہ ہوئی جیسا کہ گذشتہ جلسہ میں ذکر ہوا ہے۔ ....

...... ۵۵ ہزار روپے کی ضرورت تھی اور سوال تھا کہ یہ رقم کیسے فراہم ہو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کی تمام مالی کیفیت ۹ جولائی ۲۷ء کے ایک خط کے ذریعہ من وعن امیر جامعہ جناب ڈاکٹر انصاری کی خدمت میں پیش کی اور ان سے یہ کہا کہ مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے جلد از جلد حل کرنے کی ضرورت ہے اسے حل کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو امناء جامعہ (ٹرسٹیز) غیر معمولی سعی و کوشش سے مطلوبہ رقم فراہم کر دیں یا اگر وہ نہ کر سکیں تو اپنی طرف سے جامعہ کو بند کر دیں اور اس کے کام سے دست کش ہو جائیں لیکن اس کو بند کرنے سے پہلے قوم کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ اگر اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو کوئی اور جماعت اسے اپنے ہاتھ میں لے لے اور اسے چلائے۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جنھوں نے اپنی عمر قومی تعلیم کے کام میں وقف کرنے کا تہیہ کر لیا ہے یہ لوگ شاید ملک کے بااثر اور دولت مند اشخاص میں کچھ ایسے لوگ تلاش کر سکیں جو ان کے ارادوں سے محض ہمدردی ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ ان کی تکمیل میں عملی حصہ لینے کو بھی

تیار ہوں۔ امنا جامعہ اس کام کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے دے تاکہ وہ اسے اپنی خواہش اور بساط کے مطابق جہاں تک چلا سکیں چلائیں ۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے امناء جامعہ کے پاس ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا خط اور جامعہ کے مفصل حالات لکھ بھیجے۔ اپنے خط میں انھوں نے یہ تحریر کیا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم آئندہ سال کے مصارف اور پچھلے قرض کی ادائیگی کے لئے ۵۵ ہزار روپیہ جمع نہیں کر سکتے۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو پھر ہم کیوں نہ صاف طریقے پر اس کا اعلان کر دیں کہ ہم جامعہ کو چلانے سے قاصر ہیں۔ ہمارا یہ اعلان کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو لیکن دیانت پر مبنی ہوگا اور اگر ہم اس وقت ایسا نہ کریں گے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہمیں مجبوراً یہی کرنا ہوگا۔ ہر وہ شخص جو جامعہ کو ایک اہم قومی تحریک سمجھتا ہے اور جسے اس مفید کام سے کچھ قلبی تعلق ہے یہ اعلان نہ کرنا چاہے گا کہ جامعہ بند ہوگئی۔ میرا خود یہی جذبہ ہے، میں ہرگز اس وقت کا خیال بھی کرنا نہیں چاہتا جب جامعہ نہ رہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے دست کش ہو جانے سے جامعہ کی موت لازم نہیں آتی بلکہ ممکن ہے اسی سے ہماری اس عزیز درس گاہ کے لئے نئی زندگی کا سامان ہو سکے۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس بارے میں مفصل گفتگو کی ہے کہ اگر ہم امناء جامعہ سے دست کش ہو گئے، تو وہ کیا کریں گے انھوں نے اپنے ارادوں کا جو خاکہ میرے سامنے پیش کیا ہے وہ عزم و استقلال کی قابل ستائش مثال ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اپنے ساتھیوں میں سے انجمن، "تعلیم ملی" کے نام سے ان لوگوں کی ایک جماعت بنائیں جو ہر صورت میں قومی تعلیم کے کام کرتے رہنے کا عہد کرے۔ یہ جماعت اپنے اوپر دولت کا دروازہ بند کرلے اور صرف اس قدر اجرت پر جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہو ملی تعلیم کے کام کو انجام دے۔ یہ لوگ عہد لینا چاہتے ہیں کہ ایک مقررہ رقم سے زائد کبھی مشاہرہ نہ

لیں گے اور ان کا ارادہ یہاں تک ہے کہ جب تک جامعہ کے آئندہ مالی انتظامات نہ ہو جائیں یہ بالکل بلا معاوضہ کام کریں تاکہ جامعہ پر قرض کا بار نہ بڑھتا جائے مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اپنے خلوص اور ہمت سے بہت سے ساتھی اور مددگار پیدا کرلیں گے۔ اس لئے ہم اطمینان کے ساتھ جامعہ کے مستقبل کو ان کے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں۔" ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اس تحریر میں یہ بھی لکھا کہ میں نے ۲۵ جولائی ۱۹۲۶ء کو امناء کا ایک غیر معمولی جلسہ بلانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ براہ کرم کل معاملہ پر اچھی طرح غور فرمائیے اور جلسہ میں شرکت فرماکر اپنی رائے سے فیصلہ میں مدد دیجئے۔ اور شرکت نہ کرسکنے کی صورت میں تحریری رائے ضرور جلسہ سے قبل بھیج دیجئے۔"

ڈاکٹر انصاری مرحوم نے یہ خطوط ملّت کے اکابر کے نام روانہ کئے اور ادھر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنے ساتھیوں کو جو چھٹیوں میں اپنے اپنے وطن گئے ہوئے تھے ایک خط لکھا اور انھیں تمام حالات بتائے کہ "جامعہ مقروض ہے، روپیہ مفقود ہے، جامعہ کے بند کرنے کا سوال درپیش ہے، آپ اس کام کو یا اسکے کسی حصے کو بچانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ کام کو جاری اسی وقت رکھا جاسکتا ہے جب کہ آپ ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے اور مشکلات سہنے کے لئے تیار رہیں۔" اکابر ملّت اور جامعہ کے کارکنوں کے پاس یہ خط ساتھ ہی ساتھ بھیجے گئے تھے۔ امناء کی جماعت میں سے اکثر نے جواب ہی نہ دیا اور جنھوں نے جواب دیا بھی تو یہی کہ "کام چلنے والا نہیں ہے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ اسے بند کردو۔" ان نوجوانوں نے جو جامعہ میں کام کرتے تھے یہی لکھا کہ ہم جامعہ کے کام کو جاری رکھیں گے اور جامعہ کی چلانے والی جماعت کا ہر شرط پر ممبر بننے کے لئے تیار ہیں آخر امناء جامعہ کا جلسہ ہوا اور یہ طے پایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس کے کارکنوں کے سپرد کردیا جائے۔"

جامعہ کے نوجوان کارکنوں نے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے جامعہ ملیہ کو چلانے کے لئے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی جس کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ کم سے کم ۲۰ سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ طلب نہ کریں گے۔ پہلی دفعہ جن حضرات نے اس عہد نامہ کنیت پر دستخط کئے ان کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ ۲۔ پروفیسر محمد مجیب۔ ۳۔ مولانا اسلم جے راج پوری ۴۔ مولانا خواجہ عبدالحیٔ۔ ۵ حافظ فیاض احمد۔ ۶۔ ارشادالحق، ۷۔ ماسٹر برکت علی ۸۔ سعدالدین انصاری۔ ۹۔ سعید انصاری۔ ۱۰۔ شفیق الرحمٰن قدوائی۔ ۱۱۔ حامد علی خاں۔

عہد نامہ پر دستخط کرنے والوں کے علاوہ دوسرے اساتذہ نے بھی اپنی تنخواہیں کم کرالیں تاکہ جامعہ کا خرچ کم ہو جائے اور اس کے مالی انتظامات میں زیادہ دشواری نہ ہو خدائے تعالیٰ نے ان جواں ہمت نوجوانوں کے کام میں برکت دی۔ ان کی راہ میں مشکلات تھیں۔ انھوں نے عسرت و تنگی میں دن گزارے مگر رفتہ رفتہ حالات بدلے قوم نے توجہ کی اور انھیں مالی اور اخلاقی مدد ملنے لگی۔ جامعہ کو والیان ملک اور مخیر لوگوں سے غیر مشروط امداد کے طور پر خاصی بڑی رقمیں ملیں لیکن اس کا سب سے بڑا سہارا وہ چھوٹی رقمیں تھیں جو ہمدردان جامعہ سے وصول ہوتی تھیں۔

انجمن تعلیم ملی کے قیام کے سلسلے میں جو ضابطے کے جلسے ہوئے ان کی روئداد درج ذیل ہے۔

۲۵ جولائی ۲۸ئ کو اُمنا، جامعہ کا ایک غیر معمولی جلسہ ڈاکٹر انصاری صاحب امیر جامعہ کے دولت کدہ پر بلایا گیا۔ اکثر امنا، نے اپنی تحریری رائیں شیخ الجامعہ کی تجویز کی تائید میں بھیجی تھیں اور جامعہ سے علیحدگی اختیار

کرنے کی اطلاع دی تھی۔ حاضرین جلسہ نے بھی بعد غور و بحث اس تجویز کو منظور کیا کہ جامعہ کو ایک مجلس تعلیم ملی کے سپرد کر دیا جائے جس میں جامعہ کے وہ اساتذہ شامل ہوں جو ایک طویل مدت کے لئے ایک معینہ رقم سے کم پر جامعہ کی خدمت کرنے کا اقرار کریں۔ اور موجودہ امنا میں سے وہ جو کم سے کم ۲۰۰۰ روپے سالانہ دینے یا دلانے کا اقرار فرمائیں۔ چنانچہ شیخ الجامعہ نے اساتذہ اور امنا جامعہ کو اس فیصلہ کی اطلاع دی اور جو لوگ ان شرائط پر انجمن تعلیم ملی میں شامل ہونا چاہتے تھے ان کی تحریریں آنے پر انجمن کے قواعد مرتب کرنے کے لئے جلسہ منعقد کیا جس کی روئداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

انجمن تعلیم ملی دہلی کا ایک جلسہ ۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کو دفتر جامعہ ملیہ میں منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل صاحبان شریک جلسہ ہوئے۔

مولوی محمد اسلم صاحب۔ خواجہ عبدالحیٰ صاحب۔ حافظ فیاض احمد صاحب برکت علی صاحب۔ مولوی سعد انصاری صاحب۔ سعید انصاری صاحب۔ شفیق الرحمٰن صاحب۔ ارشاد الحق صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تحریک اور حافظ فیاض احمد صاحب کی تائید پر مولوی اسلم صاحب جلسہ کے صدر منتخب ہوئے۔ جلسہ نے انجمن تعلیم ملی کے لئے دستور اساسی منظور کیا جو ۱۰ دفعات پر مشتمل ہے۔

اس کی چند خاص باتیں یہ ہیں۔

(۱) اس انجمن کا نام انجمن تعلیم ملی دہلی ہوگا۔

(۲) اس کا مقصد ملک میں اور خصوصاً مسلمانوں میں قومی اور ملی اصول پر صحیح تعلیم کا پھیلانا ہوگا اور انجمن اپنے اس کام میں مندرجہ ذیل دو اصول کی ہمیشہ پابند رہے گی۔

جامعہ کا ایک وفد

(۱) حصول آزادی ہند تک یہ حکومت وقت سے کوئی تعلق نہ رکھے گی اور اس سے نہ کسی قسم کی امداد چاہے گی نہ قبول کرے گی۔

(۲) تمام مذاہب عالم کے ساتھ رواداری برتے گی۔

اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کو قائم رکھے گی اور ترقی دے گی۔

۳- یہ انجمن دو قسم کے اراکین پر مشتمل ہوگی (۱) دائمی رکن (۲) معاون رکن

۴- دائمی رکن وہ لوگ ہوں گے جو حسب ذیل عہد نامہ کو منظور کریں۔

میں ..... ولد .... عہد کرتا ہوں کہ میں بیس سال تک تاحیات (ان میں سے جو مدت بھی کم ہو) انجمن تعلیم ملی کی خدمت کروں گا اور کبھی مبلغ ما ﷲ ، ماہوار سے زیادہ مشاہرہ اپنی خدمت کا نہ لوں گا میں انجمن کے مقاصد اور اس کے دستور کا وفاداری سے پابند رہوں گا۔ اور اس دستور کے ماتحت جو قواعد و ضوابط وقتاً فوقتاً بنیں گے ان کی پابندی کروں گا۔

دستخط۔

مندرجہ ذیل انتخابات بہ اتفاق رائے عمل میں آئے۔

صدر انجمن	ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری
معتمد انجمن	ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
خازن انجمن	سیٹھ جمنا لال بجاج

چار اراکین مجلس منتظمہ :- (۱) مولانا اسلم صاحب (۲) خواجہ عبدالحیٔ صاحب (۳) محمد مجیب صاحب (۴) شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی۔

یوں جامعہ کے تیسرے دوَر کا آغاز ہوتا ہے۔

دسواں سال

اگست ۱۹۲۹ء سے جولائی ۱۹۳۰ء

قرول باغ میں "مدرسہ شبینہ" کے لئے جو زمین خریدی گئی تھی اس پر چند کمروں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ شہر سے دور کسی مقام پر زمین کی خریداری کے لئے کمیٹی کا تقرر ہو چکا تھا۔ روپیہ کہاں سے آیا! ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ کی کوشش سے پچیس ہزار کے لگ بھگ نقد رقم ملی تھی۔ اس وفد نے حیدرآباد (دکن) کا دورہ کر کے یہ رقم حاصل کی تھی۔ نیز ریاست سے مستقل امداد کے لئے درخواست دے دی تھی..........

.......عمارتیں تو خیر دیر میں بنیں سر دست کرائے کی عمارتوں میں دو خوبصورت کوٹھیوں کا اضافہ ہو گیا۔

جامعہ کے سابق طالب علم علی احمد صاحب نیشنل اسکول، رنگون کے صدر مدرس تھے، اپنے عملے اور دیگر حضرات سے چندہ کر کے ہر سہ ماہی پر ایک معقول رقم بھیجا کرتے تھے۔

ڈانڈی کے نمک ستیہ گرہ کے سلسلے میں "سول نافرمانی" کی تحریک زوروں سے چل رہی تھی۔ جامعہ کے طلباء اور اساتذہ میں کافی جوش و خروش تھا۔

یہ قدرتی بات تھی کہ جامعہ میں جو جلسے ہوا کرتے تھے ان میں شیخ الجامعہ صاحب کی تقریریں اسی سیاسی پس منظر میں ہوتی تھیں، پہلا جلسہ انجمن اتحاد کی مسند نشینی کا تھا، یہ تحریک شروع ہونے سے پہلے ہوا تھا اور بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔ جامعہ کے تمام طلبا نے جن میں بڑے سکالر بھی شامل تھے مولانا محمد علی اور بیگم صاحبہ کی موجودگی میں رات کا دعوتی کھانا کھایا دستور کے مطابق ناظم صاحب پچھلے سال کی کارگزاری سناتے ہیں اور نئے نائب صدر مسند نشین بنے ہوئے نئے سال کے لئے اپنے ارادوں کو ظاہر کرتے ہیں ۔ نئے نائب صدر عبدالکریم صاحب (پشاوری) نے فرمایا "جامعہ" کام کرنے کا کوئی ایک خاص راستہ مقرر کرے یعنی ان باتوں کا اعلان کر دے جن پر عمل کرنا جامعہ کے ہر ایک لڑکے اور استاد کے لئے ضروری ہے اور استادوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی یک جہتی سے تمام لڑکوں کو ایک رنگ میں رنگ دیں"، ایسے موقعوں پر شیخ الجامعہ کے لئے جواب دینا ضروری ہوتا ہے چنانچہ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے فرمایا۔

" جامعہ کے مقصد اور نصب العین کو معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ ایک ایسے زمانے میں وجود میں آئی جب اسلام اور مسلمانوں پر سب سے بڑی مصیبت آئی تھی اور جب ہندوستان کی دو بڑی قومیں یعنی ہندو مسلمانوں نے آزادیٔ وطن کے لئے متحدہ کوشش شروع کی تھی۔ اس حیثیت سے جامعہ جہاں اسلامیہ ہے دوسری طرف ملیہ بھی ہے وہ اپنے اندر ایک طرف اسلامی روایات اور تعلیم کو زندہ کرے گی اور اسی کے ساتھ دوسری طرف متحدہ قومیت کی تعمیر اور اپنے وطن کی آزادی میں مساعی رہے گی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مقصد اس سے زیادہ واضح اور روشن اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ دوسری چیزیں مثلاً ایک قسم کی ٹوپی ایک رنگ کے کپڑے پہننا محض اس مقصد کے ذرائع اور مظاہر ہوں گے"۔

" جہاں اساتذہ پر طلباء کو ایک رنگ میں رنگنے کی ذمہ داری ہے وہاں کالج

کے لڑکوں پر بھی ایک رنگ میں آسانی سے رنگ جانے کا فرض عائد ہوتا ہے جامعہ کے اکثر اساتذہ ابھی کل تک جامعہ کے طالب علم تھے اور آج وہ اسی کے اساتذہ کے زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں. میں خود بھی اب سے چند سال پیشتر جامعہ کا طالب علم تھا. میرا نام جامعہ کے رجسٹروں میں موجود ہے آج میں اس جامعہ کا شیخ الجامعہ ہو گیا ہوں تو کیا، اس سے کچھ زیادہ فرق پڑ گیا. کل کو بہت ممکن ہے کہ ان ہی کالج کے طلبار میں سے بعض تعلیم سے فراغت پا کر جامعہ کے اساتذہ میں آجائیں اس لحاظ سے جامعہ کے طلبار پر بھی کچھ کم ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے وہ مدرسے کے دوسرے چھوٹے لڑکوں کے لئے بطور نمونہ ہیں ان ہی کو دیکھ کر وہ بھی رنگ پکڑتے ہیں اس لئے بڑے طلبار کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی ہر بات کا خیال رکھیں اور اپنی ذمہ داری کو ہر ہر قدم پر محسوس کریں۔"

کئی سال کی خاموشی کے بعد گاندھی جی ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو اپنی "سول نافرمانی" کی تحریک شروع کرنے کے لئے سمندر کے کنارے ڈانڈی کی طرف روانہ ہوئے تاکہ آزادی کی تحریک میں جان پڑ جائے. ملک میں جب کوئی اہم واقعہ ہوتا ہے تو جامعہ کے طلبار کو اس سے باخبر رکھنے اور اس کی اونچ نیچ سمجھانے کے لئے جلسہ ہوتا ہے یہ بھی سوچا جاتا ہے کہ جامعہ کے طلبار سے اس کا کس حد تک تعلق ہے اور وہ اس کے لئے کیا کر سکتے ہیں ٹھیک اسی تاریخ کو جامعہ میں یہ جلسہ ہوا. اپنا اپنا خیال ظاہر کرنے کی سب کو آزادی ہوتی ہے. سرکاری مدرسوں کی طرح پابندیاں نہیں ہوتی تھیں. اس جلسے میں پہلے لڑکوں نے پُر جوش تقریریں کیں، قومی جذبات کا اظہار جس طرح بن پڑا کیا. اساتذہ کی تقریروں کے بعد شیخ الجامعہ صاحب (ذاکر صاحب) نے فرمایا۔

" اب تک ہندوستان میں جتنی سیاسی تحریکیں اٹھیں وہ زیادہ تر شہروں سے متعلق تھیں

یہ سب سے پہلے ۱۹۲۰ء میں ہوا کہ گاندھی جی نے ایک ایسی تحریک اُٹھائی جو ہندوستان کی اصل آبادی یعنی دیہات کے لوگوں سے تعلق رکھتی تھی، لیکن یہ اتفاق وقت تھا کہ اسی زمانے میں مظالم پنجاب اور خلافت کا زور شروع ہو گیا اور اس طرح وہ تحریک اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر نہ ہو سکی اور ہندوستان کی تمام قوت ان ہی مطالبات کے تسلیم کرانے میں صرف ہوئی۔ سوء اتفاق یہ تحریک پوری کامیاب نہ ہو سکی۔ ملک میں کئی سال تک ایک انتشار اور تفرقہ کا دور دورہ رہا۔ اس عرصے میں ہندوستان نے سب سے بڑی غلطی جو کی وہ دستور اساسی بنانے کی کوشش تھی۔ اب سے چند سال پیشتر انگلستان کے ایک بڑے شخص لارڈ برکن ہیڈ نے یہ طعنہ دیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنا ایک متفقہ دستور اساسی بھی نہیں بنا سکتے۔ بس کیا تھا ہمارے سیاسی اکابرین اس طعنے سے بھڑک اٹھے اور "نہرو کمیٹی رپورٹ" کے نام سے ایک دستور اساسی بنا کر پیش کر دیا لیکن اس کا جو حشر ہوا وہ بالکل قدرتی تھا۔ سیاسی قوت حاصل کرنے سے پیشتر دستور اساسی منظور کرانے کی کوشش ایک عبث کوشش تھی۔ بہر حال اب پورے دس سال کے بعد وہ تحریک پھر اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو رہی ہے۔

جہاں تک جامعہ کے اس تحریک میں حصّہ لینے کا تعلق ہے میں اس بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ جامعہ تو خود جنگ آزادی کے لئے سپاہی تیار کر رہی ہے صحیح تعلیمی کام خود سب سے اہم قومی کام ہے کارکنان جامعہ کی یہ چھوٹی سی جماعت اس ایک کام میں لگی ہوئی ہے اب اس کو کسی اور طرف توجہ کرنے کی ضرورت نہیں لیکن مختلف محرکات کا مختلف لوگوں پر الگ الگ اثر ہوتا ہے یہ ہو سکتا ہے اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہے کہ ہمارے بعض ساتھی اس سیاسی تحریک میں شرکت کے لئے بیتاب ہوں وہ اپنی خدمت کے جذبے کا سب سے بہتر

اظہار شاید اس طرح کر سکتے ہوں کہ انھیں ضرور اس تحریک میں شریک ہونا چاہیئے لیکن چونکہ ان پر جامعہ کی خدمت کا فرض پہلے سے عائد ہے اس لئے پہلے جامعہ سے انھیں اجازت لے لینی چاہیئے تاکہ جامعہ پہلے اپنے کام کا انتظام کر سکے"

قومی ہفتہ کے کام میں اب تک دو تبدیلیوں کا ذکر آیا ہے تیسری تبدیلی یہ تھی کہ اس سال جامعہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے کام کا دائرہ نہ صرف جامعہ کے اندر محدود رکھا بلکہ اپنے گردوپیش کے انسانوں کی خدمت اور ہمدردی بھی اس نے اپنے ذمہ لی...... بعض حضرات کی تحریک سے یہ طے پایا کہ یہ کافی نہیں کہ خدمت خلق و رفاہ عام کے اس قسم کے کام .... صرف سال میں ایک دن یا دو دن کر لئے جائیں بلکہ انھیں مستقل طور پر جاری رہنا چاہیئے تاکہ دوسروں کو نفع بھی پہنچے اور کرنے والوں میں اس جذبہ اور خواہش کی پوری طرح سے پرورش اور نشوونما ہو۔ چنانچہ اس غرض کے لئے جامعہ نے سردست دو کام اپنے ذمے لئے۔ ایک قرول باغ میں صفائی اور حفظان صحت کا انتظام اور دوسرے بے کار مرد اور عورتوں کے لئے تھوڑی بہت معاش کا انتظام۔ اول الذکر کام تو ایک جماعت "ریٹ پیئرز ایسوسی ایشن" کے نام سے انجام دے رہی تھی۔ جس کے ناظم بھی ہماری جامعہ ہی کے ایک کارکن تھے لیکن مؤخر الذکر کام کے لئے جامعہ کے طلبا اور اساتذہ کی ایک جماعت تیار ہو گئی، جو اس کام کو شروع کرے۔

...... سردست خدمت خلق کا کوئی کام اس کے سوا اور اس سے بہتر اور کوئی دوسرا نظر نہیں آیا کہ ان سینکڑوں بیواؤں اور غریب بوڑھیوں کو چرخہ اور روئی فراہم کی جائے اور اس کے عوض مناسب اجرت دے کر ان سے سوت لیا جائے۔ اس سوت سے اگر خود بستی والوں میں ایسے بننے والے نکل آئیں تو انہی سے اجرت دے کر کپڑا تیار کرایا جائے ورنہ فی الحال دوسری جگہ بھیج کر بنوایا جائے

یہ کام نہ صرف وقت کا ایک اہم ترین کام بلکہ اپنے اندر ایک مستقل اور دیرپا نفع رکھتا تھا یقین تھا کہ اس کام سے علاوہ اس کے کہ ایک طرح سے ملک کے اقتصادی پروگرام کی تکمیل ہوگی خود طلباء میں مفلس اور نادار انسانوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا جن کے اندر رہ کر انھیں آئندہ بہت کچھ کام کرنا ہے۔

یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس سال کا "قومی ہفتہ" "سول نافرمانی" کی تحریک کے شباب کے زمانے میں پڑا تھا۔ دن بھر کے کاموں کے بعد شام کے وقت جناب شیخ الجامعہ صاحب کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ پُر درد نظمیں پڑھی گئیں۔ تقریریں ہوئیں۔ ان میں شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی تقریر قابل ذکر ہے۔ جس میں آپ نے جامعہ سے علٰحدہ ہونے اور تحریک ستیہ گرہ میں شریک ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد مولوی سعد انصاری صاحب نے تقریر کی جس میں آپ نے یہ ارادہ ظاہر فرمایا کہ اگر جناب شیخ الجامعہ نے اجازت دی تو میں بھی اپنے اس فرض کی ادائیگی میں پیچھے نہ رہوں گا۔ سب سے آخر میں جناب صدر نے اس قومی ہفتہ کی اہمیت بتلاتے ہوئے بعض تقریروں پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا جو تقریباً آپ ہی کے الفاظ میں ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"میں آج آپ لوگوں کے سامنے کوئی بڑی تقریر کرنا نہیں چاہتا، آپ سب جانتے ہیں کہ یہ ہفتہ جس کی یاد سارے ہندوستان میں منائی جاتی ہے اس کوشش کے آغاز کی یادگار ہے جو ہندو مسلمانوں اور سب ہندوستانیوں نے مل کر اپنے ملک کی آزادی کے لئے آج سے دس سال پہلے شروع کی تھی اور جس کی اول منزل یہ تھی کہ ان سب کا خون بلاامتیاز مذہب مل کر جلیان والے باغ میں بہا تھا ہم اس تاریخی واقعہ کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں لیکن اس کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ رکھی جا سکتی ہے۔ اس طرح بھی یہ واقعہ یاد رہ سکتا کہ

کہ ہم اپنے دلوں میں انگریزی قوم کی طرف سے نفرت و انتقام کے جذبات کی پرورش کریں اور ان ہی جذبات کو دوسری نسلوں تک منتقل کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ ہم سب کے لئے بہت مضر ہے۔ نفرت کی زمین میں نیکی کا پودا کمھلا جاتا ہے اور غصہ اور انتقام کی ہوا خدمت کے پھولوں کو مرجھا دیتی ہے نفرت تخریب ہے، محبت تعمیر۔ اس لئے جامعہ جو تعمیری کام کو اپنی امتیازی خصوصیت بنانا چاہتی ہے نفرت کی پرورش نہیں کر سکتی۔

"اس ہفتہ کی یاد اس طرح بھی منائی جا سکتی ہے اور بڑے وسیع پیمانے پر منائی جاتی بھی ہے کہ نوجوانوں کے سامنے ملک کی حالت بیان کر کے ان میں محکومیت کی ذلت کا احساس پیدا کیا جائے اور اس سے نجات پانے کے لئے سعی و کوشش پر ابھارا جائے۔ یہ کام تقریروں اور تحریروں سے لیا جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لئے یہ بھی کافی نہیں۔ ہم تقریروں سے جذبات کو برانگیختہ کر سکتے ہیں، وقتی نتائج حاصل کر سکتے ہیں لیکن ہمارے لئے یہ کب کافی ہوگا کہ ہم ایک دفعہ جوش میں آکر اپنی آزادی تک حاصل کریں۔ آزادی کو حاصل کرنا مشکل ہے لیکن اُسے قائم رکھنا مشکل تر۔ یہ بھی یاد رکھو کہ آزادی اس کو ملتی ہے اور اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک کوئی شخص یا جماعت اسے قائم رکھنے کی اہل ہو، آزادی ایک مرتبہ حاصل نہیں ہو چکتی۔ یہ روز حاصل کرنے کی چیز ہے اور اس کے لئے وقتی جوش یا جذبہ کارگر نہیں ہوتا بلکہ مستقل عادتوں کی ضرورت ہے یعنی اچھی سیرت کی، اور اچھی عادتیں مشق سے پیدا ہوتی ہیں۔

میری آرزو ہے کہ اس قومی ہفتہ کی یاد تم اس طرح مناؤ کہ اپنے (اندر اپنی قوم اور اپنے ملک کی سچی خدمت کے جذبہ کو وقتی اور عارضی ابال میں ضائع

نہ کرو بلکہ اسے ایک مستقل عادت کے طور پر اپنی سیرت میں محنت و مشقت سے اس طرح راسخ کر لو کہ وہ تمہاری فطرت ثانیہ بن جائے جس ملک میں ہزاروں نہیں لاکھوں، لاکھوں نہیں کروڑوں انسان وباؤں میں مچھر اور مکھی کی طرح مر جاتے ہیں اور کوئی نہیں جو انھیں صفائی اور حفظان صحت کے اصول سکھائے اور جس ملک میں کروڑوں انسان دنیا سے بلا ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر کھانا کھائے چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں جو ان کے افلاس اور ان کی جبری بیکاری میں ان کو سہارا دے۔ وہاں سچی خدمت کے مواقع کی کیا کمی ہے؟

جامعہ میں اب تک جس طرح قومی ہفتہ منایا جاتا تھا اس میں اس کی خواہش پیش پیش تھی کہ سب کام کرنے والوں کو مساوات کا سبق دیا جائے لیکن سال میں ایک مرتبہ ایسا کر لینے سے ہم سب اپنے نفس کو دھوکہ دے لیتے تھے اس لئے مجھے بڑی خوشی ہوئی جب طلبا کے نمائندہ عبدالکریم خاں صاحب نے مجھے اس طرف توجہ دلائی کہ ایسا کرنا بیکار ہے اور دکھاوا۔ میں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور بعض اساتذہ کے مشورے سے اس سال کے لئے میں نے تجویز کیا کہ ہم آج سے قرول باغ کے لئے دو کام شروع کریں قرول باغ میں صفائی اور اس کے باشندوں کو اصول صحت سے آگاہ کرنا اور یہاں کے مفلس اور نادار لوگوں کے لئے بیکاری میں کام فراہم کرنا۔

یہ کام آپ نے آج شروع کئے ہیں اور صبح سے جس طرح آپ نے ان میں انہماک کا ثبوت دیا ہے اس پر میں آپ سب کو مبارک باد دیتا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ پورے سال بھر ان کاموں کو جاری رکھیں گے، اساتذہ اور طلبا میں سے جو لوگ اس میں شرکت کرنا چاہیں وہ براہِ کرم مجھے ایک ہفتہ کے

اندر اندر مطلع کر دیں کہ وہ ان کاموں کے لئے مہینے میں کتنے گھنٹے وقف کر سکیں گے۔

جامعہ نے اپنے ذمہ جو تعمیری کام لیا ہے اس کو یکسوئی اور انہماک سے انجام دینا ہمارا فرض ہے اور یہ فرض ادا کیا جائے گا لیکن جامعہ کے جو لوگ اپنے عقیدہ اور یقین کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اس سیاسی جنگ میں جو آج ملک میں برپا ہے، حصہ لینا چاہیئے۔ وہ جامعہ سے الگ ہو کر اس میں حصہ لے سکتے ہیں بلکہ خود شفیق صاحب نے اس دیانت کی وجہ سے جو ان کی خصوصیت ہے، یہی راہ تجویز کی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ جامعہ کے تعلیمی کام اور ملک کے سیاسی کام کو ساتھ ساتھ ایک وقت میں انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے انھوں نے جامعہ سے الگ ہو کر اس کام کو کرنے کا ارادہ کیا ہے مجھے یقین ہے کہ... جو شخص شفیق صاحب کو جانتا ہے اسے یقین ہوگا کہ شفیق صاحب جو کچھ کریں گے سچائی، خلوص نیک نیتی، کے ساتھ کریں گے اور اپنے عمل سے اپنی مادر علمی کے نام اور اس کی شہرت کو چار چاند لگائیں گے۔ مجھے جامعہ کے سب طلبائے سے یہی توقع ہے کہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہوں، سیاست کی کسی ٹولی سے ان کا تعلق ہو وہ اپنی قوم اور ملت کے مفاد کو اپنی شخصی شہرت اور منفعت پر ترجیح دیں گے اور جامعہ کی تعلیم کا اچھا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اگر جامعہ کا کوئی طالب علم راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں حکومت سے سمجھوتہ کی گفتگو کرنے جائے تو اس پر، اس کی نیت کی پاکی، اس کی بے نفسی اور خلوص پر سب کو ایسا ہی اعتماد ہو جتنا شفیق صاحب کے ایثار اور خود فروشانہ جذبہ قربانی پر ہے۔ میں آخر میں شفیق صاحب کو مبارکباد

دیتا ہوں کہ وہ اپنے یقین اور عقیدہ کا احترام عمل سے کرتے ہیں اور اس میں اپنے آرام و آسائش تک کا خیال نہیں کرتے۔ خدا انھیں ان کے مقاصد میں کامیاب کرے"

سول نافرمانی میں حصہ لینے کے سلسلہ میں جامعہ کے جو اساتذہ اور طلبا، جیل گئے تھے ان کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ حافظ فیاض احمد صاحب اُستاد اور محاسب۔ ۲۔ دیوداس گاندھی (اُستاد) ۳۔ شفیق الرحمٰن قدوائی (اُستاد) ۴۔ حسین حسان صاحب (طالب علم) ۵۔ کنک چندر ڈیکا (طالب علم) ۶۔ کرشنا نائر (طالب علم)

انجمن طلبا، قدیم علی گڈھ کے زمانے میں قائم ہو چکی تھی اب اس کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ اس کا جدید انتخاب بعض سرگرم کارکنوں کی تجویز سے ۴ فروری ۱۹۳۱ء کو عمل میں آیا۔ سابق معتمد جناب برکت علی صاحب کی تقریر کے بعد جو انجمن مذکور کے ماضی و حال پر مشتمل تھی جناب سعید انصاری صاحب کی تجویز سے حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے۔

عہدے داران۔

۱۔ جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب، معتمد

۲۔ جناب حامد علی خاں صاحب، نائب معتمد

۳۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ، خازن۔

دہلی میں رہنے والے ارکان میں سے ۵ اور دہلی سے باہر رہنے والوں میں سے ۴، اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔

جامعہ کے ایک طالب علم محمد سرور صاحب جامعہ سے عربی کی آخری ڈگری لے کر اعلیٰ تعلیم پانے کے لئے مصر گئے تو طلبا، کے ایک جلسہ میں سرور صاحب کو مخاطب کرکے ذاکر صاحب نے فرمایا:۔

"سرور صاحب! یہ کتاب میں آپ کو اپنی طرف سے بطور ہدیہ کے دے رہا ہوں جسے پڑھ کر ان گنت لوگوں نے تسلی اور اطمینان حاصل کیا ہے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو بھی جب کبھی تفکرات و تردادت لاحق ہوں تو اسی طرف رجوع کریں۔ بہت سے لوگ اسے بے سمجھے پڑھتے ہیں اور بعض سمجھ کر۔ آپ سے امید ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھیں گے۔"

یہ ہدیہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا مترجم قرآن شریف تھا جس پر مخمل جلد لگی ہوئی تھی۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا۔!

"ہم ایک غلام ملک کے باشندے ہیں اور اس میں بھی ایک بدنصیب قوم کے فرد۔ باہر کے دوسرے ملکوں میں ہندوستان کے علم و فضل کا تو بہت شہرہ ہے لیکن مسلمان اسی قدر بدنام ہیں۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ہم اپنے سفیر اور مبلّغین دوسرے ممالک میں بھیجیں جو ہمارے دامن سے اس بدنامی کے داغ کو رفع کر سکیں، ہمارے سفیر، ہمارے مبلّغ، وہاں جا کر اچھا اثر قائم کر سکتے ہیں۔ آپ کو اپنے اس مبارک سفر کی جہاں خوشی ہونی چاہیئے وہاں اس فرض کا احساس بھی ہونا چاہیئے، آپ سے توقع ہے کہ آپ اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

اب مہمانوں کا حال سنئے۔

مہمانوں کا تانتا بندھا رہا۔ سول نافرمانی کی تحریک سے پہلے گاندھی جی جامعہ تشریف لائے تو کھدر کے کام کو بڑھانے کے لئے جامعہ کے طلبا اور اساتذہ نے پانچ سو ایک روپے کی تھیلی پیش کی اس موقع پر گاندھی جی نے جو تقریر کی اس کا یہ فقرہ ہمیشہ یاد رہے گا کہ جب میں آتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے

اپنے گھر میں ہوں بسر اکبر حیدری اور نواب اکبر یار جنگ جن کی کوششوں سے جامعہ کو حیدر آباد سے امداد ملی اور مدراس کے سیٹھ جمال محمدؐ صاحب جامعہ دیکھنے کے لئے تشریف لائے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اسمبلی کے جلسوں کے لئے دہلی آئے ہوئے تھے انجمن اتحاد کی دعوت پر آپ نے "علم ہیئت" پر تقریر فرمائی۔ ایک جلسے میں مولانا شوکت علی نے بتایا کہ کن شرائط پر مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونا چاہیئے۔ گل شیر خاں صاحب کی آمد کی شان ہی نرالی تھی آپ نے ایک جلسہ میں استادوں اور لڑکوں کے سامنے بعض مشہور قومی رہنماؤں کی تقریروں کی نقل ہو بہو اس طرح کی کہ چھوٹے بڑے ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر اٹمنلی (دنیا کے بہترین مقرر) مسٹر ایڈی (دنیا کے مشہور سیاح) مدراس کے صنعتی کالج کے پرنسپل، امریکہ کے مسٹر رچرڈ کیتھن بھی ذکر کے قابل ہیں۔

آخر میں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہاکی میں طلباء اور اساتذہ کا میچ ہوا۔ استادوں میں ذاکر صاحب، مجیب صاحب، سعد انصاری صاحب، جیسے کھلاڑی دلچسپی کا باعث تھے۔

اب یہاں سے جامعہ کا تعمیری دور شروع ہوتا ہے۔

گیارھواں سال

اگست ۱۹۳۰ء سے جولائی ۱۹۳۱ء

علی گڈھ کے ہنگامی دور کے بارے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ جامعہ کے کارکنوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے مدرسے ایک ساتھ کھول دیئے لیکن انھیں منزل بمنزل کس طرح بہتر بنائیں، یہ بات سامنے نہیں تھی۔ بنیاد مستحکم کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے ابتدائی تعلیم پر زور دیا جاتا پھر درجہ بدرجہ آگے بڑھتے لیکن اس مجبوری کو ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ کہ جامعہ کو ملک و قوم کی ایک فوری ضرورت پوری کرنی تھی اور نقشہ بنا کر کام کرنا مشکل تھا۔ بہرحال اب ڈاکٹر ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پہلی بار جامعہ کی تعمیر و ترقی کا ایک نقشہ بنایا۔ ۱۹۲۹ء میں یہ تجویز تیار کی کہ ابتدائی کے اساتذہ کی ٹریننگ کا کام شروع کیا جائے اور مدرسہ ابتدائی کا انتظام علیحدہ کر کے اسے ایک نمونے کا مدرسہ بنایا جائے۔ یوں تو ملک بھر کے مختلف حصوں میں ٹریننگ اسکول اور چند کالج بھی موجود تھے۔ مگر ذاکر صاحب کی نگاہ نئے تجربوں پر تھی۔ ان دنوں امریکہ کے چرچ مشن کا ایک ٹریننگ اسکول، موگا، ضلع فیروزپور، پنجاب میں جدید طریقوں پر کام کر رہا تھا۔ اس میں "پروجکٹ

میتھڈ" (منصوبی طریقہ) اسٹوری میتھڈ (کہانی کا طریقہ) پر خاص کام ہو رہا تھا نیز ہاتھ کے کاموں کو بچوں اور مدرسہ کی زندگی کا جزو بنا کر مفید تجربے ہو رہے تھے۔ ذاکر صاحب نے موگا ٹریننگ اسکول کے پرنسپل ہار پر صاحب سے رابطہ پیدا کر کے اپنے ہاں کے استادوں کو باری باری سے ٹریننگ کے لئے بھجوانا شروع کیا۔ جب میں وہاں سے لوٹا تو موصوف فرمانے لگے۔

"میں نے ایک کام ایسا سوچ رکھا ہے جو آپ کی طبیعت کے مناسب ہے جسے آپ رفتہ رفتہ بہتر بنا سکتے ہیں۔ پہلی چار جماعتیں (ابتدائی اوّل سے چہارم تک) آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ چھوٹی سی نئی عمارت جو بن رہی ہے، اس میں چند کمرے تیار ہیں اپنا کام وہیں شروع کیجئے۔ جن جن لوگوں اور چیزوں کی ضرورت ہوگی وہ آپ بتائیں گے، میں انتظام کروں گا۔"

جس وقت یہ چار جماعتیں ملی ہیں۔ ان میں لڑکے کم تھے زیادہ تعداد چہارم میں تھی۔ کچھ کرنے سے پہلے نئے سامان کی لمبی چوڑی فہرست پیش کرنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس زمانے میں ڈسک نہیں تھے۔ ٹاٹ کے چند ٹکڑوں اور پھٹی پرانی دریوں پر کام شروع ہو گیا۔ کہانی کا طریقہ اور منصوبی طریقہ ان دونوں کو بیک وقت جاری کر دیا گیا۔ پہلی جماعت میں کہانی کا طریقہ اور چوتھی جماعت میں منصوبی طریقہ پر کام ہونے لگا۔ سرپرستوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی کہ حرفوں کا نام جانے بغیر بچے لفظوں کے ذریعے حرف پہچانتے ہیں۔

نئے طریقہ سے پڑھانے والوں کی تعداد کو بڑھانے کے لئے احمد علی صاحب کو موگا بھیج دیا گیا۔

مدرسہ سے متصل ایک بیگھہ زمین خرید لی گئی تھی۔ باغبانی کا کام مدرسہ

کے دلچسپ مشغلوں میں سے ایک ہے، پھر اس کام کو لکھنے پڑھنے کا ذریعہ بھی بنا سکیں تو اس کی افادیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ چوتھی جماعت میں یہ باغبانی پروجیکٹ شروع ہوا۔ تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں۔ جیسے جیسے پودے ہرے بھرے ہونے لگے لڑکوں کی پڑھائی لکھائی بھی نمایاں ہونے لگی کیوں کہ ان دونوں میں تال میل تھا۔

بونے کے بعد فرصت ملی تھی (۱) ہمارے باغیچہ کی ابتدائی حالت (۲) زمین کی تقسیم (۳) زمین کی تیاری (۴) کھاد کی قسمیں (۵) بیج بونا (۶) پودوں کا اگنا بڑھنا۔ (۷) سبزیوں کا فروخت کرنا، ان پر مضامین لکھوائے گئے۔
باغبانی کے اوزاروں کا چارٹ بنایا گیا جس میں اوزاروں کی کیفیت درج تھی۔ کس کام آتا ہے۔؟ کس قیمت کا ہے۔ کہاں ملتا ہے وغیرہ۔ سبزی کے تصویر والے اشتہارات تیار کئے گئے۔ جب میں نے پچھلے کام کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ اور بہت سے کام ایسے ہیں جو کرنے میں نہیں آئے مثلاً موسموں کے لحاظ سے سبزیوں کے چارٹ، پھولوں کے چارٹ، اجناس کے چارٹ، اوزاروں کی تصویریں وغیرہ، سبزیوں کی تصویریں تو لڑکے ساتھ ہی ساتھ بناتے گئے۔

مضامین لکھے تقریباً سب ہی لڑکوں نے لیکن جن لڑکوں کے مضامین سب سے اچھے تھے وہ باغبانی پروجیکٹ میں چھاپ دیئے گئے۔

حساب کے کام کا ذکر کرنے کی گنجائش کہاں ہے بس یوں سمجھئے کہ ماسٹر برکت علی صاحب نے ان ہی کاموں کو دیکھ کر بچّوں کا حساب ”۴“ میں سبزیوں سے متعلق روپیوں پیسوں کی جمع تفریق، ضرب تقسیم کے بہت سے سوالات بنا ڈالے۔

سبزیوں کا بونا اور ان کا بیچنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن جب مدرسہ میں پہلے پہل یہ کام ہوا ہو اور وہ بھی لڑکوں کے ہاتھوں اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ استادوں نے بھی سبزی خریدنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ پہلی دفعہ کوئی تیس روپے جمع ہوئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ان روپیوں سے کوئی یادگار قائم کی جائے۔ باغبانی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے نئی کتابیں نہیں تھیں طے ہوا کہ کتابیں منگوالی جائیں۔

ان کتابوں کا آنا تھا کہ بچوں کا کتب خانہ قائم کر دیا گیا۔

ایک اور چیز کا قیام عمل میں آیا۔ باغبانی میں لڑکے جو کچھ کام کرتے تھے اس کی اجرت مقرر کر دی گئی تھی۔ کام ختم ہونے کے بعد ہر لڑکے کو ایک پرچی دے دی جاتی تھی۔ طے یہ تھا کہ جمعرات کے دن سب لڑکے اپنی اپنی پرچیوں کے دام دفتر مدرسہ سے لے لیں۔ پہلی جمعرات کو تو سب کے دام دے دیئے گئے۔ دوسری جمعرات کو اعلان ہوا جو لڑکے نقدی لینا نہ چاہیں ان کے دام محفوظ رہیں گے اس طرح کہ ایک کاپی میں ان کی رقم لکھ کر انھیں بتا دیا جائے گا کہ اب تک اتنی رقم جمع ہے اور پرچیوں کی میزان ایک چھوٹی سی کاپی "پاس بک" میں لکھ دی جائے گی۔ پھر پرچیوں کے عوض یہ کاپی دے دی جائے گی۔ کچھ لڑکوں نے تو اپنی نقدی لے لی اور بعض اپنی رقم جمع رکھنے کے لئے تیار ہو گئے۔ دام جمع کرنے والوں کو ڈاکخانے کے نمونہ کی ایک چھوٹی سی "پاس بک" دے دی گئی۔ جس میں پیسے جمع کرنے اور نکالنے کا حساب درج ہو جایا کرتا تھا۔ اس پاس بک میں صرف پانچ قاعدے درج تھے۔ جوں جوں ہفتے گزرتے گئے جمع کرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی بعض دفعہ سادہ پرچی (رسید) کے ذریعہ لڑکے اپنی رقم نکال بھی لیتے تھے۔ یہ رقم ان کے حساب سے گھٹا دی جاتی تھی۔ یہ کاروبار

ایک چھوٹے سے کمرے میں ہونے لگا۔ جہاں ٹاٹ کے دو تین ٹکڑے بچھے ہوئے تھے۔ ایک ڈسک پر کاپی دوات قلم رکھا رہتا تھا۔ لڑکے مقررہ وقت میں پیسوں کا لین دین استاد کی نگرانی میں کرتے تھے۔ جب لڑکوں کو یقین ہو گیا کہ اس کاروبار میں ان کے پیسوں میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی ہے اور نہ داموں کے بروقت ملنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو وہ جیب خرچ کے بچے ہوئے دام اور والدین کے عطیے بھی جمع کرنے لگے۔ یہ تھی بچوں کے بنک کی ابتدا۔

اس سے اسٹیشنری کا سامان منگایا جانے لگا اس طرح بچوں کی دکان کی ابتدا بھی ہو گئی۔

مئی کے پہلے ہفتہ میں بنک کا سالانہ جلسہ ہوا جس کے صدر حافظ فیاض احمد صاحب تھے۔ منافع تقسیم ہوا۔ منافع ہی کیا تھا۔ مگر ہر چیز کی ابتدا چھوٹے پیمانے پر تو ہو ہی رہی تھی۔ دو آنے تک نفع دیا گیا۔ حساب جو لگایا گیا تو یہ منافع پچیس فی صدی جا کر بیٹھا۔ اوسطاً کسی کے چھ آنے یا چار آنے سے زائد جمع نہ تھے۔

جب باغبانی کا کام شروع ہوا تو اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب حیدر آباد سے سرمایہ جمع کرنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ لوٹ کر آئے تو نومبر کا مہینہ تھا۔ مولی میتھی، پالک اور غالباً شلجم بھی کھانے کے لائق ہو گئے تھے ہم لوگ چاہتے تھے کہ باغ دکھانے سے پہلے سبزیوں کا تحفہ ایک جلسہ میں پیش کریں تاکہ انھیں تعجب اور خوشی ہو، بات کہاں چھپتی ہے۔ انہیں پہلے سے کسی نے ساری کارروائی بتا دی بہر حال ہم نے بھی جلسہ کیا۔ جامعہ کو حیدر آباد سے روپے ملنے کی وجہ سے ذاکر صاحب ویسے بھی بہت خوش تھے۔ بچوں کا یہ پہلا جلسہ جس میں ابتدائی کے لڑکوں اور استادوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ اپنی نرالی شان رکھتا تھا۔

ہر چیز کا انتظام چھوٹے پیمانے پر بچوں ہی نے کیا تھا۔ ہاں اس وقت تیار نہیں ہوا تھا۔ صحن میں دیوار کے سائے تلے جلسہ کا انتظام تھا۔ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ لڑکوں کی چھوٹی سی جماعت (یعنی پچاس کے قریب لڑکے) صاف ستھرے کپڑے پہنے سامنے بیٹھی تھی۔ چھوٹی سی فرشی میز... اس پر سفید میز پوش گل دستہ ٹائم پیس، ایک پنسل، چند کاغذ اس پر کاغذ دبانے کا شیشہ رکھا تھا۔ دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ یہ ٹولی چپ چاپ بیٹھی تھی اور ٹائم پیس ٹک ٹک چل رہی تھی۔ ذاکر صاحب نے کسی لڑکے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اب دیر کیا ہے"

"بس پانچ منٹ باقی ہیں" لڑکوں نے جواب دیا اس پر ذاکر صاحب نے چونکنے ہونے کے انداز میں تیوری چڑھائی اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

ٹھیک دس بجے تلاوت قرآن شریف کے ساتھ جلسہ شروع ہوا۔ ایک لڑکے نے باغیچہ کا حال مختصراً لکھ کر سنایا۔ پھر سبزیوں کا تحفہ پیش کیا گیا۔ کارروائی لمبی چوڑی نہ تھی۔ ذاکر صاحب بچوں سے مخاطب ہونے کے لئے اٹھے اور لڑکوں کی تعریف میں بہت کچھ کہہ دیا۔ استاد اور لڑکے جو کچھ کر رہے تھے انھیں خود اس کام میں لطف آرہا تھا۔ اس تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ہمارے کام کو دیکھے تو وہ بھی اس لطف میں حصہ دار ہو جائے ...... ہمارا پروگرام بھی ایسا تھا کہ ہر طرف کچھ نہ کچھ ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ ہمارے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے اور نئے نئے کاموں کی راہ ہمارے سامنے خود بخود کھلتی جا رہی تھی۔ جو مواقع بھی ہمیں ملتے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔

مارچ ۱۹۳۱ء میں حافظ فیاض احمد صاحب قومی آزادی کی تحریک کے سلسلے میں چار مہینے کی قید کاٹ کر جیل سے باہر آئے۔ پہلے سے علم ہو گیا تھا کہ فلاں گاڑی

سے آرہے تھے لوگ اسٹیشن پہنچے ہوئے تھے۔ جوں ہی حافظ صاحب گاڑی سے اترے ایک لڑکے نے دعوت نامہ دیا، گلیوں کو جھنڈیوں سے سجایا گیا، جلسہ میں نظمیں سنائی گئیں۔ سپاسنامہ کے ساتھ مولانا محمد علی کی ایک تصویر پیش کی گئی۔ مدرسہ ابتدائی کی یہ عمارت جس میں جلسہ ہو رہا تھا۔ حافظ صاحب کی کوشش ہی سے تیار ہو رہی تھی۔ لڑکوں نے آپ سے درخواست کی کہ مجوزہ ہال جلدی سے تیار کرا دیجئے تاکہ جماعت کے سامنے سائے کا رخ دیکھ کر جلسہ نہ کرنا پڑے۔ حافظ صاحب نے جامعہ میں بڑے بڑے جلسے دیکھے تھے بالکل چھوٹے بچوں کو ایک تیدی کا اس طرح استقبال کرتے ہوئے دیکھ کر ان کے دل پر بڑا اثر ہوا اور سال بھر کے اندر انھوں نے ایک شان دار ہال بنوا دیا جیسا کسی خاصے بڑے مدرسہ کا ہوتا ہے اس وقت سے جامعہ کے سب جلسے اسی میں ہونے لگے۔

اس سال "آل ایشیائی تعلیمی کانفرنس" اور "آل انڈیا مسلم کانفرنس" کے جلسے بنارس میں ہو رہے تھے جامعہ سے پہلی دفعہ "تعلیمی نمائش" کے لئے سامان بھیجا گیا۔ کہانی کے طریقے سے پڑھانے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب ماسٹر عبدالحئی صاحب کے شاگردوں سے تیار کرا کر "تعلیمی صندوق" کے نام سے اس نمائش میں بھیجا گیا۔ نمائش کے منتظمین نے جامعہ کے نام پر کئی "سرٹیفکٹ" دیئے۔ استاد اور طلبہ کی ایک جماعت ان کانفرنسوں میں شریک ہونے کے لئے بنارس گئی تھی۔ اسی موقع پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو رہی تھی اس میں بھی شرکت کا موقع ملا۔

عیدالفطر پر بچوں نے ڈراما بچوں کا انصاف اسٹیج کیا۔ اس کی تیاری پر کافی رقم خرچ ہوئی تھی۔ ڈراموں کا کام اس حد تک ترقی کر چکا تھا کہ لوگوں کو ٹکٹ خرید کر تماشا دیکھنے میں کوئی عذر نہیں ہوتا تھا۔ حسن خواجہ ...، علی خواجہ، حسن خواجہ، کانوکر

بالترتیب انبی احمد۔ محمد ہارون، میر اصغر علی اور عبداللطیف بنے تھے، جن لڑکوں نے ان کے مجلس میں مقدمہ کا فیصلہ کیا تھا وہ مسعود حسن خاں، محمد نور خاں، آفتاب احمد، ابوالکلام تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی لڑکے تھے، یوں تو سب کام اچھا رہا لیکن عبداللطیف جو ملازم کا کام کر رہے تھے چوکنے رہ کر اپنا کام ہر وقت اس انداز سے کرتے تھے کہ لوگ ان کے جواب کے منتظر رہتے تھے کہ دیکھئے اب یہ کیا کہتے ہیں۔ انھیں اور محمد ہارون کو انعام ملا۔ ایک منظر کا سامان ہٹانے اور دوسرے کو بجانے میں جو وقفہ نکل آتا اس وقت باری باری سے نظم خوانی رکھی گئی تھی۔ احمد بن سالم (چہارم) نے اس قطعہ کو اتنی اچھی لَے سے گایا تھا کہ لوگوں نے دو دفعہ تالیاں بجائیں۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے انعام کا اعلان کیا۔ انعام کیوں نہ ملتا، احمد کی آواز اچھی تھی ہی اس پر انھیں نئی نئی طرزیں معلوم کرنے کا شوق تھا۔ آواز کو جس طرح چاہیں اونچی نیچی کر لیتے تھے۔ قطعہ یہ ہے۔

یادِ باراں کی سہ لوں گا میں ساری سختیاں
ہاں مشقت کو کبھی خاطر میں نہ لاؤں گا!
گرمی ان کوششوں اور محنتوں کے فیض سے
ایک چھوٹا سا چمن پھولے پھلے پروان چڑھے

ڈاکٹر انصاری صاحب اس ڈرامے کو دیکھنے کے لئے خاص طور پر تشریف لائے تھے۔ محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے مشوروں سے انتظام میں خوبی پیدا ہو گئی تھی۔ قرول باغ والوں کو دکھانے کے لئے یہ ڈراما دوسرے دن بھی کیا گیا۔ یہ ڈراما میں نے لکھا اور مکتبہ جامعہ نے ”بچوں کا انصاف“ کے نام سے شائع کیا۔

سال ختم ہونے سے پہلے نئے سال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مجلس تعلیمی نے

جامعہ کے پورے نصاب پر نظر ثانی کرکے چھپنے کے لئے دے دیا۔ ایک سال کے نئے تجربے کے بعد مجھے اب موقع تھا کہ آئندہ سال کے لئے تجاویز پیش کروں۔ میں ان کی تیاری میں لگ گیا۔ تجاویز مرتب ہونے سے پہلے ہی ذاکر صاحب فرمانے لگے۔

" دیکھئے نا۔ کام کرنے والے لڑکوں کو پھٹی پرانی دریوں پر بیٹھتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے ان کے لئے نئی دریاں خرید لیجئے۔ ڈسک بھی کمروں کا حساب کرکے بنوا لیجئے۔" ڈاکٹر صاحب کی نیت یہ تھی کہ ان چیزوں کو بھی نئے پروگرام میں شامل کرلوں میں نے حسب عادت ایک ایک چیز کی تفصیل لکھ کر دے دی۔ حتیٰ کہ مدنیا "ٹائم ٹیبل" بھی منسلک کر دیا۔ استادوں کے جلسہ میں "منصوبی طریقہ" پر ایک مضمون بھی سُنایا۔

نئے طریقوں سے پڑھانے والوں کی تعداد بڑھانے کے لئے احمد علی صاحب کو موگا بھیج دیا گیا۔

اب ثانوی اور کالج کا حال سنئے۔ شانتی نکیتن کے مدرسہ میں پڑھنے پڑھانے کا طریقہ معلوم کرنے کے لئے سعید انصاری صاحب وہاں ...... گئے تھے۔ واپسی پر آپ نے "بزم ادب" کی طرف خاص توجہ دی۔ حافظ صاحب سے بزم کے عجائب خانہ کا اور حامد صاحب سے کتب خانہ کا افتتاح کروایا۔ بیت بازی کی نئی "طرح" ڈالی یعنی اس مقابلے کے لئے یہ شرط رکھی کہ ایک وقت میں ایک ہی شاعر کے اشعار سنائے جائیں اس کے لئے وہ پرانی قید ہٹانی پڑی کہ جو فریق مقررہ حرف سے شروع ہونے والا شعر نہ سنا سکے وہ ہار جائے گا بلکہ کامیابی کا معیار اچھے اشعار پر رکھا گیا۔ ظاہر ہے فیصلہ کا یہ معیار لڑکوں کے لئے مفید ہے اس کھیل کا مقصد اچھے اشعار کا یاد کرنا ہے۔ سعید صاحب کی اقامت گاہ والوں نے بیت بازی کے دو جلسے کئے۔ ایک میں حالیؔ اور دوسرے میں اقبالؔ کے اشعار زیادہ رکھے گئے تھے۔

ڈراما "بچوں کا انصاف" کا ایک منظر

انجمن اتحاد نے مولانا شوکت علی، مسز سروجنی نائیڈو، پروفیسر گرمانس، پروفیسر ٹھاکر (شانتی نکیتن) اور مولانا آزاد سبحانی سے تقریریں کروائیں۔

ایک جلسہ میں مولانا شرف الدین صاحب مومن اور حفیظ جالندھری نے اپنی نظمیں سنائیں۔

اس دفعہ سالانا کھیل کود کے انعامات شمس العلماء عبدالرحمٰن صاحب نے تقسیم کئے۔ آخر میں آپ نے فرمایا۔

"شیخ الجامعہ صاحب کو ایک انعام حاصل کر کے اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی مجھے بہت سارے انعامات تقسیم کر کے۔ جامعہ میں اتنے انعامات تقسیم ہوئے ہیں کہ شاید ہی کسی دوسری درسگاہ میں دئے جاتے ہوں۔"

شیخ الجامعہ صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

"ہمارے ہاں کھیل کود اور پڑھائی دونوں کو برابر کی اہمیت دی جاتی ہے کاش ہم اس سے زیادہ انعامات دے سکتے۔"

حافظ صاحب جیل کے کھانوں کی کسر نکالنے کے لئے ادھر ادھر دعوتیں کھا رہے تھے کہ دو دن کے اندر شفیق صاحب بھی آملے۔ کہتے تھے "اسپرٹ کا چولھا جلانے اور حلوہ پکانے کا موقع بہت دنوں سے نہیں ملا ہے" لوگوں نے دعوتوں میں حلوے کا جز بھی شامل کرلیا۔ اتنے میں پیام تعلیم کے مدیر حسین حسان صاحب، دیوداس گاندھی جی، کالج کے دو اور طالب علم "دوکرشن نائر" اور "ڈیکا" بھی رہا ہو کر آگئے۔ شفیق صاحب کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو جیل کی زندگی میں اپنے آپ کو بہت باقاعدہ بنا سکتا ہے۔

اس سال اہل جامعہ کو مولانا محمد علی کی وفات کا شدید صدمہ اٹھانا پڑا۔ مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن تشریف لے گئے تھے۔

بہت بیار تھے لیکن ملک کی آزادی کی فکر انھیں کھینچ کر اس دور دراز سفر پر لے گئی۔
آپ نے لندن میں ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا "میں آزادی لئے بغیر زندہ،
ہندوستان واپس نہیں جاؤں گا" ابھی ملک کی آزادی کے دن دور تھے مگر خود مولانا
عالم غربت میں دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئے۔ مولانا کے انتقال
کی خبر جب جامعہ میں پہنچی ان دنوں سردیوں کی چھٹیاں تھیں پھر بھی جو لڑکے یہاں
رہ گئے تھے انھیں ایک جلسہ میں خواجہ عبدالحیٔ صاحب نے اس المناک واقعہ کی
تفصیل بتائی۔ مدرسہ کھلنے پر ۱۲ جنوری کو جامعہ کے بڑے کتب خانہ میں طلبار
اور اساتذہ کا جلسہ ہوا جس میں چھوٹے اور بڑے سب لڑکوں نے مولانا کی سیرت
پر مضامین پڑھے اور انھیں خراج عقیدت ادا کیا۔

حکیم صاحب کے بعد جامعہ کا دوسرا سرپرست اٹھ گیا وہی سرپرست جس نے
مایوسی میں ہمت بندھائی۔ بے حسی میں جوش دلایا، جامعہ کے کارکنوں کی ہمت افزائی
استادوں سے علمی بحث کرنا، بچوں سے پیار و محبت کی باتیں، مولانا کا محبوب شغل تھا
اور انھیں اس سے مسرت حاصل ہوتی تھی۔ مولانا کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق
تھا۔ فرمایا کرتے تھے اگر مجھے موقع ملا تو جامعہ کی اردو اکادمی کو چلاؤں گا۔ آپ نے
وصیت کی تھی کہ میرا پورا کتب خانہ جامعہ کو دے دیا جائے چنانچہ آپ کے انتقال
پر بیگم صاحبہ نے ایک ایک کتاب جامعہ کے حوالہ کر دی۔ جب آپ بیت المقدس کا
مدرسہ دیکھنے گئے تو وہاں کے بچے قرآن شریف کی جلدیں بہترین نمونے کی بنا رہے
تھے۔ مولانا نے ایک نمونہ جامعہ کے بچوں کے لئے بھی بھجوایا۔ جب تک جامعہ علی گڈھ
میں تھی لڑکوں نے بھوس کے ایک بڑے کمرے کا نام "محمد علی ہال" رکھا۔ دہلی آنے
کے بعد ایک عارضی عمارت اس نام سے بنائی گئی چھوٹے لڑکوں نے اپنی اقامت گاہ
کا نام مولانا کے تخلص "جوہر" کی نسبت سے "جوہر منزل" رکھا ہے۔ مدرسہ ابتدائی

والوں نے مولانا کی ایک اور یادگار قائم کی ہے۔ وہ ہے "محمد علی ٹرافی" یہ اس مدرسہ کو دی جاتی ہے جو تحریر و تقریر اور جسمانی کھیلوں میں اول آئے۔

مولانا کا انتقال ہوئے ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ پنڈت موتی لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی۔ جامعہ کے مدرسوں اور دفتروں کو فوراً بند کرکے تعزیتی جلسہ کیا گیا۔ پنڈت جی کے بیٹے جواہر لال کو تعزیت کا تار بھیجنے کی تجویز منظور ہوئی۔ استادوں نے بچوں کو بتایا کہ ملک کی آزادی کے لئے باپ اور بیٹے کس طرح جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ پنڈت موتی لال خوش نصیب ہیں کہ اپنا کام اپنے بیٹے جواہر لال کو سونپ کر گئے ہیں۔

اسی سال پنڈت جواہر لال نہرو جامعہ میں تشریف لائے انجمن اتحاد والوں نے آپ کو اپنی انجمن کا مستقل اعزازی رکن بنایا۔ پنڈت جی نے اس پر فخر و مسرت کا اظہار کیا۔ مدرسہ ابتدائی کے بچے بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔

مکتبہ کے مہتمم حامد علی خاں مرحوم کو لڑکوں کی دلچسپیوں سے لگاؤ رہتا تھا۔ چند باہمت لڑکوں نے آپ کی نگرانی میں سائیکلوں پر کشمیر کا سفر کیا۔ یہ ٹولی محمد طیبؒ، مسعود اختر، ڈاکٹر عالم کے صاحبزادے محمد اقبال پر مشتمل تھی۔ محمد طیب سائیکل چلانا معمولی جانتے تھے لیکن یہ خیال تھا کہ جموں پہنچنے تک جو میدانی علاقہ ہے اس میں اس کی مشق ہو جائے گی ایسا ہی گرتے پڑتے یہ سیکھ ہی گئے۔ سیالکوٹ پہونچ کر ان لوگوں کو جموں کی روشنیاں نظر آنے لگیں، بے ساختہ ایک کی زبان سے نکلا "لو مبارک نظر آنے لگے منزل کے نشاں" جموں سے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے دو دن میں یہ رام بن پہنچے۔ یہاں کے گھنے جنگلوں نے ان کی کوفت دور کر دی۔ دوپہر میں درختوں کے سائے تلے کھانا پکایا، آرام کیا۔ شام کے وقت پھر چلنے لگے، سنسان راستہ چاروں طرف پہاڑ، چشموں کے بہنے کی سنسناہٹ۔ طیب صاحب کہتے تھے کہ میں اب آگے آگے رہنے لگا۔ سری نگر پہنچ کر جامعہ کے ایک طالب علم عبدالملک صاحب کے ہاں ٹھہرے، شالامار دیکھا، نشاط باغ دیکھا، گل مرگ پہنچے، کوئی

آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر وہاں سے بھی اونچے کھلن مرگ پہنچے جہاں برف کے تودے اور طرح طرح کے پھول دیکھے۔ واپسی میں راولپنڈی تک کی پہاڑیوں کی سیر کی، کشمیر کی آب و ہوا نے تازہ دم کر دیا تھا، واپسی میں ویسے بھی ڈھلان ہوتا ہے پھر بھی تعجب ہے کہ ایک دن میں اٹھانوے میل کا سفر کیا۔ اگر اس کے آگے دو میل کے فاصلہ پر کوئی گاؤں ہوتا تو سنچری پورا کرنے کی خوشی میں یہ اور دو میل طے کر لیتے۔ حامد صاحب نے کہا "بھائی حسرت کیوں رہے، پلنگ کے ارد گرد ہی گھوم لو سو میل پورے ہو جائیں گے" جب خبر ملی کہ دہلی پہونچنے والے ہیں تو روشن آرا باغ میں ان لوگوں کا استقبال کیا گیا، تصویریں لی گئیں، نظمیں پڑھی گئیں۔

ان کی دیکھا دیکھی جامعہ کے بعض استادوں (شفیق صاحب، سعد صاحب، سعید صاحب، ارشاد صاحب) کو بھی کشمیر کی سیر کا شوق ہوا۔ سعد صاحب کی تجویز ہوئی کہ جموں تک ریل پر چلیں، وہاں سے پیدل، کچھ دور پیدل چل کر ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ پیدل سفر کسی اور زمانے کے لئے اٹھا رکھیں۔ اس وقت لاریوں میں چلیں۔ سعد صاحب نے بہت کہا مگر باقی لوگ نہیں مانے۔ واپسی پر شفیق صاحب تو یہی کہتے تھے کہ ہم نے سارا سفر پیدل طے کیا ہے مگر سعد صاحب نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ "بالکل جھوٹ بات ہے"

سیشن کے آغاز میں ڈاکٹر ذاکر صاحب ریاست حیدرآباد سے مستقل امداد کی کوشش کے لئے حیدرآباد گئے ہوئے تھے کامیاب لوٹے یعنی ۷ ارنومبر ۱۹۳۰ء سے اس فیاض ریاست نے ایک ہزار روپئے ماہوار کی مستقل امداد جاری کر دی۔ نیز عمارت کے لئے پچاس ہزار روپئے یکمشت دئے

بارھواں سال

اگست ۱۹۳۱ء سے جولائی ۱۹۳۲ء

ابتدائی چہارم کے لڑکے جب سالانہ امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ان کے لئے پانچویں جماعت اس مدرسہ میں رکھی گئی۔

جامعہ کے کاموں کا اب تک یہ رنگ تھا کہ عام دلچسپیاں تو موجود تھیں لیکن جماعت کے کام کا ان سے تعلق نہ تھا۔ اس لئے لڑکوں کی توجہ جماعت کے کام کی طرف کم ہوتی تھی اور وہ بیرونی دلچسپیوں میں زیادہ حصہ لیتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عام دلچسپیوں کو جماعت کے کام کا جزو بنا دیا گیا اور اس سے لکھنے پڑھنے میں مدد لی جانے لگی اس میں لڑکوں کے لئے تو آسانی تھی مگر استادوں کو یہ سوچنا پڑتا تھا کہ لکھنے پڑھنے کے کام میں ربط کس طرح پیدا کیا جائے۔ اب ہمارے لئے تین طرح کے مشغلے تھے ایک تو (۱) جماعتی پروجیکٹ یعنی وہ کام جو کسی ایک جماعت کے طلبا مل کر کریں۔ مثلاً صابن پروجکٹ، ڈاک خانہ پروجکٹ، باغبانی پروجیکٹ وغیرہ دوسرے وہ کام جنھیں تمام جماعتوں کے لوگ مل کر کریں مثلاً آنحضرتؐ کی پیدائش پر "میلاد النبیؐ پروجیکٹ" "جامعہ کی سالگرہ پر" جامعہ پروجیکٹ" "قومی ہفتہ پروجیکٹ" وغیرہ اس قسم کے کام کو امتیاز پیدا کرنے کے لئے "مشترکہ پروجیکٹ" کہہ سکتے ہیں۔ تیسرے وہ

کام جنھیں ہم مستقل شعبوں کے طور پر چلا رہے ہیں مثلاً " بنک پروجیکٹ " " دکان پروجیکٹ " وغیرہ اس تیسری قسم کے کام کو شعبہ جاتی پروجیکٹ[1] کہہ لیجئے۔ جماعتی پروجکٹ کا کام احمد علی صاحب کے سپرد کرکے میں " مشترکہ پروجیکٹ " کی تیاری میں لگ گیا، اور اس کے لئے " میلاد النبی پروجیکٹ " شروع کیا۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ پروجیکٹ کو اس کے لوازمات کے ساتھ چلایا گیا یعنی ہر ایک مضمون میں بچوں نے کام کیا، ذیل کے خاکے سے اس کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ یہ صرف نمونے کے طور پر چند عنوانات ہیں۔

اسلامیات۔

آنحضرتؐ کے ارشادات (خطبات)
چند حدیثیں۔ تلاوت قرآن پاک۔

اُردو۔

سیرت پر مضامین مثلاً
آنحضرتؐ کی بچوں پر مہربانیاں۔ سیرت پر کتابیں۔
محنت کرنے والے آنحضرتؐ کی نظر میں۔ جلسہ کی رپورٹ وغیرہ۔
نظم کا حصہ

معلومات عامہ۔

عرب کے جغرافیائی حالات
عربوں کے رہنے سہنے کا طریقہ۔

---

[1] "جماعتی" "مشترکہ" "شعبہ جاتی" (پروجیکٹ) یہ تینوں پروجیکٹ کی باقاعدہ قسمیں نہیں ہیں بلکہ سہولت کے لئے ایسے نام رکھ لئے ہیں ورنہ یہ اپنے اصلی نام سے پکارے جائیں گے مثلاً مصابن پروجیکٹ " "میلاد النبی پروجیکٹ" " بنک پروجیکٹ" وغیرہ۔

خشکی اور سمندر کے راستے۔ نقشہ جات وغیرہ۔

ڈرائنگ:۔

عرب کے قدرتی مناظر
رنگین دعوت نامے

حساب:۔

حج کے اخراجات
تاریخ پیدائش کے سوالات
جلسے کے اخراجات

نتیجے کے طور پر ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں بچوں کے لکھے ہوئے مضامین، ڈرائنگ
نقشہ جات نمائش میں رکھے گئے، اور منتخب مضامین جلسہ میں سنائے گئے۔

باغبانی کا کام معمول کے طور پر ہوتا رہا۔ معلومات عامہ کے سلسلے میں "سبزیات"
کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب تیار کرائی گئی۔

یہ لڑکے اس بات سے بہت خوش تھے کہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
انھیں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ خوش تھے کہ چھوٹے بچوں کے ساتھ
کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ کام ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اپنے لئے پسند کیا تھا۔ جب
یہ بات سرپرستوں کو معلوم ہوئی تو وہ بھی اس پر فخر کرنے لگے کہ ان کے لڑکوں کو
شیخ الجامعہ صاحب پڑھاتے ہیں۔

اس سال کی ایک اور خاص چیز تعلیمی کھیل کا جلسہ ہے جس طرح میدان میں
ورزشی کھیل کو دہوتے ہیں اسی طرح ہال کے ایک حصہ میں یہ کھیل دکھائے گئے۔ پہلی
جماعت والوں سے (۱) دیوار میں لگے ہوئے فریم میں گتّوں کے ذریعہ کہانی جوڑنے کا
مقابلہ (۲) لفظوں کے ڈھیر سے مقررہ لفظ نکال لانا اور دوسری جماعت والوں سے

"ریلے ریس" کی طرح ہند سے لکھنے کی دوڑ، غرض کہ ہر ایک جماعت سے طرح طرح کے کھیل کروائے گئے اور آخر میں اوّل دوم اور سوم آنے والوں کو انعامات دیئے گئے۔ اس میں بعض ہنسنے ہنسانے کے کھیل بھی تھے۔ گتوں پر مختلف ہدایتیں لکھ دی تھیں۔ مثلاً "ایک پیر پر کھڑے رہو" "زور زور سے روؤ" "خوب ہنسو" "فلاں کے کان پکڑ کر قلابازی کھاؤ" "لکھنوی سلام کرو" وغیرہ۔ یہ گتے کے ٹکڑے تاش کی طرح الٹے کر کے رکھ دیئے گئے تھے، پہلی جماعت والوں سے کہا گیا تھا کہ کوئی ایک گتا اٹھا لو اور اسی کے مطابق عمل کرو۔ اسد الرحمٰن نے جب لکھنوی سلام کیا تو خوب تالیاں بجیں پہلی اور دوسری جماعت کے کھیل، "کھیل کے ذریعے تعلیم" کے نام سے چھپوا دیئے گئے۔

چند ماہ بعد بچوں کے بنک کا دوسرا سالانہ جلسہ ہوا۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ایک ڈراما "شریر لڑکا"، لکھ دیا تھا یہ کھیلا گیا، اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر لڑکوں کو ٹھیک باتیں بتلانے والا نہ ملے تو وہ اپنی شرارت سے ادھم مچاتے پھرتے ہیں لیکن اگر ان کی طبیعت کے موافق کام بتایا جائے یا خود بخود مل آئے تو وہ اپنی طاقت کو بڑی خوشی سے اچھے کاموں میں لگا دیتے ہیں۔ تمام واقعات اقامت گاہ اور مدرسہ سے متعلق ہیں اس لئے اس ڈرامہ کے کرنے سے طرح طرح کی طبیعت اور کردار کے لڑکے سامنے آتے ہیں۔ ڈرامے میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہیں جن پر تماشائی جگہ جگہ بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔ سامان تیار کرنے کی ضرورت یوں نہ ہوئی کہ اقامت گاہ، مدرسہ اور کھیل کا میدان دکھانے کے لئے سچ مچ کی سب چیزیں موجود تھیں۔ لڑکوں کو زیادہ سکھانے کی ضرورت یوں نہ پیش آئی کہ عابد صاحب نے جن جن لڑکوں کو سامنے رکھ کر لکھا تھا ان ہی کو چن لیا گیا اس لئے دراصل یہ سوال ہی پیدا نہ ہوا کہ کس لڑکے کا کام سب سے اچھا اور انعام کے قابل ہے۔ پھر بھی جناب

احمد حسین صاحب نے محمد نور خاں کو ایک سونے کا تمغہ دے ہی دیا۔ ڈاکٹر صاحب انہام تفہیم سے کام لیتے ہیں، یہ بات اس ڈرامے میں نمایاں تھی۔

اوپر کی جماعتوں یعنی چہارم اور پنجم کے سالانہ امتحان کے لئے تجویز ہوا کہ اپنے سال بھر کے کام کی ایک کتاب تیار کریں۔ کام ترتیب دینے کے لئے سلسلے وار سوالات دیئے گئے تھے۔ مثلاً کون سی کتابیں پڑھی ہیں، کتنے مضمون لکھے ہیں، تمہارا کون سا مضمون اچھا ہے اور کیوں۔ کون کون سی نقلیں سیکھی ہیں۔ کتب خانے کے کن رسالوں کو پسند کرتے ہو اور کیوں۔ تم اپنے مدرسہ میں کس قسم کی کمی دیکھتے ہو۔ تم نے اپنی جماعت یا مدرسہ کو خوبصورت بنانے میں کیا مدد کی ہے، جلسوں کا رنگ کیا رہا۔ تمہاری سب سے اچھی ڈرائنگ کون سی تھی۔ غرض کہ اسلامیات، حساب، باغبانی، ڈرائنگ، اردو، شعبہ جات، جلسے، مدرسہ کے انتظام وغیرہ کے متعلق بہت سے سوالات دیئے گئے تھے۔ جس سے ہر ایک۔۔۔ کام کی جانچ پڑتال ہو جائے۔ لڑکوں نے اس کتاب کے لئے اچھا سا سرورق بھی بنایا۔

جس مدرسہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہو وہاں یہ کیسے ممکن تھا کہ پرانا نصاب تعلیم نہ بدلا جاتا۔ نئے نصاب کی تیاری کا کام سال کے شروع میں مختلف لوگوں کو دے دیا گیا تھا۔ ان لوگوں نے چھ مہینے تک تلاش اور جستجو سے کام لے کر اپنے خاکے تیار کئے۔ پھر کئی مہینوں تک ان خاکوں پر استادوں کے جلسوں میں گفتگو ہوتی رہی بالآخر مجلس تعلیمی نے اس نصاب کی منظوری دے دی اور اس وقت کے مہتمم جامعہ حافظ فیاض احمد صاحب نے بڑی محنت سے اُسے چھپوا دیا۔ بڑے سائز کے سوا سو صفحوں کا یہ نصاب صرف ابتدائی چھ جماعتوں کا ہے۔ اس میں پڑھائی جانے والی چیزوں کی تفصیلات اور استادوں کے لئے اشارے درج ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ جس عمر میں جو چیزیں بچوں کو پڑھائی جائیں وہی اس میں لکھی جائیں۔ اس بات کا

خاص طور پر لحاظ رکھا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ہر ایک لڑکے میں جو جو صلاحیتیں رکھی ہیں وہ رفتہ رفتہ اسی طرح بڑھیں جس طرح ایک ہرا بھرا پودا بڑھتا رہتا ہے۔ اگر استاد اس نصاب کو غور سے پڑھ کر لڑکوں سے کام لیں تو انھیں بھی اپنے کام میں لطف آئے گا کیونکہ اس میں کام کرنے اور کام لینے کا ڈھنگ ہی اس طرح کا لکھا ہے۔ اردو، انگریزی، ڈرائنگ کا نصاب ذاکر صاحب نے، حساب اور معلومات کا، برکت علی صاحب نے، اسلامیات کا، سعد انصاری صاحب نے مدرسہ ابتدائی کے استادوں کی مدد سے تیار کیا۔

اس نصاب کے شروع میں لکھا ہے۔

جامعہ کے کارکنوں کا ابتدائی تعلیم کے متعلق یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ اس کا مقصد محض بچّہ کی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی کو سنوارنا ہے اس کا مقصد ہے کہ بچہ کی خداداد قوتوں میں نشو و نما کا سامان پیدا کرے اور اس میں متمدن زندگی کے فرائض اور مقاصد سے لگاؤ پیدا کرے جہاں تک کہ ۶ سال سے ۱۲ سال تک کی عمر میں اس کا امکان ہے۔ اسے اپنی قوتوں پر، محرکات عمل پر، جذبات پر رفتہ رفتہ قابو حاصل ہونے لگے کہ اخلاق اور ذہنی ضبط کی بنیاد اس سے پڑتی ہے۔ اس میں اپنے فرض کا احساس ہو چلے اور اس کو پورا کرنے کا ولولہ، اس کا تخیل اور اس کی ہمدردیاں اس طرح وسعت پذیر ہوں کہ وہ اپنے فطری اور معاشرتی ماحول میں اجنبی نہ رہے بلکہ اسے سمجھے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ جامعہ کی آرزو ہے کہ جن لڑکوں کی تعلیم اس کی نگرانی میں ہو وہ تندرست ہوں، ان کی چال ڈھال اچھی ہو، وہ لوگوں سے اچھی طرح صفائی اور وضاحت کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ اُن کی گفتار میں حسن اور وقار ہو۔ وہ صاف اور ستھرے رہتے ہوں۔ سچ بولتے ہوں۔ اپنے ماحول کے حسن و خوبی سے لطف اندوز ہو سکتے ہوں اور اسے حسین

اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہو کر یہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی کامل انسان ہوں؟

پچھلے سال کی طرح اس سال بھی استاد اور اتالیق صاحبان کے جلسے میں میں نے ایک مضمون پڑھا جس میں اس بات پر زور دیا تھا کہ مدرسہ اور اقامت گاہ میں ہم یہ سمجھ کر کام کریں کہ یہ مدرسہ ہمارا ہے اس کے چلانے والے ہم ہی لوگ ہیں اس کا نقصان ہمارا نقصان ہے۔ اس کا فائدہ ہماری زندگی کو قوت بخشنے والا ہے۔

بچوں کے کام کے نمونے جمع ہو گئے تھے تجویز ہوئی کہ ان چیزوں کو ایک مستقل کمرے میں سجا کر رکھ دیں جب نئی چیزیں تیار ہوں تو پرانی اٹھالی جائیں اور ان کی جگہ نئی رکھ دی جائیں۔ اس تجویز کے وقت دو چیزیں سامنے تھیں، ایک تو یہ کہ نئے آنے والے لڑکوں کو اس کام سے مدد ملے۔ دوسرے یہ کہ مہمانوں کے لئے یہاں کا کام سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔ تعلیمی صندوق، بچوں کے مضامین، لکھائی کے نمونے، کہانی یا نظم کو تصویروں کے ذریعہ ظاہر کرنے والے چارٹ، باغبانی پروجکٹ اور میلاد النبیؐ پروجکٹ کی روئداد، مختلف چارٹ اور نقشے بچوں کی بنائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کتابیں اور رسالے یہ سب چیزیں دیوار کے ساتھ ساتھ اونچی میزوں پر سلیقے سے رکھ دی گئی تھیں۔ ڈرائنگ کا پچھلا کام فائلوں میں اور نیا کام گتوں کے ذریعہ دیوار میں لگا دیا گیا تھا۔

مدرسہ ابتدائی کو نئے انتظامات کے ساتھ کام کرتے ہوئے دو ہی سال ہوئے تھے۔ باغیچہ پہلے ہی مستقل صورت اختیار کر چکا تھا۔ بنک اور دکان کا کاروبار چل نکلا۔ کتب خانے کی رونق بڑھی۔ جماعتوں کے سامنے نئے نئے کام رکھے جانے لگے تعلیمی کمرے کی نمائش میں اضافہ ہونے لگا۔ لڑکوں کی تعداد بڑھنے

سے اقامت گاہوں میں چہل پہل نظر آنے لگی۔مس کوپ لینڈ ڈگلاسکی نے بچوں کے چہروں سے شوق ٹپکتا دیکھا۔ڈاکٹر ایرش ٹیلے (برلن) نے یہاں کے کام میں اپنے لئے اجنبیت محسوس نہیں کی منشی پریم چند کو بچوں کی تحریریں میں ادبی جھلک نظر آنے لگی۔
قاضی عبدالغفار صاحب کو "زندگی کی افق پر اس چھوٹی سی شعاع سے آفتاب کی آمد کی خبر معلوم ہونے لگی۔"

خواجہ غلام السیدین نے فرمایا "یہ ایک نہایت قیمتی تجربہ ہے اور جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، صحیح اصولوں پر کیا جا رہا ہے۔"

ثانوی اور کالج والے ابتدائی کے کاموں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔یہاں بھی پڑھائی میں جستجو اور تلاش شروع ہو گئی تھی، جن کاموں میں چھوٹے بچوں کی مدد کرنی چاہیئے وہ اس کے لئے تیار رہتے تھے چنانچہ میلادالنبیؐ کے جلسے میں ثانوی دوم والوں نے سید انصاری صاحب کی نگرانی میں بڑے پیمانے پر ہندوستان اور عرب کے راستوں کا نقشہ پیش کیا تھا۔اس میں سمندر اور خشکی کا راستہ اور ہوائی جہازوں کا زیر غور راستہ بھی دکھلایا تھا۔مدرسہ شاخ نے بید کی کشتی میں روضۂ پاک کا نقشہ بنا کر پیش کیا۔

یوم تاسیس کا جلسہ ہوا۔دستور کے مطابق اس موقع پر شیخ الجامعہ صاحب سال بھر کی رپورٹ سنا کر کاموں پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ایک جگہ فرمانے لگے۔
"پچھلے کئی سال کے تجربے سے جامعہ نے یہ سیکھا ہے کہ سب سے ضروری چیز چھوٹے بچوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرنا ہے۔یہی وہ بنیاد ہے جس پر قومی تعلیم کی نئی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔اس خیال سے جامعہ سب سے پہلے ابتدائی تعلیم کے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

اس سلسلے میں بتاتے رہے کہ ابتدائی مدرسے کے بچوں میں کیا صفات ہونی

چاہیئں۔ آخر میں سنجیدہ تقریر کا لہجہ بدلا اور مسکرا کر فرمایا۔

" مدرسہ ابتدائی والے جن کے یہاں اس وقت ہم جمع ہیں ان تمام پرانی رسموں کو جو انھیں پسند نہیں ہیں نکال باہر کر رہے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ نہ صرف دیکھ کر بلکہ عمل کے ذریعہ چیزوں کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ اس لئے ایک صاحب آپ کے سامنے تشریف لا رہے ہیں "

شیخ الجامعہ صاحب کے بیٹھنے پر تالیاں بجنے لگیں، تالیوں کی گونج مدھم ہو کر پھر تیز ہونے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جناب رحیم الدین خاں صاحب ابتدائی نیم سر سے پیر تک کھدر کے سفید لباس میں چلے آ رہے تھے۔ اور تو اور موزے بھی سفید پہن رکھے تھے۔ مدرسہ کے تمام لڑکوں کی طرف سے ایک سال کا کام لوگوں کے سامنے رکھا۔ یہ رپورٹ جماعت کے لڑکوں نے مل کر تیار کی تھی۔

رپورٹ رحیم احمد کے اس جملے پر ختم ہوئی " جامعہ کی یہ سالگرہ آپ کو بھی مبارک ہو " عبدالحی نے شکریہ ادا کیا۔ جلسہ ذاکر صاحب کے اس اعلان پر ختم ہوا کہ عمارت کے لئے ریاست حیدرآباد نے جس رقم کا وعدہ فرمایا تھا وہ مل گئی ہے اس طرح سب لوگ خوش خوش اپنے گھروں کو لوٹے۔

اس روپے سے اسی سال شہر سے آٹھ میل دور جمنا کے کنارے جہاں سے آگرہ نہر نکالی گئی ہے، جامعہ کی عمارتوں کے لئے زمین خرید لی گئی۔ اس کے قریب ہی اوکھلا گاؤں ہے۔

اسی رات کو جامعہ میں دوسرا مشہور مشاعرہ ہوا جس میں ثاقب لکھنوی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی، سعید بریلوی، ساحر دہلوی، کے علاوہ مانی جائسی، عشرت رحمانی اور اکبر حیدری نے اپنا اپنا کلام سنایا۔

حفیظ جالندھری نے مولانا محمد علی کے غم میں تازہ مرثیہ لکھا تھا جس میں مولانا

کی خصوصیات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو گرجتی ہوئی آواز میں خاص انداز میں پڑھا تھا۔ بعد میں یہ طرز جامعہ میں عام ہوگئی۔

پہلے سے یہ طے ہوگیا تھا کہ ابتدائی والے عید پر اور ثانوی و کالج والے تاسیس پر ڈراما کھیلیں چنانچہ تاسیس کے دوسرے دن بڑے لڑکوں نے پروفیسر محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں ڈراما "کھیتی" اسٹیج کیا جو مجیب صاحب ہی کا لکھا ہوا تھا۔ بشیر صاحب نے لمبی لمبی تقریروں کو یاد کر کے "باتوفی مروری" کی جو نقل اتاری وہ آپ ہی کا حصّہ تھا۔ ان ہی دنوں دہلی میں کانگرس کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اس ڈرامے کے دکھانے کے لئے مجلس کے سب لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

انجمن اتحاد والوں نے ڈاکٹر ہاشم امیر علی، کرنل جیرڈ اور مولانا سبحانی سے تقریریں کروائیں۔ انجمن کی دعوت پر جگر مرادآبادی نے بھی اپنا کلام سُنایا۔

انجمن اتحاد کے اب تک کے نائب صدور کی فہرست بالترتیب اس طرح ہے۔

انجمن کے پہلے صدر سید نوراللہ صاحب تھے جو علی گڈھ کے زمانے سے چلے آرہے تھے ان کے بعد مولانا سعدالدین صاحب، شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی، ظہیرالدین صاحب، یوسف حسین خاں صاحب، عبدالحلیم احراری صاحب عبدالمجید صاحب زبیری، محمود حسین خاں صاحب، عبدالکریم صاحب پشاوری۔ انور خاں صاحب، محمد حسین صاحب حیدرآبادی اور رئیس احمد صاحب جعفری۔ نائب صدر ہوئے۔

اسی سال محمد حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں انجمن ملازمین قائم ہوئی اس کے پہلے ناظم محمد سلیم صاحب مقرر ہوئے۔ آگے چل کر اس انجمن نے ترقی کی، اس میں عام دلچسپی کے جلسے بھی ہونے لگے۔

اس سال اُردو اکادمی نے علمی مضامین پڑھوانے کا خاص انتظام کیا تھا پہلا لکچر، جنوری ۱۹۳۱ء کو خواجہ غلام السیدین صاحب کی صدارت میں ہوا

کھیتی ڈراما کا ایک منظر

پروفیسر رباح الدین صاحب نے اپنا مقالہ "نفسیات مذہب" پر پڑھا۔ حاضرین میں جامعہ کے علاوہ دہلی کے کالجوں کے بہت سے اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔

دوسرے لکچر میں قاضی عبدالغفار صاحب نے "جمال الدین افغانی" کی سیرت پر سیر حاصل تبصرہ فرمایا۔ تیسرے میں مولانا اسلم صاحب نے "مصر کی قدیم تہذیب پر اسلام کا اثر" کے عنوان سے اپنے خیالات ظاہر فرمائے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کا ہاتھ بٹانے کے لئے محمد حفیظ الدین صاحب اُردو اکادمی کے کاموں میں شریک ہو گئے تھے۔ آپ کے انتظام اور سلیقہ نے جلسوں کی رونق بڑھادی تھی۔

اُردو اکادمی کی تاریخ میں ۱۹ اپریل ۱۹۳۲ء کا وہ جامعہ مباحثہ یادگار رہیگا جس میں ایک مضمون کی موافقت میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اور اس کی مخالفت میں خواجہ غلام السیدین صاحب نے تقریر کی تھی۔ مضمون یہ تھا کہ "ہندوستانی یونیورسٹیوں کی موجودہ تعلیم ناقص ہے"۔ حمایت میں ڈاکٹر سعید، ڈاکٹر عبدالعلیم، مولوی نورالرحمٰن صاحب اور سید تجمل حسین صاحب نے تقریریں کیں لیکن مخالفت کے میدان میں ایک ہی سردار تھا یعنی سیدین صاحب، سید تجمل حسین صاحب اپنی تقریر میں بات بات پر ہنسا دیتے تھے لوگ اس جلسے سے بہت خوش تھے۔

جامعہ کے کارکنوں کے ذمّے صرف تعلیمی اور انتظامی کام ہی نہیں تھے چندے کا کام بھی پیچھے لگا ہوا تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں استاد پھر جھولیاں لے کر نکلے۔ ایک وفد تو مجیب صاحب کی نگرانی میں لنکا اور مالدیپ گیا۔ علی احمد صاحب اپنے ساتھیوں کو برما لے گئے۔ سعد انصاری صاحب نے بنگلور اور ملابار کا دورہ کیا۔ حفیظ الدین صاحب نے اُردو اکادمی کے رکن بنانے کے لئے حیدرآباد دکن کو منتخب کیا۔

تیرھواں سال

اگست سنہ ۱۹۳۲ء سے جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

ابتدائی پنجم میں طلبہ کی کامیابی کے بعد چھٹی جماعت بھی یہیں قائم ہو گئی۔ اب یہ مدرسہ جماعتوں کی تعداد کے لحاظ سے "مکمل مدرسہ ابتدائی" بن گیا تھا۔ علی گڈھ کے زمانے ہی سے جامعہ والوں کے نزدیک مدرسہ ابتدائی سے مراد شروع کی چھ جماعتیں رہی ہیں علی گڈھ کے دستور العمل میں اس کا ذکر اس طرح ہے کہ مکتب کا ایک سال اور ابتدائی کے ۵ سال۔ اس طرح چھ سال شمار کئے گئے ہیں۔ قرول باغ میں مکتب کا نام پہلی قرار دے کر چھ جماعتوں کا مدرسہ ابتدائی تسلیم کر لیا گیا یہی بات اب تک چلی آرہی ہے۔

حسب معمول پروجکٹ کے ذریعہ تعلیم کا کام جاری رہا۔ اس سال کی خاص چیز "جوہر ترانی" کا آغاز ہے۔ ہمارے ملک میں بچوں کی تحریری تقریری کے مقابلوں کی یہ صورت چلی آرہی ہے کہ مقررہ تاریخ پر مقررہ عنوان کے تحت بچے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، منتخب کو انعام مل جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایک ایسی اسکیم تھی جس سے بچوں کی مختلف صلاحیتوں کو کام میں لانے اور آزمانے کا مقابلہ چلے۔ چنانچہ مروجہ مقابلوں کے علاوہ اس سال کی یہ جدت تھی کہ تصاویر کے ذریعہ بچوں کو

کاروبار جاری ہے

مناظر بیان کرنے یا کہانی سنانے کا موقع ملے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مقابلہ میں حصہ لینے والے بچوں کو صبح کے وقت کسی تاریخی مقام پر بھیج دیا جاتا کہ وہاں عمارتوں یا کھنڈروں کا مشاہدہ کریں اور ایک جلسے میں اپنے تاثرات بیان کریں، جامعہ نگر منتقل ہونے کے بعد کھیل کود کے مقابلے بھی ہونے لگے۔ اب جوہر ٹرافی کے مقابلوں کی صورت یہ ہوگئی کہ مقابلوں میں حصہ لینے والے مدارس کا کیمپ تین دن کے لئے جامعہ نگر کے پُرفضا میدان میں ہوتا ہے کیمپ بجانے سے لے کر تحریر و تقریر، ورزشوں اور کھیلوں تک ان سب چیزوں میں مقابلہ ہوتا ہے جن سے تعلیم و تربیت کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں اس سال کے انعامات آصف علی صاحب نے تقسیم کئے تھے۔

مدرسہ کی فضا پر پڑھنے پڑھانے کا ایک خاص رنگ چھا گیا تھا، باغبانی، میلاد النبیؐ، بیت بازی، تعلیمی کھیلوں کے کام کو جلسوں کے ذریعہ نمونتاً لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔ بنک کے سالانہ دو جلسے ہو چکے تھے، حاضرین نے بچوں کے کاموں کی دل کھول کر داد دی تھی۔ حوصلے بڑھ گئے۔ بنک اور دکان کا کاروبار وسیع کرنے کا ارادہ پیدا ہوگیا۔ ضروری فرنیچر خرید لیا گیا۔ کتابوں کی خرید و فروخت شروع ہوئی۔ بنک کے قاعدے و قانون بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پانچ کے بجائے پندرہ قاعدے بنے۔ پاس بک کا دوسرا "مجلد ایڈیشن" شائع ہوا۔ کچی رسیدوں کی بجائے "چک بک" تیار ہوئی۔ لڑکوں نے چندہ جمع کرکے ایک رکن کے حساب میں رقم جمع کی اور اس رکن نے بچوں کی طرف سے پہلا چک شیخ الجامعہ صاحب کے نام کاٹا۔ شیخ الجامعہ صاحب بنک میں خود ہی تشریف لائے۔ کھاتہ نویس کو چک دیا اس نے چک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کھاتہ کھولا۔ یہ اطمینان کر لیا کہ جس رقم کا چک ہے اس سے زیادہ کی رقم جمع ہے پھر بنک کی مُہر لگا کر یہ چک خزانچی کو دیدیا خزانچی نے نقدی کی کتاب میں اندراج کرنے کے بعد شیخ الجامعہ صاحب سے چک کی

پشت پر دستخط کرنے کے لئے کہا۔ شیخ الجامعہ صاحب کے پاس فاؤنٹن پن نہیں تھا۔
انھوں نے ایک کونے میں رکھی ہوئی دوات قلم لے کر دستخط کئے پھر روپے لئے۔
گویا چک کے ذریعہ لین دین کے "افتتاح" کی رسم منائی گئی۔ ۲۰ اپریل کو بنک
اور دکان کا سالانہ جلسہ ہوا۔ مضامین پڑھے گئے۔ نفع تقسیم ہوا۔ بنک کے اراکین
اور جامعہ کے استادوں کو عصرانہ دیا گیا۔ اس سال کی رپورٹ سناتے وقت بنک کی
تحویل ایک سو دس روپے چار آنے تین پائی تھی جس کا پچیس فیصدی کے حساب
سے نفع تقسیم کیا گیا۔

عثمانیہ کلب پانی پت کے انتظام میں ہر سال دسویں جماعت تک کے طلباً
کا تقریری مقابلہ ہوتا تھا اس مقابلہ میں زیادہ تر نویں اور دسویں جماعت کے لڑکے
حصہ لیتے ہیں۔ لیکن گزشتہ سال ہمارے یہاں کے پانچویں جماعت کے محمد نور خاں
نے اول اور رحیم خاں نے تیسرا انعام حاصل کیا تھا۔ یہ لڑکے ششم میں آگئے تھے۔
اگر ہم چاہتے تو ان ہی لڑکوں کو اس سال کے مقابلے کے لئے بھیج سکتے تھے لیکن
ہمارا پہلا مقصد انعام حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ نئے نئے لڑکوں کی ہمت بڑھانا تھا
اس لئے اب کی دفعہ عبدالناصر اور اسلام اللہ بھیجے گئے (جو ششم میں پڑھ رہے تھے)
انھوں نے صرف انعامات ہی نہیں حاصل کئے بلکہ بہ حیثیت مجموعی اپنے مدرسہ کو اول
رکھنے کا کپ حاصل کیا۔ یہ کام محمد حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں ہوا تھا۔ آپ
اس وقت تک اُردو اکادمی میں کام کر رہے تھے لیکن مدرسہ کی دلچسپیوں کو غور
سے دیکھ رہے تھے اور یہاں کی آزاد اور پُر مسرت فضا کی طرف کھنچے چلے آرہے
تھے۔ بالآخر آپ مدرسہ ابتدائی کے اساتذہ میں شامل ہو گئے اس مدرسہ میں شامل ہونے
والے اساتذہ کے لئے بہت سی خوبیوں کا حامل ہونا ضروری ہے۔ حفیظ صاحب کے
کردار، گفتار کا اثر شاگردوں میں آنے لگا ان کے بعد سید مجتبیٰ حسین صاحب زیدی

مس گرٹرڈ فلپس بورن صاحبہ (رحمٰن خاتون) کا تقرر ہوا۔ مجتبیٰ صاحب کی ذہانت، محنت، تیزی اور فلپس بورن صاحبہ (آپا جان) کے خلوص، محبت، حسن سلوک اور انتھک کوشش سے اس مدرسے کے کاموں میں جان پڑ گئی مجتبیٰ صاحب نے کئی سال تک بنک، دکان میں کام کرکے ان کا معیار قائم کر دیا تھا، بچوں کی عادات درست بنانے کی طرف آپ خاص توجہ دیتے تھے۔

استاد تو دل سے چاہتے تھے کہ پڑھنے پڑھانے کے طریقوں کو معلوم کرکے اپنا کام اسی نہج پر کریں۔ ان کی اس مدد کے لئے "مشق اسباق" کا سلسلہ شروع کیا گیا، یعنی ہر استاد باری باری سے کسی جماعت کو نمونے کا سبق پڑھاتا اور اس کے ساتھی جماعت والوں کے پیچھے بیٹھ کر دیکھتے سمجھتے کہ کام کس طرح ہو رہا ہے۔

ششم کے طلبا کا سالانہ امتحان قریب آیا تو یہ خیال ہوا کہ ان لڑکوں کو ثانوی میں بھیجنے سے پہلے ان کی الوداعی دعوت کرنی چاہیئے تاکہ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی میں گہرا تعلق قائم رہے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ سالانہ چھٹیاں ہونے سے ایک مہینہ پہلے ششم کی "الوداعی پارٹی" کیا کریں۔ انھیں ہار پہنائیں، جلسہ میں مدرسہ کی طرف سے ایک لڑکا یہ بتائے کہ ششم والوں نے اس مدرسہ میں کون کون سے مفید کام کئے ہیں اور ثانوی میں جانے کے بعد استاد صاحبان ان سے کیا توقع رکھتے ہیں ششم والے جوابی تقریر کریں۔ آخر میں چائے ہو اور مدرسہ کے تمام لڑکوں کی سالانہ تصویر لی جائے۔

ششم کی الوداعی پارٹی کا یہ کام سید احمد علی صاحب نائب نگراں مدرسہ نے اپنے اہتمام میں کر دیا تھا۔ آپ ان دنوں پانچویں جماعت کو پڑھاتے تھے۔ اسی جماعت کے لڑکوں نے مدرسہ کی طرف سے ششم والوں کو الوداع کہا تھا۔

امتحان کا ذکر آیا ہے تو اس کا نتیجہ سنانے میں جس جدّت سے کام لیا جاتا تھا

وہ بھی بیان کر دیں، جو بچہ جتنے مضمونوں میں پاس ہوتا، اتنے ہی رنگ برنگی چائے کی تشتری کے برابر بتاشے دیئے جاتے۔ اس طرح ہر ایک بچے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا اور وہ خود ہی اندازہ لگا لیتے کہ کس نے کیا پایا، کیا کھویا، اس سال کی بات ہے کہ ایک جلسہ میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر صاحب بچوں کو بتاشے تقسیم کر رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے آکر چپکے سے ان کے کان میں کوئی بات کہی، ذاکر صاحب نے جواب میں کچھ کہا اور بتاشوں کی تقسیم میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی آدمی پھر آیا اور کوئی بات کہی، ذاکر صاحب کے چہرے پر اُداسی چھا گئی، پھر جلد ہی وہ سنبھل گئے اور بتاشوں کی تقسیم کے بعد بچوں کو مبارکباد دی، جلسہ ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ دوسری خبر ڈاکٹر صاحب کی بچی (ریحانہ) کے انتقال کی تھی۔

اس سال یوگا کی ٹریننگ کے لئے عبدالواحد صاحب سندھی کو بھیجا گیا تھا۔

عید کے دن ڈراما کرنے کی روایت کو قائم رکھنے کے لئے سید نور شاہ صاحب نے ڈراما " اسکول کی زندگی " کروایا۔ اس سال بھی ثانوی والوں نے مدرسہ ابتدائی کے جلسوں میں کوئی نہ کوئی چیز تحفہ کے طور پر پیش کی۔ ۲۹ اکتوبر کی نمائش میں ابتدائی اور ثانوی کا کام نمایاں تھا۔ طلباء نے اپنے مدرسوں کی رپورٹ سنائی۔

تاسیس کے جشن کے لئے ذاکر صاحب نے ایک چھوٹا سا ڈراما " دیانت " لکھ دیا تھا۔ ذاکر صاحب کے مزاج میں نرمی، غصہ، مذاق، سنجیدگی، سبھی چیزیں پائی جاتی ہیں اس لئے کہانی ایسی سوچی ہے کہ اس میں یہ سب باتیں آجائیں۔

جو لڑکے عربی مدرسوں کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جدید تعلیم حاصل کرنا چاہیں خاص طور پر انگریزی سیکھنا چاہیں ان کے لئے " درجۂ خاص " کے نام سے ایک علیحدہ جماعت بنائی گئی۔ اس کے لئے ابتدائی نصاب اور قاعدے قانون بنائے گئے۔

اکتوبر ۱۹۳۲ء سے پہلے پیام تعلیم میں ہر طرح کے مضامین شائع ہوتے تھے بچوں کے لئے چند صفحے رکھے گئے تھے لیکن ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء سے پیام تعلیم کا پرچہ بچوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ کتابی سائز کا دگنا سائز رکھا گیا۔ اب اس کے مدیر بھی سعید انصاری صاحب کی بجائے حسین حسّان صاحب مقرر کئے گئے۔ حسین حسّان صاحب کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ہے جب سے یہ ذمّہ داری لی ہے بچّوں کے مضامین پر جہاں بھی مواد ملے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔

اس سال ایک نئے شعبے کی ابتدا ہوئی۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جامعہ کی مالی حالت نہایت خراب تھی۔ جو لوگ باقاعدہ طور ماہانہ یا سالانہ چندہ دیا کرتے تھے ان کی مجموعی رقم دو سو روپے ماہانہ سے زائد نہیں تھی ۱۹۳۰ء میں ریاست حیدر آباد سے ایک ہزار روپے ماہوار کی رقم منظور ہوئی تھی لیکن سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں یہ بند ہوگئی تھی (جو بعد میں پھر جاری ہوگئی) کام بس اللہ توکل چلتا رہا۔ اساتذہ اور دیگر کارکنوں کی تنخواہوں کا اوسط اگرچہ پچاس روپے ماہوار تھا پھر بھی کئی کئی مہینوں تک ادائیگی نہیں ہوتی تھی۔ مطبخ سے کھانا جاری ہوتا، دیگر ضروریات کے لئے بہت کچھ کہنے سننے پر پانچ دس روپے مل جایا کرتے تھے۔ ایسی حالت پر بھی جامعہ کے کارکنوں کو جامعہ کے مستقبل کا خیال تھا۔ کوشش یہ تھی کہ کسی مناسب جگہ پر اپنی عمارت بن جائے۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں جامعہ کے کارکنوں نے جب جامعہ چلانے کی ذمّہ داری خود ہی سنبھالی اور اپنی تنخواہوں میں جو پہلے ہی کم تھیں اتنی کمی کر دی جس سے شدید ضرورتیں بھی مشکل سے پوری ہوتی تھیں۔ جب ریاست حیدر آباد نے ۱۹۳۰ء میں ۵۰ ہزار روپیوں کی یکمشت رقم دی تو یہ بھی عمارت فنڈ میں "فکسڈ ڈیپازٹ" کی صورت میں رکھوا دی۔ کسی کو جب کہ کئی کئی مہینوں تک تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ کام کا حال

آپ نے دیکھا کہ تعلیمی تجربے جاری تھے، رسالے نکلتے تھے، نئی نئی اسکیمیں سوچی جارہی تھیں اور ان پر ایک ایک کر کے عمل ہو رہا تھا۔ حوصلے بڑھے ہوئے تھے، سوچا گیا کہ ان تعلیمی اسکیموں سے عوام کا لگاؤ ہو، ہمدردی بڑھے اور کاموں کی صورت بھی نکل آئے چنانچہ شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کے انتظام میں "شعبۂ ہمدردان جامعہ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے مقصد کو اس طرح بیان کیا گیا کہ جامعہ کے کارکن جامعہ کی آمدنی کا پائیدار اور قابل اعتماد مستقل انتظام اسے نہیں سمجھتے ہیں کہ بنک میں سرمایہ جمع ہو یا حکومت کی طرف سے امداد ملے بلکہ تمام مسلمانوں کے دل میں قومی تعلیم گاہ کی جگہ ہو جائے اور قطرہ قطرہ کر کے فیض وکرم کا دریا بہائیں جو بنکوں اور حکومتوں کے زوال کے بعد بھی جاری رہے۔"

چنانچہ طے کیا گیا کہ جو لوگ بھی چار آنے، آٹھ آنے، روپیہ، دو روپے، یا اس سے زائد ماہوار دیں گے انھیں "حلقہ ہمدردان جامعہ" کا رکن بنالیا جائے گا پہلے دن یہ شعبہ شفیق صاحب کی چلتی پھرتی جیب میں تھا کئی سال کی انتھک کوششوں کے بعد آپ نے اسے ہر طرح سے مفید اور ٹھیک ٹھاک کر کے خواجہ عبدالحیٔ صاحب کے سپرد کیا اور جائزے میں ایک مہتمم دفتر، ایک محاسب، دو منشی اور سب خرچ نکال کر ایک ہزار روپے کی مستقل آمدنی چھوڑ دی اور خود اپنا بوریا جھولا لے کر ایک اور مفید کام کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ چندہ دینے والے حضرات کو جامعہ کے کاموں سے باخبر رکھنے، وصول شدہ رقموں کا حساب کتاب ہمدردوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے شفیق صاحب نے ماہوار رسالہ "ہمدرد جامعہ" نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے نے جہاں ایک طرف ہمدردوں کی تنظیم میں مدد دی وہاں جامعہ کے تعلیمی، انتظامی، کارروائی کو عوام کے سامنے پیش کیا اس طرح ان کاموں کا ایک ریکارڈ بھی محفوظ ہو گیا۔

شفیق صاحب نے اس رسالے کی ادارت محمد حفیظ الدین صاحب کے سپرد کی تھی اگرچہ پرچے پر آپ کا نام نظر نہیں آتا ہے۔ آپ کے ادبی ذوق، سلیقہ ترتیب نے اس رسالے کی افادیت بڑھادی تھی۔ اس کا پہلا نمبر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو نکلا تھا بعد میں ہمدردان جامعہ کے ناظم مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب ہوئے۔ چندہ جمع کرنے کا کام مشکل اور کچھ عجیب سا ہے لیکن جامعہ کی خاطر خواجہ صاحب اس کام کو بھی خوشی سے کرتے تھے آپ شعبۂ دینیات کے ناظم بھی تھے۔

بات طویل ہو جاتی ہے لیکن تنخواہوں کا اوسط ۵۰ روپے ماہوار ہونے اور کئی کئی مہینوں تک تنخواہ نہ ملنے کے باوجود جامعہ کے ایک کارکن کے ذمہ کتنا کام ہے یہ رسالہ جامعہ کے مدیر کی زبانی سنئے:۔

"جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں۔ ان تیس آدمیوں کے ذمے جتنے کام ہیں۔ ان کی تفصیل ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ دوسری تعلیم گاہوں میں ان میں سے ہر ایک کام کے لئے کتنے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

کنڈرگارٹن کی تعلیم کے لئے دو درجوں میں،	اس کام کیلئے	کم از کم	۲	اشخاص کی ضرورت ہے
پرائمری اسکول کے چھ درجوں کی تعلیم	"	"	۱۰	"
ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے ۶ درجوں کی تعلیم	"	"	۱۲	"
کالج کی معمولی اور امتیازی ڈگری کی تعلیم	"	"	۱۲	"
درجہ ہائے خاص کی تعلیم	"	"	۴	"
اسکول کے کھیل اور ورزش کی نگرانی	"	"	۱	"
کالج کے کھیل اور ورزش کی نگرانی	"	"	۱	"

چار اقامت گاہوں کی نگرانی (علاوہ ان نگرانوں کے جو اپنا نائد وقت اس

کام میں صرف کرتے ہیں۔	اس کام کیلئے کم ازکم ایک شخص کی ضرورت ہے			
تعلیم بالغان مدرسہ تبلیغیہ وغیرہ کی نگرانی (علاوہ اعزازی کارکنوں کے)	"	"	۱	"
دفتر ہمدردان جامعہ کی نگرانی (علاوہ کلرکوں کے)	"	"	۱	"
مسجّل کا کام (علاوہ کلرکوں کے)	"	"	۱	"
صدر محاسب کا کام "	"	"	۱	"
اسکول اور کالج کے پراکٹر کا کام	"	"	۱	"
رسالہ جامعہ کی ادارت	"	"	۱	"
پیام تعلیم کی ادارت	"	"	۱	"
اردو اکادمی کی نگرانی	"	"	۱	"
مکتبہ جامعہ ملیہ کی نگرانی	"	"	۲	"
مطبع جامعہ ملیہ کی نگرانی	"	"	۱	"
شیخ الجامعہ کا کام	"	"	۱	"
صدر مدرس کا کام	"	"	۱	"
سکریٹری انجمن تعلیم ملی کا کام	"	"	۱	"

اس طرح جامعہ ملیہ کے کل کاموں کو جو اس وقت ہو رہے ہیں اچھی طرح چلانے کے لئے ۷۵، اشخاص کی ضرورت ہے مگر صرف ۳۰ خدا کے بندوں نے یہ سارا بوجھ اپنے سر پہ اٹھا لیا ہے یعنی اوسطاً ہر شخص دو آدمیوں کا کام کر رہا ہے جو لوگ جامعہ کے اندرونی حالات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے اکثر اراکین پر مالی پریشانیوں وغیرہ کے علاوہ کام کا بار اتنا ہے جس کا برداشت کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر ان معدودے چند لوگوں میں سے دو ایک تھک کر بیمار

ہو جاتے ہیں تو ان کا کام بھی باقی کارکنوں پر تقسیم ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں دو مہینے کی تعطیل ہوتی ہے مگر اس سے بعض تو اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور بعض اس زمانے میں کاسۂ گدائی لے کر چندے کے لئے نکل جاتے ہیں (رسالہ جامعہ جولائی ۱۹۳۳ء)

ایسے نازک دور میں خازن کے عہدے پر محمد مجیب صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔ نائب خازن کا کام حافظ فیاض احمد صاحب مرحوم انجام دے رہے تھے، آپ کے کاموں کا ذکر آگے آئے گا۔

اس سال اُردو اکادمی کے انتظام میں توسیعی لکچروں کا سلسلہ بھی شروع ہوا ترکی کے مشہور رہنما حسین رؤف بے نے "قدیم اور جدید ترکی" پر چار لکچر دیئے۔ دو جلسوں کی صدارت ڈاکٹر محمد اقبال نے کی۔ رؤف بے نے ترکی کی تاریخ اس طرح بیان کی گویا وہ واقعات لوگوں کے سامنے پیش آ رہے ہیں یا ان واقعات کو لوگ دیکھ رہے ہیں۔

محمد حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں ثانوی اور کالج کے لڑکوں نے چاروں جلسوں کا انتظام کیا تھا۔ ٹکٹوں کی پابندی کے باوجود ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا بہت سے واقعات میں رؤف بے خود ہی شریک تھے دیکھی اور سُنی ہوئی باتوں کے بیان میں ایسا ہی فرق ہوتا ہے

اس سال حافظ فیاض احمد صاحب مہتمم جامعہ نے پوری جامعہ کا ایک مفصل دستور العمل شائع کیا جس میں دستور العمل کی لوازمات کے علاوہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۱ء تک طلباء کی تعداد سنہ وار، بی، اے۔ میں کامیاب ہونے والے طلباء کی مکمل فہرست، طلباء قدیم کے بارے میں جن جن کی معلومات مل سکتی تھیں یہ بتایا کہ کون کون سے طلباء نمایاں کام کر رہے ہیں۔

اب مہمانوں کا حال سنئے۔ اس سال کے مہمانوں میں ہندوستان کے لوگوں میں سے ڈاکٹر محمد اقبال، راج گوپالا آچاری، عبداللہ یوسف علی، سید سلیمان ندوی ہیں۔ سید سلیمان ندوی صاحب نے اردو اکادمی کے جلسے میں "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" کے عنوان سے اپنا مقالہ سنایا۔ محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی نے بھی تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے انجمن اتحاد کے انتظام میں اپنے یورپ کے سفر کے حالات سنائے۔ اسپین میں مسلمانوں کی بہت سی یادگاریں ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کو ان چیزوں سے دلچسپی تھی اس لئے اسپین کے حالات آپ نے تفصیل اور دلچسپی کے ساتھ سنائے۔ انجمن والوں نے آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا اور انجمن کا اعزازی رکن بنا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خوشی سے قبول کیا۔

ہندوستان کے باہر کے لوگوں میں سے حسین رؤف بے، بیرن عمر ایرن فلنہ ڈاکٹر کپ نس، خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

جامعہ کے خازن
۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء

۱۔ سیٹھ جمنالال بجاج
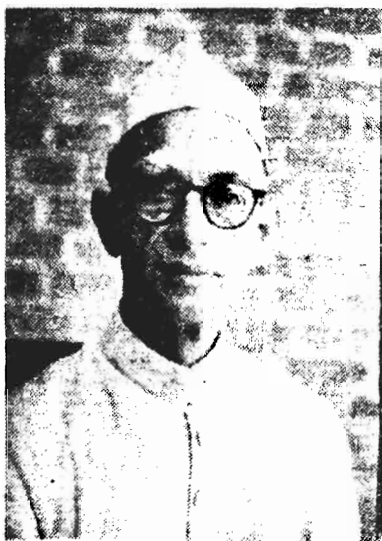
۲۔ پروفیسر محمد مجیب

چودھواں سال

اگست ۱۹۳۳ء تا جولائی ۱۹۳۴ء

مدرسہ ابتدائی میں اس سال تجربے کے طور پر کنڈر گارٹن جماعت کھولی گئی اس جماعت کا اضافہ جرمنی سے آئی ہوئی خاتون مِس گرِٹا فلپس بورن کے ذوق وشوق کا نتیجہ تھا۔ آپ کو بچوں سے والہانہ محبّت تھی، ان کی خدمت کرنے، ان کی صلاحیتوں کو کام میں لانے کا ملکہ تھا۔

مدرسے میں طلبا کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، جماعتوں کے فریق کھولنے کی وجہ سے اقامت گاہوں میں جگہ نہ رہی تھی۔

مدرسہ ابتدائی نے روایتی ڈھنگ سے الگ "بچوں کی بیت بازی اور مشاعرہ" کا نیا پروجکٹ چلایا۔ لڑکے اس پر آمادہ ہوگئے تھے کہ وہ درسی کتاب کی تمام نظموں کو سمجھ کر ان میں سے اپنی پسند کے شعروں کا انتخاب کریں گے۔ پھر اس بیاض میں درسی کتاب سے باہر کے مزاحیہ شعر بھی درج کرلیں گے۔ اُسے ی تک شروع ہونے والے اشعار آپس میں تقسیم کرکے انھیں زبانی یاد کریں گے۔ جلسہ میں ہر لڑکا اپنے حصّہ کے شعر سنائے گا یوں درسی کتاب کی تمام نظموں کو لڑکوں نے بامقصد طریقے سے سیکھا اور اس میں اپنی معلومات کا اضافہ کیا۔ اس کا دوسرا حصّہ

"بچوں کا مشاعرہ" تھا۔ لڑکوں سے کہا گیا تھا کہ وہ دس لفظوں کی ایسی فہرست بنائیں جن پر ہر ایک لڑکا دو یا تین شعر کہہ سکے۔ منتخب لفظ یہ تھے۔ طوطا، پھول، طاہر کی غلیل۔ بلبل، شمع، سورج، ستارہ، بنک، دکان، کسان، جس نے جن لفظوں پر بہتر شعر کہے اس سے کہا گیا کہ وہ اس موضوع کو مکمل کرے۔ ثانوی اول والوں سے بیت بازی کا مقابلہ ہوا مشاعرے میں بچوں نے اپنے رنگ میں نظمیں سنائیں، ہال میں اردو کے مشہور شعراء کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ حاضرین میں جامعہ کے تقریباً سب لوگ تھے۔ یہ لوگ اس نئے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوئے۔

حسب معمول "میلاد النبیؐ" "محمد علی ڈرامہ" اور "ششم کی العامی پارٹی" کے جلسے ہوئے۔ البتہ اس سال کی ایک اور نئی خاص چیز مدرسہ ابتدائی کے طلبا کے سرپرستوں اور جامعہ کے استادوں کا جلسہ تھا جسے "یوم والدین" کہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ استاد سرپرستوں کو یہ سمجھائیں کہ ہم لڑکوں کی تعلیم و تربیت میں کس قسم کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اس کام میں کون کون سی دشواریاں پیش آرہی ہیں اس کے لئے والدین کس طرح مدد کر سکتے ہیں۔ پھر استاد یہ بھی معلوم کرتے ہیں کہ سرپرست ہمارے کام سے کس حد تک مطمئن ہیں۔ وہ کیا چاہتے ہیں۔

بنک و دکان کے لئے تو یہ سال "انقلابی سال" کی حیثیت رکھتا ہے پچھلے سال تک بازار کے چھپے ہوئے رجسٹر فارم وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے لیکن اب اپنے نمونے طبع کرانے کی ہمت ہو گئی تھی۔ کھاتے، کیش بک فارم وغیرہ سب کچھ اپنے چھپوا لئے گئے۔ ان نئی نئی چیزوں کو دیکھ کر ہر شخص کا دل چاہتا تھا کہ حساب کھلوائے ادھر کارکنوں کی طرف سے اعلان ہو گیا تھا کہ بنک کی تحویل میں پانچ سو روپے ہونے پر ایک خاص جشن منایا جائے گا۔ جس میں بنک کا دستور باقاعدہ منظور ہو گا۔ ایک مہینے کی کوشش نے تحویل کو پانچ سو سے بھی زیادہ کر دیا۔ چنانچہ ۲۱ فروری

۱۹۳۷ء کو خاص جشن منایا گیا جس میں بنک کا جدید دستور منظور ہوا۔ اس جلسہ کی خاص بات یہ تھی کہ ہر رکن کے پاس بنک کی پاس بک موجود تھی۔ جب دستور کی منظوری کے لئے صدر صاحب نے رائے لی تو سب نے اپنی اپنی پاس بک لئے ہوئے ہاتھ اٹھائے۔ ان چھوٹی چھوٹی کتابوں نے لڑکوں کے سروں کو ڈھک لیا تھا۔ جامعہ کے سب استاد اس جلسہ میں شریک تھے اس انقلابی سال میں نوٹوں کا اجرا بھی خاص چیز ہے۔ اب لوگ بنک کے پرزوں پر بھی ایسا ہی اعتبار کرنے لگے تھے جیسے سونے چاندی کے سکّوں پر۔ چنانچہ ایک پیسے والے اور ایک آنے والے نوٹ جاری کئے گئے۔ دفتر جامعہ، مکتبہ، بچّوں کی دکان خوانچہ اور بعض منظور شدہ دکانوں پران کا لین دین بغیر کسی رکاوٹ کے ہونے لگا سال کے آخر میں بنک کی تحویل (۱۱۷ روپے ۱۰ آنے ۹ پائی) تھی جسب معمول پچھلے تین سالوں کی طرح ۳۰ اپریل کو چوتھے سالانہ جلسے میں ۲۵ فیصدی کے حساب سے منافع تقسیم کیا گیا۔ ششم کی الوداعی پارٹی بھی اسی موقع پر ہوئی اور مدرسہ کی سالانہ تصویر لی گئی۔

ہفتہ میں ایک گھنٹہ (جمعرات کے دن) اس بات کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا کہ اس گھنٹہ میں کوئی استاد جماعتوں میں نہ رہے، بلکہ پورا مدرسہ لڑکوں پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں میں اپنی پسند کا کام کیا کریں۔ لڑکوں نے اس کام میں بھی دلچسپی لی۔ اس طرح استادوں کو یقین ہو گیا کہ اگر کسی ضرورت سے سب استاد کہیں چلے جائیں تو لڑکے مدرسہ کا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

لڑکوں کے لئے ایک اور مگر سب سے دلچسپ چیز "خطرہ کی گھنٹی" تھی ذاکر صاحب کی تجویز کے مطابق خاص طرح کی گھنٹی خریدلی گئی تھی اور طلبا کو سمجھا دیا گیا تھا کہ فرض کر دکسی فوری اور اچانک ضرورت سے ذرا سی دیر میں

تمام لڑکوں کو ایک خاص جگہ جمع کرنا چاہتے ہیں ایسی صورت میں لڑکوں کو جماعتوں سے بھاگ کر کسی خاص جگہ جمع ہونے میں دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ مثلاً ایک ہی دفعہ میں بہت سے لڑکوں کا دروازہ سے نکلنا، پیر میں جوتے نہ ہونے کی وجہ سے کانٹوں کا چبھنا، تنگ راستوں سے گزرنا، ممکن ہے۔ اس وقت سخت بارش ہو رہی ہو یا سخت دھوپ پڑ رہی ہو یا سردی زوروں پر ہو ان دشواریوں پر قابو پانے کے لئے موقع موقع سے مشق کی جائے گی۔ جس وقت گھنٹی بجے لڑکے جس حال میں جہاں بھی ہوں فلاں فلاں راستوں سے گزر کر مقررہ جگہ پر پہنچ جائیں۔ اور جس قدر تیزی کے ساتھ وہ بھاگ سکتے ہیں بھاگیں لیکن اس بات کا خیال بھی رکھیں کہ بھاگنے والے ساتھیوں کو ان کی تیزی کی وجہ سے نقصان نہ پہنچے۔

موگا سے عبدالواحد صاحب کی واپسی پر عبدالخالق صاحب کو تعلیم پانے کے لئے بھیجا گیا۔ ٹرینڈ استادوں کی تعداد کافی ہو گئی تھی اس لئے تقریباً ایک جماعت کا کام "ایک استاد" کے اصول پر ہونے لگا، یعنی ایک جماعت میں ایک ہی استاد زیادہ سے زیادہ مضامین پڑھائے اس طرح استاد اور لڑکے دونوں کو زیادہ کام کرنے کا موقع ملنے لگا۔

مدرسہ کے دستور العمل میں رہنمائی کے لئے عام باتیں ہوتی ہیں۔ اس دفعہ مدرسہ ابتدائی کا ایک ایسا تفصیلی دستور العمل شائع کیا گیا جس میں علاوہ عام معلومات کے اس مدرسہ کا نصب العین، طریقۂ تعلیم، ذرائع تعلیم، نصاب کا خاکہ درج کیا گیا تھا۔

مولوی عبدالحق صاحب (سکریٹری انجمن ترقی) مولوی عبدالماجد دریابادی مولوی محمد محی الدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج اورنگ آباد (دکن) محمد حسین صاحب انسپکٹر لاہور، اللہ رکھا صاحب ڈپٹی انسپکٹر لاہور، ماسٹر لبھو دل صاحب (موگا)

نے مدرسہ کا تفصیلی معائنہ کر کے "کتاب الرّائے" میں اپنی رائیں لکھیں۔

مدرسہ ابتدائی کے کاموں کا کافی پھیلاؤ ہو گیا تھا جس جگہ بہت سے کام جمع ہو جائیں تو ضرورت اس بات کی رہتی ہے کہ ان کی جانچ پڑتال کر کے یہ دیکھا جائے کہ کوئی کام غلط راہ پر تو نہیں چل رہا ہے، پھر جانچ پڑتال کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کام کو اور آگے بڑھایا جائے چنانچہ جامعہ کی اس پہلی معائنہ کمیٹی کے رکن ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، خواجہ عبدالحیٔ صاحب، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری، برکت علی صاحب نے لڑکوں کے سال بھر کے کاموں کی کاپیاں دیکھیں۔ نئے اور پرانے کاموں کا مقابلہ کیا۔ نصاب کے مطابق جو عادتیں لڑکوں میں ہونی چاہئیں ان پر نظر ڈالی۔ استادوں کو پڑھاتے اور لڑکوں کو پڑھتے دیکھا۔ شعبوں کا کام جانچا۔ غرض دیکھنے میں اس بات کا خیال رکھا کہ کیا کام ہوا ہے اور اس میں کیا خوبیاں اور کیا خامیاں ہیں۔ آخر میں کچھ امتحان کی شکل میں بھی لڑکوں سے پوچھا۔ پھر اپنی تفصیلی رپورٹ شیخ الجامعہ صاحب کے سامنے رکھی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے استادوں کے ایک جلسہ میں معائنہ کرنے والوں کو بلا کر گفتگو کی کہ ان کے خیال میں کن اصلاحوں کی ضرورت ہے۔

مدرسہ ابتدائی میں استادوں کے لئے پہلی دفعہ دو گریڈ بنے۔ ایک میٹرک پاس اساتذہ کے لئے ۲۵ تا ۴۵ روپے کا۔ دوسرا بی۔ اے پاس کے لئے ۴۰ تا ۶۵ روپے کا۔

ایک رنج کی خبر بھی ہے اسی زمانے میں مدرسہ ابتدائی کے استاد محمد عثمان صاحب کا انتقال ہوا۔ "مرحوم شُد عثمان" سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ عثمان صاحب بچّوں کو مارتے نہیں تھے اس لئے بچے بے خوف ہو کر آپ کے اردگرد بیٹھتے، لکھتے پڑھتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔ آپ ان کے ایک ایک سوال کا جواب دیتے۔ بہت سادہ طبیعت پائی تھی۔ سیدھی سادی زبان میں بڑے سے بڑا خیال اچھی طرح ادا

کر دیتے تھے۔

عید کے دن ثانوی اور کالج والوں نے مجیب صاحب کا تازہ لکھا ہوا ڈراما "انجام" کیا۔ نبی احمد صاحب نے "سادہ لوح" "لڑکے کا کام غضب ..... کیا اور لوگوں کو ہنسایا۔ یہ کام مجیب صاحب کی رہنمائی میں ہوا۔

محمد مجیب صاحب (موجودہ شیخ الجامعہ) ٹھوس کام کرتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ہے۔ انسان کی نجات اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ خلوص سے کچھ کرتا رہے ان کے دونوں ڈراموں کھیتی اور انجام میں یہی جھلک پائی جاتی ہے۔ مجیب صاحب کو پھول پھلواری کا شوق بھی ہے۔ فرصت کا وقت اس دلچسپ مشغلے میں گزارتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کے ساتھی کی حیثیت سے اور اب ایک زمانے سے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے استقلال اور پامردی سے مجیب صاحب جامعہ کے کاموں کو چلا رہے ہیں۔ آپ کی تحریریں اور تقریریں جامعہ کی اقدار کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اب تک تاسیس کے جشن میں ایک دن کا پروگرام بنایا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تین دن کا ایک جامع پروگرام بنایا گیا جو اس طرح ہے۔

پہلا دن۔ ۲۸ اکتوبر کو مغرب کے بعد مسٹر آصف علی بیرسٹر کی صدارت میں تعلیم بالغان کا جلسہ ہوا۔ حامد علی صاحب ندوی نے سال بھر کی رپورٹ سنائی۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر یاب صاحب نے حفظان صحت کے اصولوں پر لکچر دیا۔ ملیریا کا فلم دکھایا اور ساتھ ہی ساتھ اسے سمجھایا بھی۔

دوسرا دن ۲۹ اکتوبر کو صبح یوم تاسیس کا جلسہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کی صدارت میں ہوا۔ اسد ملتانی اور صفی لکھنوی کی دو ایک نظموں کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے سالانہ رپورٹ سنائی۔ نمائش کا افتتاح ہونے پر لوگوں نے

پروفیسر محمد مجیب

جامعہ کے رکنوں کا کام ...... دیکھا اسی دن شام کو اُردو اکادمی کی طرف سے شاندار مشاعرہ ہوا۔ دہلی کے شعراء کے علاوہ جن میں اس مرتبہ بیخود کا اضافہ ہوگیا تھا، صفی، ثاقب، ظریف، حسرت، جگر، بیدل، بھی موجود تھے۔ ہماری جامعہ کے شاعر مومن مرحوم تو انتظام میں حصہ لے ہی رہے تھے بچوں کا مشاعرہ ہوئے چند دن ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا ایک نمونہ یہاں کے اسٹیج پر بھی آ جائے۔ احمد بن سالم نے ایسے انداز میں گایا کہ لوگوں کو سکتہ کا پتہ ہی نہ چلنے دیا۔ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شاعروں نے جب داد دی تو احمد نے بھی ان کو جھک جھک کر سلام کیا۔ پھر تو بڑے شاعروں کی باری آئی اور رات کے ڈیڑھ بجے تک محفل گرم رہی۔

تیسرا دن، ۳۰ اکتوبر کی صبح کو جامعہ کے قدیم طلبہ کا جلسہ ہوا۔ قواعد و ضوابط پر نظر ثانی ہوئی۔ نئے عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ پہلے برکت علی صاحب ناظم تھے اس دفعہ حامد علی خاں صاحب مقرر ہوئے۔

شام کو بیگم انصاری کی .... صدارت میں عورتوں کا جلسہ ہوا۔ بیگم آصف علی نے جامعہ کے مقاصد پر تقریر کی اور ایک فلم بچوں کی پرورش کے بارے میں دکھائی گئی۔ آپا جان بہت خوش تھیں کہ پہلی ہی کوشش میں چار پانچ سو عورتوں نے حصہ لیا۔ انتظام کے لئے مدرسہ ابتدائی کے لڑکے تھے مرد بھی اس وقت بیکار نہ رہے ایک خاص پروگرام کے تحت اوکھلا گئے ذاکر صاحب نے جامعہ کی زمین دکھلائی، حد بندی کے لئے جھنڈیاں لگا دی گئی تھیں۔ پہلی دفعہ اس زمین پر چائے پینے میں کتنا لطف آیا۔ جامعہ کے استاد جو ہمیشہ مصیبت میں رہے ہیں انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب دیکھ رہے ہوں۔ زمین خرید لی گئی۔ یہاں چائے ہو رہی ہے!!!

ثاقب لکھنوی کئی سال سے جامعہ کے مشاعروں میں شریک ہونے کی وجہ سے

یہاں کے استادوں کی دلی حالت سے واقف ہو گئے تھے غالباً اسی اثر نے ان سے یہ شعر اسی جگہ کہلوایا۔

مکان منعم کا سونے سے یہ خون دل سے بنتا ہے ؛
خس و خاشاک کا یہ گھر بڑی مشکل سے بنتا ہے ؛

مغرب کے بعد لوٹے، کھایا پیا، رات کو جلسہ میں شرکت کی جس میں مولانا احمد سعید صاحب نے تبلایا کہ "مسلمانوں کی بھلائی مذہب کی باتوں پہ پابند رہنے سے ہے"

مکتبہ کی حالت بھی پہلے ایسی ہی تھی جیسے ۱۹۳۰ء سے پہلے چھوٹی جماعتوں کی۔ دو چار آنے کی منظوری کے لئے دفتر جامعہ سے منظوری لینی پڑتی تھی۔ حامد علی خاں صاحب مرحوم ۱۹۲۶ء میں جامعہ سے بی۔ اے۔ میں کامیاب ہونے کے بعد پہلے تو اپنا گزارہ ٹیوشن پر کرتے رہے پھر مکتبہ کے کام میں لگا دئے گئے۔ ان سے کبھی نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ کچھ نہ کچھ سوچتے گئے کرتے گئے۔ حامد صاحب جیسے الوالعزم شخص کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔

مکتبہ کی ترقی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جہاں پہلے دو تین آدمی کھٹ کھٹ کرتے نظر آتے تھے جن میں سے ایک حامد صاحب تھے وہاں اب بہت سے آدمی دن رات کام میں مصروف رہتے ہیں۔

ادارت رسالہ جامعہ نے فیصلہ کیا کہ جنوری ۳۴ء سے رسالہ نئی ترتیب سے شائع ہوا کرے یعنی سال کے بارہ پرچوں میں چار چار پرچے اسلامیات، اجتماعیات، ادبیات کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔ اس نئی تنظیم کے تحت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ادارت میں شامل کر لئے گئے۔

مہاتما گاندھی دہلی آئے ہوئے تھے، جامعہ والوں نے جب آپ کو دعوت دی تو بچوں نے ہال کو خوب سجایا۔ مہاتما جی کی خدمت میں اپنے باغ کی سبزی، کھدر اور ایک سو ایک روپے کی تھیلی پیش کی۔ مہاتما جی بچوں سے بہت بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے اور بچوں کے کھیت کی مولیاں اور کئی رنگ کے شلجم دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

دیگر مہمانوں میں ڈاکٹر بہجت وہبی، سر اکبر حیدری، نواب ذوالفقار جنگ بہادر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سر اکبر حیدری جامعہ کے خاص کرم فرماؤں میں سے تھے۔ آپ کی آمد پر بھی جلسہ ہوا، تحفتاً جامعہ کی شائع کردہ کتابیں پیش کی گئیں۔

اردو اکادمی کے اہتمام میں ڈاکٹر ذاکر صاحب نے "کساد بازاری" پر اپنا مقالہ پڑھا۔

توسیعی لکچروں کے سلسلہ میں ترکی کے مشہور عالم بہجت وہبی نے "اسلام کا عروج و زوال" پر چار تقریریں کیں۔

اِس سال محفل مباحثہ پھر گرم ہوئی۔ جلسہ کے صدر نشین کال کے مدیر جے۔ این۔ ساہنی تھے۔ دہلی کے مشہور قومی کارکن مسٹر آصف علی صاحب بیرسٹر نے تجویز پیش کی کہ موجودہ حالت میں قوم پرور جماعت کا مجالس آئین ساز کو نظر انداز کرنا، ملک اور قوم کے مفاد کے منافی ہے۔ نورالدین صاحب بیرسٹر نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب اور سید محمد صاحب ٹونکی نے تائید میں اور شفیق صاحب، فریدالحق صاحب انصاری، خواجہ احمد عباس صاحب نے مخالفت میں تقریریں کیں، صدر صاحب نے کہا ابھی اس مسئلے کا فیصلہ قبل از وقت ہے۔ ۱۹۳۵ء کا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بننے والا ہے

اسے دیکھنے کے بعد فیصلہ کرنا چاہیئے چار سو کے قریب آدمی چار گھنٹے تک تقریروں کو سنتے رہے اور آدھی رات گئے اپنے اپنے گھروں کو لوٹے ۔

یہ تو ہوا بحث سے متعلق عام جلسہ مگر ایک ایسی ہی بحث جامعہ کے استادوں میں ہو پڑی اسے ہم لوگ "تاریخی بحث" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ موضوع تھا "جامعہ اپنے مقصد سے ہٹتی جا رہی ہے"

۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پہلا جلسہ ہوا ، برکت صاحب نے تجویز پیش کرتے ہوئے تقریر کی پھر مخالفت کے لئے میری باری آئی ۔ تقریر کرنے کے لئے جوں ہی میں اٹھا احراری صاحب فرمانے لگے "قطع کلام جناب صدر" صدر ذاکر صاحب تھے کہنے لگے "فرمائیے" احراری صاحب نے کہا "آج کے موضوع پر بحث کرنا اس وقت آسان رہے گا جب یہ معلوم ہو جائے کہ جامعہ کا مقصد کیا ہے" ذاکر صاحب نے کہا کہ لوگوں کو اس کا پہلے سے علم نہیں تھا کہ موضوع اس طرح یکایک پلٹا کھلائے گا " اور میری طرف دیکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ "خیال ہے کہ جناب مخالف اس کے لئے تیار نہ ہوں گے" میں نے جھٹ سے کہا "جی ہاں بالکل تیار نہیں ہوں" اس پر احراری صاحب فرمانے لگے "میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے حاضر ہوں" صدر صاحب میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "کیا آپ اس سے متفق ہیں" میں نے کہا "بالکل متفق ہوں" پھر کیا تھا لوگوں نے تالی بجادی اور احراری صاحب نے تقریر شروع کی جس مجلس میں برکت صاحب بولیں وہاں احراری صاحب کو بولنے میں لطف آتا ہے ۔ یہ دو جلسوں میں تقریر کرتے رہے ۔ تیسرے دن بھی بولنے کے لئے تیار تھے لیکن صدر نے اجازت نہ دی ۔ ان کی تقریر سے اتنا ہوا کہ لوگوں کی دلچسپی بڑھ گئی اور یہ بات طے پائی کہ پہلے ہر ایک استاد یہ بتائے کہ وہ اپنے نزدیک جامعہ کا مقصد کیا سمجھتا ہے پھر کیا تھا تقریروں کا سلسلہ بندھ گیا جلسہ

ختم ہونے کے بعد قرعہ اندازی ہوتی تھی کہ آئندہ کون بولے گا۔ ایک جلسہ میں صرف
ایک ہی استاد کے بولنے کے لئے وقت ملتا تھا، بالترتیب سعد انصاری صاحب،
عبدالمجید صاحب زبیری، پروفیسر محمد مجیب صاحب، سعید انصاری صاحب، مولانا
فضل الرحمن صاحب، سید نذیر نیازی صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب،
سید شرف الدین صاحب، علی احمد صاحب اور سب کے آخر میں ۲۱ر دسمبر ۱۹۳۳ء
کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اپنی تقریر پر بحث کو ختم کیا گویا کم و بیش سوا دو
مہینے تک بارہ استادوں نے تقریریں کیں۔ ہر تقریر کے آخر میں ان خیالات پر گفتگو یا
بحث ہوتی تھی۔ لطف یہ ہے کہ میری تقریر کی کہیں نوبت ہی نہ آئی۔ وقت پر جلسوں
کا انتظام کرنا، لمبی لمبی روئدادیں لکھنا، ناظم صاحب کا انھیں سنانا، حاضرین کا
صبر کے ساتھ سننا۔ یہ سب کچھ برکت علی صاحب کے ذمہ تھا جو ان جلسوں کے
ناظم تھے۔

ذاکر صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا "میرے نزدیک جامعہ ایک اسلامی
ادارہ ہے جس کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم ہے۔

اس تعلیم کی بنیاد دین اسلام اور تمدن اسلام ہے۔

دین اسلام سے مراد وہ دین ہے جو غیر اللہ کی عبادت سے نجات دلاتا
ہے۔ ایک خدا کی عبادت کا پابند کرتا ہے اور اس طرح ایک عالمگیر برادری کی بنیاد
ڈالتا ہے۔

تمدن اسلام سے مراد وہ روایات ہیں جنھیں آنحضرتؐ نے نمونے کے طور پر
ہمارے لئے قائم کی ہیں۔ ماحول کی رعایت سے اس بڑے مقصد میں چند اور
مقاصد بھی شامل ہو جاتے ہیں وہ یہ ہیں۔

آزادی کی خواہش — یہ وطن کی پوجا کے لئے نہیں، بلکہ

غیراللہ سے ہٹ کر اللہ کی طرف راغب ہونے کے لئے۔

اُردو کی خدمت وہ اُردو جسے مسلمانوں کا انصاف پسند طبقہ قائم رکھنا اور پھیلانا چاہتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جامعہ کے کام کی بنیاد اسلامی تعلیمات، آزادی کی خواہش اور اُردو کی خدمت ہے۔

۱۹۳۰ء میں قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے جامعہ کا پہلا میزانیہ مرتب کرانے کی کوشش کی لیکن آمدنی کے مقابلے میں خرچ بہت زیادہ دیکھ کر بس اتنا ہی ہوا کہ ایک کمیٹی اخراجات میں کمی کرنے کے لئے مقرر کر دی گئی۔ اس سال یہ پہلا موقع تھا کہ میزانیہ کو مرتب کر کے پہلے مجلس منتظمہ میں پھر انجمن تعلیم ملی میں پیش کرنے کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی بنائی گئی اس کے اراکین حافظ فیاض احمد صاحب (داعی) مولانا خواجہ عبدالحئی صاحب، مولوی ارشاد الحق صاحب اور خاکسار تھے، صرف ضروری اخراجات کو متوازن کرنے کی کوشش کی گئی۔ بھوپال کی متوقع آمدنی وصول نہ ہو سکی۔ ایک سال گزرنے کے بعد اس کمی کو دہلی میونسپلٹی نے پورا کیا۔ تخمینہ اس طرح ہے۔ (ملاحظہ ہو اگلا صفحہ)

مجوزہ میزانیہ منظور کردہ مجلس مالیات سیشن ۳۵-۱۹۳۴ء۔

آمدنی	رقم	خرچ	رقم
۱۔ امداد حیدرآباد	۱۲۰۰۰	۱۔ ثانوی اور کالج	۳۰۰۰
۲۔ امداد ہمدردان جامعہ	۱۲۰۰۰	۲۔ اقامت گاہ	۵۵۰۰
۳۔ فیس بورڈنگ ڈے سکالر علاوہ طعام	۱۱۰۰	۳۔ مدرسہ ابتدائی	۸۰۰۰
۴۔ متوقع آمدنی از بھوپال	۶۰۰۰	۴۔ دفتر جامعہ	۵۰۰۰
۵۔ براہ راست چندے (علاوہ ہمدردان جامعہ)	۲۴۰۰	۵۔ کتب خانہ جامعہ	۳۰۰۰
		۶۔ وظائف	۲۵۰۰
۶۔ امداد از مکتبہ	۱۲۰۰	۷۔ متفرقات	۱۵۶۰
۷۔ امداد میونسپلٹی کتب خانہ	۹۰۰	۸۔ پراویڈنٹ فنڈ	۱۵۰۰
۸۔ فیس ورزش فرنیچر وغیرہ	۸۰۰	۹۔ شفاخانہ	۱۰۰۰
۹۔ مطبع جامعہ (مقررہ امداد)	۶۰۰	۱۰۔ کھیل و اسپورٹس	۶۰۰
۱۰۔ فیس داخلہ بورڈر و ڈے سکالر	۵۰۰	۱۱۔ بٹہ کھاتہ	۵۰۰
۱۱۔ غیر متوقع آمدنی	۵۰۰	۱۲۔ تعلیم بالغان پڑھانے کا کام اعزازی ہوگا یہ دام صرف متفرق اخراجات کے لئے ہیں۔	۱۰۰
۱۲۔ چندہ رکنیت کتب خانہ	۱۰۰	۱۳۔ بزم ادب غیر مقیم طلبہ	۲۰
۱۳۔ اتحادی دکان	۱۰۰		
۱۴۔ امتحانات	۱۰۰		
۱۵۔ بچوں کی دکان	۵۰		
۱۶۔ متفرق	۲۰		
میزان	۴۸۲۵۰		۴۸۲۵۰

خلاصہ۔ آمدنی اور خرچ تقریباً چار ہزار روپے ماہوار

گذشتہ قرضہ جات اس کے علاوہ تھے اس طرح ہر سال قرضوں کی رقم بڑھتی جارہی تھی۔

پندرھواں سال،

اگست ۱۹۳۴ء سے جولائی ۱۹۳۵ء

تعلیمی سال شروع ہوتے ہی مدرسہ ابتدائی میں محمد حفیظ الدین صاحب کے انتظام میں مدرسہ کے لڑکوں کی عدالت قائم ہوئی۔ نگراں مدرسہ کے پاس جو معاملے آتے، وہ بھی عدالت کے پاس بھجوا دئے جاتے، آگے چل کر اس انتظام نے "بچوں کی حکومت" قائم کر لی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

نئے داخلے ہوتے ہی حسب معمول میلاد النبیؐ کا جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کی تین خصوصیات دلچسپ اور ذکر کے قابل ہیں۔ جلسہ شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ ہر طرف ندی نالے بہنے لگے۔ بادل سر پر منڈلا رہے تھے اندھیر اگھٹا ٹوپ، لیکن آدھ گھنٹہ پہلے بارش ختم گئی تھی اس لئے لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جلسہ وقت پر شروع ہو کر رہے گا۔ آدھ گھنٹہ میں ہال کھچا کھچ بھر گیا اور جلسہ وقت پر شروع ہوا۔ مہمانوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس جلسہ میں جامعہ کا ہر ایک استاد لڑکا اور ملازم صاف ستھرے کپڑوں کے ساتھ کھدر کی سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے یہ ٹوپی نہ پہنی ہو۔ بعض اقامت گاہ والوں نے ایک طرح کی اچکنوں کا انتظام کر لیا تھا۔

لوگوں نے جب ہال کی دیواروں پر نظر ڈالی تو اب کی دفعہ سجاوٹ کسی اور انداز میں تھی یعنی ہر ایک "فریم" میں بیل بوٹوں کے درمیان قرآن شریف کی آیتیں اور ان کا ترجمہ خوش خط لکھا ہوا تھا۔ قرآن شریف میں آنحضرتؐ کی شان میں جو آیتیں کسی عنوان کے تحت نظر آئیں ان کو نقل کر لیا تھا، مثلاً آنحضرتؐ کا معلم ہونا، آپؐ کا اخلاق، آپؐ کی نرم دلی، آپؐ کا بلند مرتبہ ہونا، آپؐ کی شجاعت اور بہادری، آپؐ کی کامیابی، آپؐ کا رحمت عالم ہونا، آپؐ کا علم، آپؐ کا فقر، وغیرہ وغیرہ آیتوں کا یہ انتخاب مولانا سعد انصاری صاحب نے بڑی عقیدت اور محنت سے کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جرمنی میں اپنے دوستوں کو خط لکھ کر وہاں کے لڑکوں کا نمونہ کا کام منگوالیا تھا۔ ان میں تیسری جماعت کے لکھائی کے نمونے بھی تھے۔ بہت صاف ستھرے، دیکھنے میں خوبصورت اور بڑی محنت سے جی لگا کر لکھے گئے تھے۔ تیسری جماعت کے لڑکوں نے بھی اُردو کی لکھائی کے نمونے تیار کئے۔

مدرسہ میں "محمد علی ٹرافی" کا جشن حسب معمول ہوا۔ "محمد علی ٹرافی" کی سہ سالہ کارگزاری کی رپورٹ شائع کی گئی۔ عبدالخالق صاحب کی واپسی پر سید مجتبیٰ حسین صاحب کو موگا کی ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا۔

ہمارے ہاں کا معلومات کا نصاب، حیوانات، نباتات، معاشرت اور سائنسی معلومات پر مشتمل ہے۔ بمقصدی طریقہ سے پڑھانے میں یہ بڑی کشش کی بات ہے کہ ان عنوانات کے تحت بچوں سے کتابچے تیار کروائے جا سکتے ہیں۔ بچوں نے یہ کتابچے ضروری لوازمات کے ساتھ تیار کئے مثلاً موزوں سرورق، فہرست مضامین، تصاویر وغیرہ۔

یوم تاسیس کا موقع آیا تو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے پیام تعلیم کے

سالگرہ نمبر کے لئے بچوں کے نام پیام دیا۔ یہ ذیل میں درج ہے۔

پیارے بچو، خوش رہو اور تندرست۔

پیام تعلیم کے نکالنے والے پیچھے پڑے ہیں کہ اس پرچے میں تمہارے نام میرا پیام بھی ہونا چاہیئے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ جو آدمی تم سے روز ملتا ہو، روز تم سے باتیں کرتا ہو، تمہارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہو وہ بھلا ایک کیسے کوئی پیام دے ڈالے جو لوگ کہیں دور ہوں، کبھی کبھی تم سے ملتے ہوں، وہ کوئی پیام بھیجیں تو سمجھ میں آنے کی بات ہے مگر یہ پیام تعلیم والے ایک نہیں سنتے، انھیں تو بس پیام چاہیئے کیا کیجئے، ان کی بات ماننا ہی پڑے گی۔ اور سچ ہے کہ ان کا یہ پرچہ اور روز کے پرچوں سے ہے بھی ذرا الگ اس لئے پیام نہ سہی آؤ اس موقعے پر تم سے کچھ باتیں تو کر لوں۔

تم جانتے ہو کہ اس پرچہ میں کیا خاص بات ہے، یہ بات ہے کہ یہ ۲۹ اکتوبر کو سب پیامی بھائیوں کو ملے گا۔ چودہ برس ہوئے اسی تاریخ کو جامعہ ملیہ کا کام پہلے پہل شروع ہوا تھا۔ تم میں سے اکثر تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے بہت سے چھوٹے لڑکے جو شروع میں جامعہ آئے تھے وہ اب خدا کے فضل سے جوان ہیں۔ بہت سے دور دور کے ملکوں سے علم سیکھ کر واپس آ گئے ہیں بہت سے یہیں تعلیم ختم کر کے اپنی قوم کی خدمت کر رہے ہیں مدرسوں میں بچوں کو پڑھا کر لائق اور نیک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اچھے اچھے اخبار اور رسالے نکال کر لوگوں کو سچی خبریں دیتے ہیں اور اچھی باتیں بتاتے ہیں بعض تجارت میں روپیہ کما رہے ہیں اور اس کمائی سے دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔

یوں تو اپنے اپنے دھندے میں لگے ہیں مگر جامعہ کا دھیان سب کو ہے جامعہ ان سب کو پیاری ہے اور یہ سب جہاں بھی ہیں جامعہ کی مدد کر رہے ہیں۔

ذرا سوچو تو سہی کہ کیوں! یہ اس جامعہ کو کیوں پیار کرتے ہیں۔؟ جہاں کا کھانا انھیں پھیکا سیٹھا معلوم ہوتا تھا جہاں صبح صبح اندھیرے منہ اٹھنا، وضو کرنا اور نماز پڑھنا پھر کدال کسی کے جھاڑوں میں ورزش کے لئے میدان میں جانا انھیں کیسا کیسا کھلتا تھا۔ جہاں ان کے رہنے کو عالی شان مکان بھی نہ تھے، مدرسے میں بیٹھنے کو میز کرسیاں بھی نہیں تھیں جہاں نہ بہت آرام تھا نہ بہت ٹھاٹ یہ جامعہ انھیں کیوں اتنی پیاری ہے۔؟

اس لئے پیاری ہے کہ اس نے انھیں آدمی بنایا ان کے دل میں پاک زندگی کی لگن لگائی اور ڈرا ڈرا کر نہیں بلکہ محبت سے ان کے دل میں خدا اور رسول کی محبت ڈالی۔ ان کے سینوں میں، اپنے بھائیوں کی خدمت کا ولولہ پیدا کیا اس نے انھیں سکھایا کہ جہاں رہو، جو کچھ کرو سچائی کو ہاتھ سے نہ دو۔ اس راستے میں مشکلیں سامنے آئیں تو منہ مت موڑو۔ خود سختیاں اٹھاؤ اور دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کر دو۔ تن بدن موٹے کپڑے سے ڈھانپ لو، رُوکھا پھیکا کھا کر گزارا کر لو مگر دماغ اونچے سے اونچے خیال سوچ سکے۔ دل اچھی سے اچھی آرزوؤں سے بھرا ہو پھر یہ اس کو جتنا پیار کریں کم ہے۔

پیارے بچو جامعہ تمھیں بھی یہی سکھانا چاہتی ہے اور یقین ہے کہ تم یہ سب کچھ سیکھ جاؤ گے تو یہاں کی تکلیفیں یاد کر کے بھی مزے لو گے اور ان کی شکایت تمہاری زبان پر نہیں آنے گی۔ تم سچے ہو گے اچھے ہو گے۔ تندرست ہو گے، صاف ستھرے ہو گے۔ دیانت دار ہو گے۔ دھن کے پکے ہو گے، بروں کے لئے لوہا ہو گے اچھوں کے لئے موم۔ غریبوں کا سہارا ہو گے، بے کسوں کا آسرا۔ سوتوں کو جگاؤ گے۔ ڈوبتوں کو تراؤ گے۔ غریب ہو گے تو بھی سیر چشم۔ دوسروں کی دولت کو منہ پھیر کر نہ دیکھو گے۔ امیر ہو گے تو اپنی دولت کو خدا کی امانت

سمجھو گے اور اس کے بندوں کی سیوا میں صرف کرو گے۔ تم جہاں بھی ہو گے اپنے ساتھیوں کے لئے پڑوسیوں کے لئے، بستی کے لئے رحمت ہو گے۔

اس وقت جس کا ذکر میں کر رہا ہوں ہم سب جو اس وقت تمہارے لئے تھوڑا بہت کام کر رہے ہیں بوڑھے ہوں گے یا مر چکے ہوں گے۔ ہم جیتے ہوں یا مر گئے ہوں اگر تم اچھے ہو گے تو ہماری سب محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔

اس جامعہ کو بھی تمہیں میں سے بعض چلاتے ہوں گے اس وقت روپے کی کمی نہ ہو گی۔ کرایہ کی عمارتیں نہ ہوں گی، تعلیمی سامان کی کمی نہ ہو گی۔ کتب خانے میں نہ جانے کتنی کتابیں ہوں گی ———————— تعلیم تمہارے ہاتھ میں ہو گی، سیاست تمہارے اشارے پر چلے گی۔ رائے عامہ پر تمہارا اثر ہو گا۔ آج ہم کمزور ہیں، اس وقت تم مضبوط ہو گے انشاءاللہ۔ ہاں اس وقت یہ بات نہ بھول جانا کہ تمہاری ساری کامیابی اس لئے ہے کہ تم نے اور تمہارے اگلوں نے بے غرض خدمت کو اپنا شعار بنایا جو ٹھیک سمجھا وہ دل لگا کر کیا اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑتا۔

بات بہت بڑھ گئی۔ بس اب رخصت، جامعہ کو اور تمہیں یہ دن مبارک۔

تمہارا خیر طلب
ذاکر حسین

جامعہ کے استادوں کی دو طرح کی انجمنیں ہیں ایک تو "اسٹاف کلب" یہ تمام استادوں کے لئے ہے، اس میں اخبارات، کھیل کود کا انتظام، سیر و تفریح کا پروگرام، اور دعوتوں کی چہل پہل رہتی ہے دوسرے "انجمن اساتذہ" کے نام سے ہر منزل کے استادوں کی الگ الگ انجمنیں ہیں اس میں مدرسہ کے معاملات دستور العمل کی

تبدیلیاں، نصاب کا معاملہ، پڑھنے پڑھانے کے طریقوں پر گفتگو ہوتی رہتی ہے
اس انجمن کی حیثیت مدرسے کے کاموں میں مشورہ دینے والی جماعت کی ہے
دوسری قسم کی انجمن کی ابتدا، مدرسہ ابتدائی سے ہوئی اور اسی سال سے اس کی
کارروائیاں باقاعدہ رکھی جانے لگیں۔ ویسے بے قاعدہ طور پر ۱۹۳۰ء سے
اس کا کام شروع ہو گیا تھا۔

مدرسہ ابتدائی اپنے تجربات کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔
مشقی مدرسہ (پریکٹسنگ اسکول) کے لحاظ سے اسے جانچیں تو یہ زیر تعلیم
استادوں کے لئے بہت کچھ سیکھنے سکھانے کا مواد فراہم کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔
ادھر بعض اسلامی انجمنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں
اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ جامعہ اپنے یہاں معلموں کی تعلیم کا
مدرسہ کھولے۔ جامعہ کے پیش نظر بھی یہ کام تھا۔ تجویز ہوئی کہ استادوں کے مدرسہ کا
قیام عمل میں آئے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں اس
مدرسہ کے قیام کی اسکیم تیار کروں، ڈاکٹر صاحب نے خواجہ غلام السیدین صاحب
کو لکھا کہ وہ ایک سالہ نصاب تیار کر دیں۔ میں نے اس مدرسہ کا دستور تیار کر کے
دیدیا جس میں مدرسہ کا نام، مقصد، انتظام، نصاب کا خاکہ، داخلہ، امتحانات،
اور ضروری معلومات دی تھیں یہاں تک کہ ایک نظام اوقات (ٹائم ٹیبل)
بھی منسلک کر دیا جس میں ڈاکٹر ذاکر صاحب کے نام مطالعۂ فطرت اطفال، ڈاکٹر
عابد صاحب کے ذمے اصول تعلیم، اپنے ذمے طریقۂ تعلیم اور عبدالواحد صاحب کے
نام باغبانی رکھی۔ اگلے سال سے اس کا افتتاح ہونے والا تھا لیکن پھر یہ فیصلہ کیا
گیا کہ سعید انصاری صاحب کی واپسی تک یہ معاملہ ملتوی کر دیا جائے جو تعلیم کی
تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ گئے ہوئے تھے۔

اسی سال مدرسہ ابتدائی کی نگرانی سے میں سبکدوش ہوگیا۔ میری بجائے جامعہ کے ایک ہونہار سابق طالب علم اکبر علی صاحب چودھری (بی۔ اے۔ جامعہ) مدرسہ کے نگراں ہوئے۔ آپ کے زمانے میں جن مزید باتوں کا اضافہ ہوا اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۹۲۹ء میں جامعہ نے یہ طے کیا تھا کہ وہ جامعہ کے کاموں کو منزل بہ منزل آگے بڑھائے گی، مدرسہ ابتدائی کی طرف سے اطمینان ہوگیا تھا۔ مدرسہ ثانوی کی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ اس مدرسہ کا صدر مدرس عملہ، جماعتیں، ایک علیحدہ نظام کے تحت کر دی گئیں۔ اس میں ثانوی اول سے چہارم تک کی جماعتیں تھیں، اس کے صدر مدرس ارشاد الحق صاحب مقرر ہوئے آپ خاکسار منزل (چھوٹے بچوں کی اقامت گاہ) کے اتالیق بھی تھے، آپ کی خوش سلیقگی اور اچھے سلوک سے لڑکے خوش تھے۔ ارشاد صاحب کے رکھ رکھاؤ نفاست کا اثر مدرسہ اور اقامت گاہ میں نمایاں نظر آتا تھا۔ خاکسار منزل کی چمن بندی۔ تنظیم نفاست کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھے کہ بے سروسامانی کی حالت میں نمونے کی اقامت گاہ بن سکتی تھے۔ یہ سب بچے مدرسہ ابتدائی میں تعلیم پا رہے تھے، مدرسہ روز افزوں ترقی کر رہا تھا، ارشاد صاحب کے اس معیار نے مدرسہ اور اقامت گاہ میں بڑی یکسانیت پیدا کر دی تھی۔ پھر بچوں کی تربیت جس ڈھنگ سے ہوئی تھے یہ بھی ایک معیاری کام تھا۔ ۱۹۴۲ء سے مسلسل ۱۲ سال تک ارشاد صاحب نے مسجلی کا کام بڑے استقلال سے کیا۔ آپ کے مشوروں سے جامعہ کو مدد ملی تھے۔

اب ایک بہت بڑی خوشی کی بات سنئے:۔

یکم مارچ ۱۹۳۵ء شہر دہلی سے ۸ میل دور جمنا کے کنارے جہاں سے نہر جمن غربی نکلتی ہے، پر فضا مقام پر جو اوکھلے کے نام سے مشہور ہے۔ جامعہ کی عمارتیں

کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ جامعہ کے استادوں نے اس تقریب کو منا کر ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس لئے کہ تنخواہیں وقت پر ملتی نہیں تھیں۔ اس تقریب کا مطلب یہ تھا کہ مزید تکلیفیں اٹھا کر ان عمارتوں کو کھڑا کریں۔ مولانا اسلم صاحب کی ایک نظم جلسہ میں پڑھی گئی تھی اس کا ہر لفظ دل سے نکلا تھا اور دل میں بیٹھ گیا تھا، جامعہ کے استادوں نے اپنے لئے یہ شعر یاد رکھ لیا ے

عشرت شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو،
وہ مزا جو کوہکن کی سعئ بے حاصل میں ہے۔

رسالہ جامعہ کے مدیر نے اپنے شذرات میں اس تقریب کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔

"خدا کا شکر ہے کہ یکم مارچ کو سنگ بنیاد نصب کرنے کی رسم بھی ادا کر دی گئی جلسہ دہلی شہر سے نو دس میل کے فاصلے پر تھا۔ دن جمعہ کا تھا جب حکومت کے دفتروں اور مدرسوں میں تعطیل نہیں ہوتی۔ وقت تین بجے سہ پہر کا تھا جو مارچ میں بھی خاصا گرم ہوتا ہے کسی کو امید نہ تھی کہ شہر کے لوگوں میں سے تین چار سو سے زیادہ لوگ آسکیں گے مگر جذب محبت نے اپنا اثر دکھایا اور ایک ہزار سے زیادہ اشخاص جن میں شہر کے امیر و غریب، ہندو مسلمان، ارباب علم، ارباب ہنر، ارباب حکومت، ارباب دولت، اور وہ لوگ جو علم و ہنر، حکومت و دولت سے محروم ہیں مگر ایمان، خلوص اور جوش سے خالی نہیں۔ موٹروں میں لاریوں میں تانگوں میں سائیکلوں پر سوار ہو کر پہنچ گئے۔ جلسہ کی کارروائی قرآن مجید کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ مولانا اسلم جے راجپوری کی ایک نظم پڑھی گئی جس کا ہر لفظ دل سے نکلا تھا۔

لے مولانا نے یہ "سعی بے حاصل" کوہکن کی رعایت سے لکھی ہے ورنہ جامعہ کے استادوں نے یہ تقریب "سعی مشکور" کو سامنے رکھ کر منائی تھی۔

اور دل میں بیٹھ گیا، شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے تقریر کی جس میں سچائی تھی. درد میں ڈوبی ہوئی، جوش تھا، متانت میں سمویا ہوا، عزم تھا، عجز میں ملا ہوا۔ جامعہ کی مختصر تاریخ تھی، بانیان جامعہ کی یاد تھی اہل جامعہ کو نصیحت تھی، ہمدردان جامعہ کا شکریہ تھا. تقریر اخباروں میں شائع ہو چکی ہے اس کا اثر دلوں میں محفوظ ہے اور رہے گا۔ سننے والوں کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جوش گلو گیر تھا۔ امیر جامعہ نے جن الفاظ میں جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کا ذکر کیا وہ کسی افسر نے اپنے ماتحتوں کے متعلق کم کہے ہوں گے اعتراف قدر دانی، ہمت افزائی، محبت، شفقت کے یہ کلمے ملک وملت کے ایک قائد جلیل کی زبان سے نکل رہے تھے۔ اور جامعہ والے ادب، نیاز، ندامت، مسرت، فخر کے جذبات دل میں لئے سر جھکائے سن رہے تھے۔ خالدہ ادیب خانم، جامعہ کی، ملت اسلامی کی، ہندوستان کی، محترم مہمان نے ایک مختصر سے خطبہ میں حس لیے اندازہ ہو گیا کہ کمال خطابت کمال خلوص کے ساتھ مل کر کس طرح انسان کے کلام میں کلیمی شان پیدا کر دیتا ہے. جامعہ کے مستقبل کی وہ تصویر دکھائی کہ تصویر میں مشاہدہ کا لطف آ گیا اور سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔

قائدین ملک وملت کی ہمدردی کے پیام پڑھے گئے. مہاتما گاندھی، سر محمد اقبال مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر بھگوان داس کی مبارکباد اور دعائیں۔ اسمبلی کے کل مسلمان ممبروں کی اپیل دوسرے بزرگوں کی تہنیت و تبریک آخر میں چندوں کا اعلان شروع ہوا جن کی میزان چالیس ہزار تک پہنچی۔ اس کے علاوہ پچاس ہزار کی مالیت کے ایک وقف کی خوشخبری سنائی گئی۔ آغاز اچھا ہوا انجام خدا کے ہاتھ ہے جلسے کے ختم ہوتے ہی سارا مجمع اس جگہ پہنچ گیا جہاں سنگِ بنیاد رکھا جانے والا تھا۔ جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے عبدالعزیز نے چند اور بچوں کی مدد سے

جو قریب قریب اسی کی عمر کے تھے اس مبارک رسم کو انجام دیا۔ خدا اس معصوم بچے کی برکت سے جامعہ کی عمارت کو اور اس کے مقاصد کو تکمیل کے درجے تک پہنچائے اور اسے اور اس کے ننھے رفیقوں کو دین و دنیا میں کامیاب کرے۔ جامعہ کی حقیقی بنیاد یہی بچے ہیں۔ اور اس کی اصلی عمارت ان کی زندگی ہے۔

اس رسم کے پورا ہونے کے بعد سب مہمانوں نے چائے نوش فرمائی اور ان چند ساعتوں کا گہرا اثر دل پر لئے ہوئے رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن ۲ر مارچ کو سہ پہر کے وقت جامعہ کے کھیل کے میدان میں ورزشی کھیلوں کا مقابلہ ہوا جس میں سب سے مزے کی چیز اساتذہ کی دوڑ تھی۔ تمام اساتذہ نے جن میں علمائے کرام، حضرت شیخ الجامعہ اور بڑے بڑے ثقہ حضرات شامل تھے۔ ہمت کا احرام باندھ کر مقابلے کی سعی فرمائی حسب معمول بلکہ حسب دستور جناب شیخ الجامعہ مقابلے میں اول رہے۔ خالدہ ادیب خانم صاحبہ نے انعامات تقسیم کئے اور مغرب کے وقت یہ دلچسپ تقریب ختم ہوئی۔

شب کو ساڑھے آٹھ بجے جامعہ کا سالانہ مشاعرہ شروع ہوا۔ اس مشاعرہ نے ہندوستان کے ادبی جلسوں میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی تھی۔ وہ استادان فن جنھوں نے اب مشاعروں کی شرکت قریب قریب ترک کر دی ہے۔ محض جامعہ کی محبت میں دور دراز سفر کی زحمت گوارا کر کے تشریف لائے ہیں اور ان لوگوں کو جو حق کی تلاش، علم کی سنگلاخ زمینوں میں کیا کرتے ہیں، چمنستان شعر میں جلوۂ حقیقت دکھلاتے ہیں۔ اس سال لکھنؤ سے حضرت صفی، حضرت ظریف حضرت ثاقب تشریف لائے حضرت آرزو مشاعرے کے وقت نہ پہنچ سکے۔ دوسرے دن صبح کو پہنچے اور کئی روز قیام فرما رہے جضرت جگر مراد آبادی، الہ آباد میں حضرت اصغر گونڈوی کی عیادت اور تیمارداری میں مصروف تھے۔ دونوں کو جامعہ سے

قلبی تعلق ہے۔ یہاں سے دعوت کا پہنچنا تھا کہ بیمار نے تیماردار کو خود اصرار کرکے بھیجا۔ دہلی سے حضرت مومن ٹونکی استاد جامعہ اور جامعہ کے تمام کرم فرما حضرت ساحر حضرت اکبر، حضرت عشرت، ڈاکٹر سعید احمد صاحب، حضرت حیرت شملوی، حضرت حفیظ فرخ آبادی اور دوسرے ارباب سخن موجود تھے۔ حاضرین کی تعداد اس سال ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی مگر ان کے حسن ذوق اور جامعہ کے حسن انتظام کی بدولت ذرا بے ترتیبی نہیں ہونے پائی۔ پانچ گھنٹے تک لوگ نہایت ذوق و شوق سے مشاعرے کا لطف اٹھاتے رہے۔ بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو مشاعرہ میں اول سے آخر تک موجود رہیں اور حاضرین کے اصرار پر انھوں نے اپنی ایک انگریزی نظم سے بھی محظوظ کیا۔ اس میں اسمائے باری تعالیٰ بڑی خوبی سے تضمین کئے گئے ہیں۔ جناب شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی طبیعت کی ناسازی کے باوجود صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ سب لوگ متفق ہیں کہ اس سال مشاعرہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔

۳ مارچ کو عورتوں کا جلسہ محترمہ بیگم محمد علی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تقریباً سو خواتین تشریف لائیں تھیں۔ صدر صاحبہ اور بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنی تقریروں میں جامعہ کے مقاصد بیان کئے اور عمارت کے لئے چندے کی اپیل کی بیگم عبداللہ ہارون نے لیڈیز کانفرنس کے حالات سنائے۔ اس کے بعد چندوں کا اعلان شروع ہوا۔ کل چار سو کی یکمشت رقم اور کچھ ماہانہ چندوں کے وعدے ہوئے۔ دو ایک خواتین نے اپنے کچھ زیور بھی چندے میں دئے۔

اس کے علاوہ قدیم طلباء کا جلسہ مدرسے کے لڑکوں کا تقریری مقابلہ اور مشاعرے کی کئی صحبتیں ہوئیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ تین چار روز تک جامعہ کے اکثر اساتذہ اور طلباء دن رات مصروف رہے۔ ان کو جو مشقت اور زحمت اٹھانی پڑی وہ سب وصول ہو گئی۔ اس لئے کہ تمام تقریبیں باوجود

ہماری خامیوں کے خیر و خوبی سے انجام پاگئیں اور سب مہمان باوجود ہماری کوتاہیوں کے خوش رہے اور خوش گئے۔

جامعہ اور شہر کے لوگوں کو اوکھلے تک پہنچانے کا انتظام میرے اور عبدالحیٔ صاحب کے سپرد تھا۔ کوئی ایک ہزار سواریوں کا انتظام کرنا تھا (ریل سے جانے والے یا اپنی سواریوں پر جانے والوں کی گنتی علیحدہ ہے) ہم نے بھی بیس پچیس لاریاں کرائے پر لے لی تھیں، مختلف مقاموں سے لاریوں کے روانہ ہونے کے اوقات مقرر کر دئے تھے۔ میں اور شفیع صاحب گھوم کر یہ دیکھا کرتے تھے کہ لاریاں وقت کی پابندی کا خیال رکھتی ہیں یا نہیں، لوگوں کو تکلیف تو نہیں ہے، اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ جامعہ کے تمام استاد اور لڑکے قرول باغ سے اوکھلا پہنچ گئے تھے۔ بچے کچھے لوگوں کو جامعہ سے لے جانے کا وقت جلسے سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب صبح سے کاموں میں مصروف تھے۔ اس وجہ سے ان کے کپڑے کچھ میلے ہو گئے تھے۔ یہ آخری لاری میں جانے والے تھے روانگی سے آدھ گھنٹہ پہلے لاری کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ روانگی کا وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے مگر غسل کرنے اور کپڑے بدلنے میں ممکن ہے پانچ دس منٹ اوپر ہو جائیں۔ میرے پاس موٹر تو ہے نہیں۔ بس آپ ہی کی لاری جلسے میں مجھے وقت پر پہنچا سکتی ہے،" آگے کچھ کہنے سے پہلے میں نے مسکرا کر فوراً ہی کہا "گاڑیوں کے آنے جانے میں دیر بھی ہو جایا کرتی ہے آپ اطمینان سے تشریف لائیے۔ اگر روانہ ہونے میں دیر بھی ہو گئی تو راستے میں کسر نکال لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے احتیاطاً ایسا کہا تھا ورنہ مقررہ وقت سے دو تین منٹ پہلے ہی کپڑے بدل کر آگئے تھے۔ دہلی سے اوکھلا لاری کے ذریعہ آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے اس طرح جلسہ شروع ہونے سے آدھ گھنٹہ پہلے آخری لاری بھی پہنچ گئی۔

اس تقریب میں جامعہ کے بیشتر استاد کسی نہ کسی کام میں لگے ہوئے تھے ان کی رہنمائی میں رضاکارڈ کے کام کر رہے تھے۔

سنگ بنیاد کے رکھے جانے کے بعد شفیق الرحمٰن صاحب ناظم ہمدرد جامعہ نے ایک ایسی اسکیم بنائی کہ ملک کے ہر ضلع سے ایک ہزار روپے یکمشت اور ۲۵ روپے ماہوار کی امداد حاصل کی جائے چنانچہ اسی اسکیم کے تحت کئی وفد بھیجے گئے۔

حسب معمول اردو اکادمی کے انتظام میں اس سال بھی توسیعی لکچر ہوئے۔ امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اسلامی ملکوں سے مشاہیر کو بلا کر جامعہ میں توسیعی لکچر دلوانے کا سلسلہ شروع کیا تو اس سلسلہ کے پہلے لکچر ترکی کی مشہور قومی کارکن خالدہ ادیب خانم نے دیئے، مشہور عالم ہونے کے علاوہ آپ معلمہ اور سیاسی کارکن بھی تھیں آپ نے آٹھ لکچر دیئے۔

پہلے جلسے میں مشرق و مغرب کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد ترکوں کی ابتدائی حالت بیان کی گئی اس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے۔

دوسرے جلسے میں بادشاہی نظام لوٹنے کا ذکر تھا۔ صدر مہاتما گاندھی تھے۔

تیسرے جلسے میں نوجوان ترکوں کی حکومت دکھائی گئی تھی صدر جلسہ مولانا شوکت علی تھے۔

چوتھے جلسے میں خلافت کا خاتمہ، نئی حکومت اور مذہب کا معاملہ تھا سید سلیمان صاحب ندوی صدر بنائے گئے۔

پانچویں جلسے میں ترکی ادب، شاعری پر بحث تھی ڈاکٹر اقبال نے جلسے کی صدارت فرمائی۔

چھٹے جلسے میں آج کل کے حالات بیان کئے گئے بھولا بھائی ڈیسائی صدر جلسہ تھے۔

ساتویں جلسے میں ترک عورتوں کا ذکر تھا۔ مسز سروجنی نائیڈو جلسے کی صدر تھیں۔

آٹھویں یعنی آخری جلسے میں عورتوں کا باقی بیان اور آئندہ کی امیدوں پر کچھ کہا گیا تھا۔ مشہور صوفی عالم ڈاکٹر بھگوان داس صدر تھے۔

ان جلسوں میں تعلیم یافتہ ہندو مسلمان، عیسائی، انگریز، مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہوئے تھے۔ ان بڑے جلسوں کا انتظام حسب معمول حفیظ الدین صاحب کی نگرانی میں کالج اور ثانوی کے لڑکوں نے کیا تھا۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان جلسوں کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ناظم اُردو اکادمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی علمیت اور آپ کے ادبی ذوق سے لوگ واقف ہیں، آپ اپنے فن کے ماہر اساتذہ میں سے ہیں۔

۲۲ مارچ کو ہمیں ایک صدمہ برداشت کرنا پڑا یعنی یہ خبر آئی کہ تصدق احمد خاں صاحب شیروانی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم ایک زمانے میں جامعہ کے معتمد رہ چکے تھے اس کے کاموں سے دلچسپی اور محبت تھی۔ قوم پرست رہنما کی حیثیت سے آپ نے اپنی زندگی ملک و قوم کے لئے وقف کردی تھی۔ زمانہ بدلتا گیا۔ لوگ بدلتے گئے مگر آپ کے قومی اصول نہ بدلے۔ اسی لئے بلا لحاظ مذہب سارے ملک میں ماتم ہوا، جامعہ کے استادوں اور لڑکوں نے بھی جلسہ کیا۔ کلام مجید کی تلاوت اور فاتحہ خوانی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے طلبا کو خطاب کرکے مرحوم کی زندگی کے حالات مختصراً بتلائے اور آپ کے اوصاف بیان کئے۔ یعنی یہ کہ مرحوم خلوص، جوش، سادگی، ایثار، حق گوئی، حق پسندی بے خوفی، بہادری کا نمونہ تھے۔

گذشتہ سال بہار میں اور اس سال کوئٹہ میں جو زلزلے آئے ان کی تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے جامعہ نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سشن سے دس یتیم اور لاوارث بچوں کی مکمل تعلیم و تربیت کا مع خورد و نوش وہ اپنے ذمے لے گی۔ چنانچہ کسی ایک استاد سے

خاص طور پر وابستہ کر دیا جائے گا تاکہ بیرونی سرپرست کی حیثیت سے وہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔

اس سال ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء سے، دہلی میونسپلٹی نے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد مقرر کر دی۔ اس کے علاوہ مرکزی کتب خانے کے اخراجات کے لئے ۲۴-۱۹۲۳ء کے سشن میں سو روپے ماہوار اور بعد کے سالوں کے لئے ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔

سولھواں سال

اگست ۱۹۳۵ء سے جولائی ۱۹۳۶ء

مدرسہ ابتدائی کی اقامت گاہوں کا انتظام اب تک براہ راست شیخ الجامعہ کے پاس تھا اب یہ نگران مدرسہ کے تحت آگئیں، بیچ کی اقامت گاہ میں ابتدائی اور ثانوی کے لڑکے ملے جلے رہتے تھے۔ انھیں بھی کسی ایک طرف کر دیا گیا۔ اقامت گاہوں کی تقسیم جماعتوں کے لحاظ سے کر دی گئی۔ جو استاد جس جماعت کو پڑھلیا کرتا وہی اس اقامت گاہ کا اتالیق بنا دیا گیا اس سے استاد اور لڑکے دونوں کو کاموں کے نبٹانے میں سہولت ہوگئی اور مل جل کر کام کرنے کے موقعے پیدا ہو گئے۔

ہر ایک اقامت گاہ میں دو اتالیق رکھے گئے۔ ایک کے ذمے تعلیم کی نگرانی بچوں کی انجمن اور تفریحی مجالس۔ حسابات عام باتیں تھیں، دوسرے کے ذمے نماز، صحت و صفائی۔ ورزش اور کھیل، مطبخ کی ذمہ داری تھی۔

ہر ایک طالب علم کے سرہانے اس کی ماہانہ تعلیمی کیفیت اور وزن کا چارٹ لگا ہوا تھا۔

جمعرات کو جلسے ہوتے۔ اس کا پروگرام مدرسہ کے کاموں سے تعلق رکھتا مثلاً پروجیکٹ کے زمانے میں اس جماعت کی طرف سے حصہ لینے والوں کی تقریریں

ہوتیں۔ مزید تفریح کے لئے گانے کی محفل ہوتی۔ قصے کہانیوں کا دور چلتا۔

سید مجتبیٰ حسین صاحب موگا سے واپس آگئے تھے۔ ان کی جگہ جامعہ کے ایک طالب علم عبدالغفور صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

اس سال ایسا بھی ہوا کہ ایک اقامت گاہ میں "شب برات" کے جلسے کا پروگرام صبح کی نماز کے بعد رکھا گیا تھا۔ لڑکوں نے صبح کی نماز کے بعد قرآن سے تھوڑا، تھوڑا حصہ سنایا۔ ایک ایک سورت زبانی سنائی۔ دینیات کے نصاب سے متعلق ہر ایک لڑکے نے ایک ایک سوال کا جواب دیا۔ چند نظمیں بھی سنائی گئیں۔ ان میں ایک تو مولانا حالی کی نظم "اے سب سے اول اور آخر" تھی اور دوسرا ترانہ "اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی" تھا۔

ہمارے جلسوں کا سماں بعض دفعہ کیسی صورت اختیار کر لیتا، اس کا اندازہ اس خط سے لگائیے۔

بہار شو فیکٹری
بیری والا باغ دہلی
۲۴ نومبر ۱۹۳۵ء

مکرمی نادالطافکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

مزاج گرامی، کئی ماہ کا عرصہ ہوا کہ ایک روز صبح صادق کے وقت میں نیم بیداری کی حالت میں تھا کہ ایک گداگر کچھ گاتا ہوا چلا گیا جس کے ٹیپ کا بند تھا "اٹھ جاگ مسافر" لیکن وہ جاہل تھا اس کے الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر میں تڑپ کر رہ گیا اور اس خیال میں رہا کہ وہ نظم مل جائے۔ آج میں آپ کے مدرسہ کے ایک جلسہ میں شرکت کے لئے حاضر ہوا تھا۔ جامعہ کے بچوں نے اس نظم کو گایا۔ میں گیا تھا لطف اٹھانے کے لئے مگر جلسہ برخاست ہونے سے پہلے ہی بیتاب چلا آیا۔ اب آپ سے گذارش ہے کہ وہ نظم نقل کرا کے روانہ کر دیجئے۔ مشکور ہوں گا۔ والسلام (دستخط مولانا) نورالدین بہاری
(رکن جمعیۃ علماء ہند)

اس سال بنک اور دکان کے کام میں ایک اور انقلاب دیکھنے میں آیا وہ یہ کہ جامعہ میں اعلان کیا گیا کہ بنک کی تحویل ایک ہزار ہونے پر اوکھلے میں (اس وقت ہم قرول باغ میں تھے) خاص جشن منایا جائے گا لوگوں کے اعتبار کا یہ حال تھا کہ ایک مہینے کے اندر تحویل گیارہ سو ہوگئی۔ سوائے دو تین آدمیوں کے جامعہ میں شاید ہی کوئی ملازم، لڑکا، استاد، پروفیسر، ایسا ہو جس نے بنک میں حساب نہ کھلوایا ہو۔ مہمانوں کے کھانے کی نصف رقم مطبخ نے دی تھی اور نصف بنک نے۔ چار سو آدمیوں کے لانے لے جانے کا انتظام بنک کی طرف سے تھا۔ بیس لاریاں کرائے پر لی گئی تھیں اور ان کے میں نام تجویز کر کے تمام لاریوں پر لگا دیئے گئے تھے، ہر ایک لاری میں بیٹھنے والوں کے نام اسی لاری پر آویزاں کر دیئے گئے تھے۔ اور لوگوں کو وقت کی اطلاع دیدی گئی تھی کہ فلاں مقام سے اتنے بج کر اتنے منٹ پر آپ کی گاڑی روانہ ہوگی۔ لوگ ریل گاڑی کے اوقات کی طرح پہلے سے بھر جاتے تھے۔ دس منٹ پہلے ٹنن ٹنن گھنٹی بجتی اور ٹھیک وقت پر "فرّ فرّ فرّ" کے ساتھ لاری روانہ ہو جاتی۔ ہر ایک لاری پر ایک استاد اور ایک لڑکا نگرانی کا کام کر رہا تھا۔ ان دنوں اوکھلے میں جامعہ کی عمارت بن رہی تھی۔ آخری لاری پہنچنے سے پہلے لوگوں نے گھوم پھر کر عمارت کا کام دیکھا۔ سردیوں کا زمانہ تھا (۳۰ر جنوری ۳۶ء) ساڑھے نو بجے آخری لاری پہنچی، بنک کا جلسہ ہوا۔ صدر جلسہ پروفیسر محمد مجیب صاحب تھے۔ نئے قوانین منظور ہوئے۔ جلسہ کے بعد جامعہ کے استادوں اور لڑکوں میں کرکٹ کا شاندار میچ ہوا۔ کھیل کے بعد کھانا کھایا۔ شیرمال اور قورمہ بڑے اہتمام سے پکوایا تھا پروگرام ہی ایسا تھا کہ باوجود ڈٹ کر کھانے کے سب ہضم ہوگیا یعنی دریا (جمنا) پر گئے اور ظہر کی نماز کے بعد ہی کبڈی کھیلی۔ اپنے طور پر بھی لڑکے کود پھاند میں لگے رہے۔ جادوگر کا تماشہ ہوا، خوب مزے مزے کے دلچسپ اور حیرت

میں ڈرانے والے کھیل ہوئے۔ عصر کی نماز کے بعد قوالی ہوئی۔ چائے کا دور چلا۔ مغرب کا وقت آگیا۔ نماز پڑھی۔ پھر اپنی اپنی مقررہ لاریوں میں بیٹھ کر قرول باغ واپس آئے۔ دس میل کے آنے جانے۔ صبح سے شام تک کے پروگرام میں چار سو آدمیوں کے حصّہ لینے کے باوجود کہیں بھی کسی قسم کی گڑبڑ یا تکلیف نہ ہونے پائی۔ بات یہ تھی کہ سب لوگوں کو اچھی طرح سے یہ بات سمجھا دی گئی تھی کہ جیسے جیسے جس کام کے لئے گھنٹی بجتی جائے۔ لوگ اسی میں حصّہ لیا کریں۔ ملازم لڑکے استاد سب گھنٹی کی تعمیل کرتے تھے۔

....

.... بلاشبہہ بنک کا یہ جشن "تاریخی جشن" میں شمار ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق پیام تعلیم کے مدیر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس کے صرف چند جملے یہاں درج ہیں۔

"یہ سارا دن کچھ ایسی دلچسپی میں گذرا کہ ہمیشہ یاد رہے گا اتنا بڑا تفریحی جلسہ جس میں اتنی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ جامعہ میں کبھی نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ اس ننھے منّے بنک کی بدولت ہوا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ایسی مسرّتیں اس بنک کو نصیب ہوا کریں۔"

اس دفعہ قومی ہفتہ کے جلسے میں ثانوی کے طلباء نے ایک سلسلہ میں مضامین پڑھے۔ ان میں ہندوستان کی تاریخ کی خاص باتیں سلسلہ وار سامنے آتی ہیں۔ ہندوؤں آریوں کے عہد سے پہلے کا عہد، مسلمانوں کا عہد، انگریزوں کا عہد، یہ اس سلسلہ کے عنوانات تھے۔ آخر میں شفیع الدین صاحب نیرؔ کی لکھی ہوئی "حمد" ترانہ کے طور پر پڑھی گئی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے۔

اپریل میں جامعہ کے ورزشی کھیلوں کا مقابلہ ہوا، اسمبلی کے صدر سر عبدالرحیم نے انعامات تقسیم کئے۔

کھیل کا میدان آراستہ تھا. مہمانوں کے لئے شامیانے لگے تھے. مجمع میں امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری، مولانا شوکت علی، بیگم محمد علی، مسز کیلے، بوٹا پیٹ کے مفتی، چودھری خلیق الزماں، حاجی محمد ابراہیم، مسٹر غلام محمد، نواب نذیر الدین نمایاں نظر آ رہے تھے۔ مہمانوں کے لئے چائے اور پھلوں کا انتظام تھا۔

سب سے دلچسپ مقابلہ لڑکوں اور استادوں میں رسہ کشی کا تھا بھاری بھرکم استاد تو رسے کے ساتھ بندھ گئے۔ باقی استادوں نے زور لگانا شروع کیا۔ لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی مگر رسے میں بندھے ہوئے استادوں کی وجہ سے " زمیں جنبد نہ جنبد ......" والا معاملہ تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب نے بھی پرانے طالب علم کی حیثیت سے لڑکوں کی طرف سے بہت زور لگایا مگر سب کے سب ادھڑ رہے اور " زانوئے شاگردی" تہ کر کے بیٹھ گئے۔ استادوں کے کپتان مولانا شرف الدین صاحب نے اچھا سا انعام پایا۔

انعامات تقسیم کرنے کے بعد سر عبدالرحیم نے مختصر تقریر میں فرمایا کہ :-

" کھیلوں میں بچوں کی تربیت دیکھ کر مسرت آمیز تعجب ہوا۔ مجھے جامعہ کی جو چیزیں سب سے زیادہ متاثر کرتی رہیں وہ یہاں کے استادوں کا ایثار اور بے غرض خدمت ہے جامعہ نے ایک نمونے کی تعلیم گاہ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کر لی ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ ملک میں اس کی تقلید کی جائے گی

پروفیسر ای ۔ جے ۔ کیلاٹ صاحب کی کوششوں سے اسپورٹس کے مظاہرے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوا کرتے تھے۔ کیلاٹ صاحب اپنے شاگردوں کی تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے طرح طرح سے جسم کو بنائے رکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ کڑاکے کی سردی ہو یا گرمی یا برسات کی بوندا باندی، ہر موسم میں صبح صبح ورزش کے میدان میں بڑی پابندی سے آپ موجود رہتے تھے۔ یہی حال شام کے

تکمیل کا تھا۔ آپ کے اس نمایاں کردار کا اثر شاگردوں میں نظر آتا تھا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی آمد پر اوکھلا میں بڑے پیمانے پر دعوت دی گئی تھی۔ آپ کے ساتھ ڈاکٹر سر اکبر حیدری نواب صدر نواز جنگ بہادر، نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر محکمہ سیاست و تعلیمات، جناب نجف علی خاں صاحب پولیٹیکل سکریٹری، سید محمد مہدی صاحب سکریٹری، . . . . نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سال جامعہ کو دو حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جامعہ کے ایک طالب علم محمود بہاری کچھ دن بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہوئے، محمود جامعہ کے بہت ہونہار اور ہر دلعزیز طالب علموں میں سے تھے۔ ان کی یادگار میں "محمود بہاری کیرم ٹورنامنٹ" منزل ثانوی میں ہر سال ہوتا ہے۔

دوسرا حادثہ یہ تھا۔ ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء کی صبح آناً فاناً یہ خبر جامعہ میں پھیل گئی کہ امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری کا انتقال ہو گیا۔ جامعہ کی نئی بستی (اوکھلا) میں سپرد خاک ہوئے، اسی دن شام کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے لوگوں کو مخاطب کیا۔ ذاکر صاحب کے مخاطب بچے بھی تھے۔ دل سے نکلی ہوئی باتوں میں باوجود سادگی کے بڑا زور اور اثر ہوتا ہے، یہ تقریر یہاں درج ہے۔

" کل رات کو کوئی ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد انصاری دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آرہے تھے کہ راستے میں دل کی حرکت بند ہو گئی اور یہ بے شمار کاموں اور ان گنت قدر دانوں کو اس دیس کو جس کی خاطر انھوں نے ہر طرح سختیاں جھیلیں۔ ان مسلمانوں کو جن کی خدمت میں ساری عمر گزار کر ان کا برا ہی سنا۔ ان ہندو مسلمانوں کو جن میں میل ملاپ اور محبت

پیدا کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کیا۔ ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا۔ اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ کر ان کا خون چُلّوؤں بڑھتا تھا اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگی میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں۔ ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو، دوستوں کو سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا۔ اس وقت دیس کے ہر بچے بچے کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ چشمہ اپنے، پرائے سب کے لئے بہتا تھا۔ ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام آتا تھا۔ ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں پر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دن سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا اس لئے کہ وہ نیک تھے سچے تھے مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے۔ ان کی سوجھ بوجھ، تدبّر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں کو ان کا گرویدہ بنایا لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس وقت ان سب کی نظروں میں ان کی پریم بھری آنکھیں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا، پھر سوچیے کہ

اس سانحہ سے ان لوگوں کے دل پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح خاص ان کے سائے میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لئے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی چھپن (۵۶) سال کے تھے۔ ان کے لئے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے پھولتے دیکھتے اور جب وہ نہ مٹنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت، کچھ وصیت کر کے اطمینان سے آنکھیں موند لیتے۔ پھر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا اور ہوتا تو وہی ہے جو اسے منظور ہو۔ وہ اکیلے چل دئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری رضؓ کی اولاد ہیں جن کے گھر میں مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے قافلے کے سردار نے جا کر قیام فرمایا تھا۔ اس وقت جب مخالف اس حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے بجھا دینا چاہتے تھے پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی راحت پائی اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہمان نوازی، فیاضی اس خاندان کا حصہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۸۹۶ء سے جب انھوں نے اپنے وطن کا مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس گئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور

ان وظیفوں سے اکثر چھپ چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب انھوں نے دہلی میں فتحپوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لئے اپنی پریکٹس چھوڑ دی۔ گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو ہاتھ خالی، پھر پریکٹس شروع کر دی۔ ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا۔ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو اپنا موٹر بیچ کر جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا۔ اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم جھجکے ہوں۔ وہ کون سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا، نہ دن چین سے گزرتے تھے اور نہ راتیں۔ ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھتا جاتا تھا اور ہمت تھی کہ مہمیز لگائے جاتی تھی۔

۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا پر اس سکون میں وہ اور بھی بے چین تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت، شہرت اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے ان کا ذکر اس وقت کیا کروں۔ انھوں نے اس پاک طینت، نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا۔ ہمیں سب کو، ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے

سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں۔ اس کے لئے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلے گی اسی کام کی خاطر، ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت ۱۹۲۷ء میں منظور کر لی۔ اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی۔ اس لئے کہ ملک کا رنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لئے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایسے آدمیوں کی جو اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں انھیں برتیں۔ انھیں ترقی دیں تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں خود مضبوط ہوں اور دوسروں کی مضبوطی سے ڈریں نہیں۔ مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی ہمت بھی رکھتے ہوں، مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جا کر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے وہ اس آرزو کو بھی پورا کر سکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس مدرسے کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا۔ اس کے کام کرنے والوں سے کوئی آ آ کر شرما شرما کر یہ نہ کہے گا کہ میں تمہارے لئے کچھ کام نہیں کر سکا تم سے آنکھیں ملانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آ کر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں پر اس دکھی دل کا دکھ نہیں یاد رہے گا اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کچھ کرائے گا بھی، ہمارا کام بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزار دولتیں ملیں گی پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔
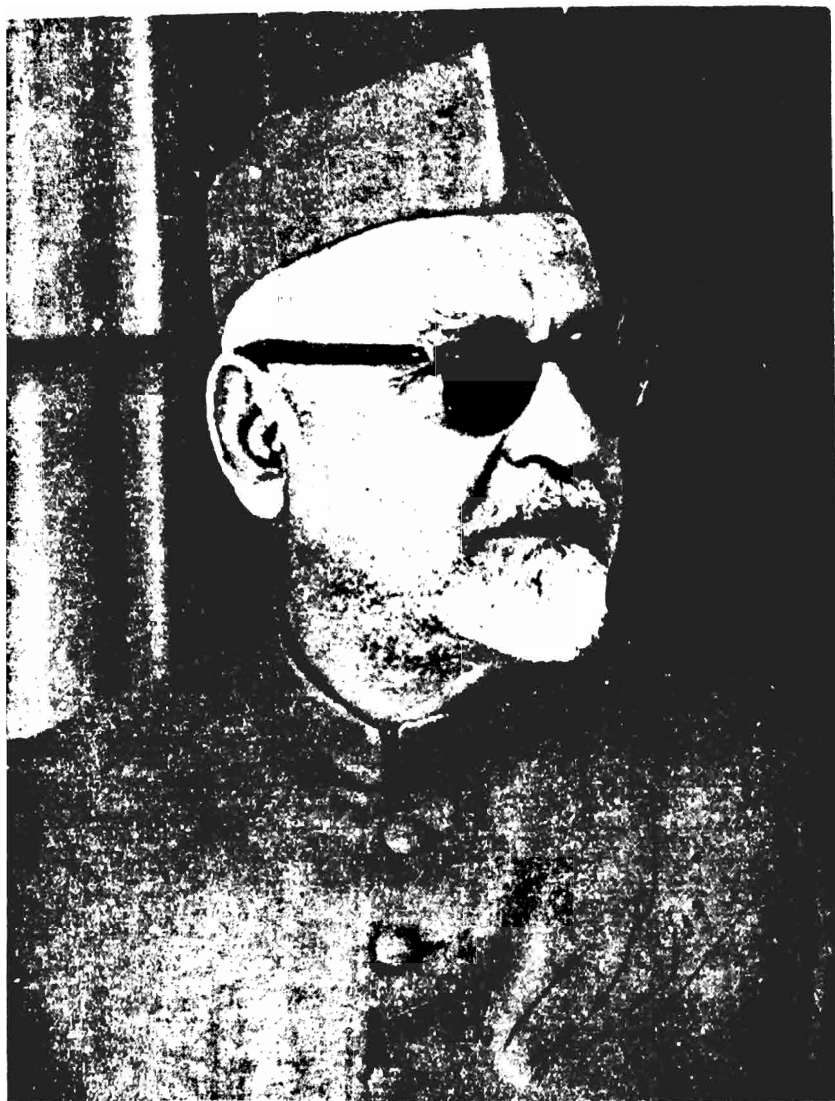
ڈاکٹر ذاکر حسینؒ

اسی سال پیام تعلیم کے تاسیس نمبر کے لئے ڈاکٹر انصاری ...... نے بچوں کے نام ایک پیام دیا تھا کسے معلوم تھا کہ انصاری کا یہ پیام بچوں کے لئے آخری پیام ہوگا۔ ایک ہی بات کہی مگر کیسے تپے کی بات کہی کہ اس سے بہت سی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر انصاری کا پیام بچوں کے نام :-

سالہا سال سے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس پر کاربند ہوئے تو تمہارا ذہن پوری طرح نشو و نما پائے گا اور تم بڑے ہو کر اچھے آدمی بنو گے۔ تمہاری سیرت پر ایسے پردے نہیں پڑیں گے جو اس کی اصلیت کو چھپائیں اور وہ نصیحت یہ ہے کہ تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ، اپنے کمرہ میں ہو یا مدرسہ میں یا کھیل کے میدان میں ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ مچ تمہارا من چاہتا ہے اپنی اصل دلی خواہشوں کو دباؤ مت دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقال نہ کرو۔ خود اپنی اپج سے کام کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہارا ذہن، تمہاری سیرت، تمہارا جسم سب کے سب وہ اچھی سے اچھی شکل اختیار کریں گے جس کے حاصل کرنے کی صلاحیت و قدرت ان میں رکھی گئی ہے ۔

یہ طے ہو گیا تھا کہ اگست سے جامعہ کا مدرسہ ابتدائی اوکھلے کی نئی عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔ عمارت ابھی نامکمل تھی لیکن سب کی یہی رائے تھی کہ منتقل ہو جانا چاہیئے۔ کرائے کی عمارتوں میں رہتے رہتے اکتا گئے تھے۔ پھر کرائے کے نام سے ایک معقول رقم ہر مہینے ادا کرنی پڑتی تھی۔ اوکھلے میں جو عمارت بن رہی تھی وہ اصل تجویز کے مطابق مدرسہ ابتدائی کی ایک اقامت گاہ ہے جس میں پچیس لڑکے بہت آرام اور سہولت سے رہ سکتے ہیں۔ اس لئے اس ایک عمارت میں مدرسہ ابتدائی کا سمانا ناممکن تھا لیکن نقشہ کی بناوٹ اور ...بی ایسی ہے کہ ضرورت پڑنے پر اس سے

دگنے لڑکے یعنی ڈیڑھ سو کی تعداد رہ سکتی ہے۔ مدرسہ ابتدائی میں (پہلی جماعت سے
چھٹی جماعت تک) اتنے ہی مقیم طلبار کے داخلے کی توقع تھی۔ جماعتوں کے لئے یہ طے
کیا کہ جھونپڑے بنا کر گزارہ کریں گے۔

اکبر علی صاحب نگراں مدرسہ عبدالغفور صاحب مدرس، عبدالحمید صاحب (باغبانی
کے استاد) چھٹیاں شروع ہوتے ہی اس عمارت میں منتقل ہو گئے تھے۔ تاکہ باقی دو مہینے
اپنی نگرانی میں زیادہ سے زیادہ کام کرا سکیں۔ عمارت اتنی تیار ہو چکی تھی کہ اگست سے
ابتدائی کام چلا سکیں۔ یعنی داخلے کرنا اور چار پائیاں ڈالے پڑے رہنا۔ ایک
مہینے کا نقصان گوارا تھا مگر یہ گوارا نہیں تھا کہ منتقل کا خیال چھوڑ دیں۔ حافظ فیاض
احمد صاحب (مہتمم جامعہ) خواجہ لطیف حسین صاحب (انجینئر) ڈاکٹر ذاکر حسین
خاں صاحب (شیخ الجامعہ) کی کوششیں بڑھ گئی تھیں۔ دوران سال میں کسی نہ کسی
بہانے سے ہر دوسرے تیسرے دن ذاکر صاحب اوکھلے چلے آتے تھے۔ گفتگو میں اگر
کوئی ساتھی اوکھلا چلنے کا ذکر کرے تو یہ بہت خوش ہوتے جیسے عید کی نماز پڑھنے کے
لئے اوکھلا جا رہے ہیں، کبھی تانگہ پر، ریل میں، موٹر میں جیسا موقع ملتا چلے آتے۔ ہاں عید
کی سی خوشی کیوں نہ ہو، اپنی عمارت بن رہی تھی۔ وہ عمارت جہاں سے نئی پود تیار
ہو کر سارے ہندوستان میں پھیلے گی۔ بڑھے گی۔ تناور درخت کی طرح جہاں ایک
طرف پھل دے گی تو دوسری طرف حادثات کا مقابلہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہے گی
مگر اپنے اصولوں کو ہاتھ سے نہ جانے دے گی۔ وہ اصول کیا ہیں۔ ایک مسلمان کی
حیثیت سے صحیح راستے پر چلنا، ارادے، فکر اور عمل کی آزادی، آزاد ہندوستان
میں ہندو مسلمانوں کا مل جل کر رہنا۔ ہاں ان اصولوں کی عمارت کا ایک معمار ذاکر
حسین خاں ہے اس معمار کو فخر ہے کہ اس کے ساتھی سرکاری ذہنیت سے الگ
ایک "خاندان" کا خیال رکھتے ہیں اس لئے جامعہ کے لوگوں کے کاموں کا حساب

کتاب ہی دوسرے انداز پر ہے۔

حافظ فیاض احمد صاحب سجل جامعہ، علی گڈھ کی نوکری چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ اگر جامعہ کی کوئی شکل مان لیں تو اس میں حافظ صاحب کا چہرہ نظر آئیگا۔ جامعہ کا کام ایک طرح کا تو ہے نہیں جو لوگ بار بار اسٹیج پر آتے ہیں انھیں دیکھ دیکھ کر یہ خیال کرنا کہ یہی لوگ جامعہ کے چلانے والے ہیں غلط ہے۔ حافظ صاحب اسٹیج کے پیچھے رہ کر کام کرنے والوں میں تھے۔ جامعہ کے لین دین کے معاملات چکانا، کارو باری لوگوں سے نبٹنا۔ عدالتی کارروائی، دفتری انتظامات، یہ سب چیزیں وقت اور محنت چاہتی ہیں۔ یہاں گھنٹوں اور منٹوں کا حساب نہیں ہوتا ہے ہیں نے خود دیکھا ہے کہ سارا سارا دن بھوکے رہ کر حافظ صاحب نے عدالتی کارروائیوں کو مکمل کیا تھے۔ لاکھوں روپیہ حافظ صاحب کے ہاتھوں سے نکلا مگر ہمیشہ "آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک" کا معاملہ رہا، غبن اسی کو نہیں کہتے ہیں کہ آدمی کی نیت خراب ہو۔ میرے نزدیک، یہ چیز بھی غبن میں داخل ہے کہ آدمی کی لاپروائی۔ بے فکری اور غیر ذمہ داری سے حسابات میں گڑبڑ ہو جائے دیانت داری کے لئے محض نیت کا اچھا ہونا کافی نہیں ہے جب تک دوسری باتیں موجود نہ ہوں، حافظ صاحب ان سب خوبیوں کے حامل تھے۔ جب عمارت کا کام شروع ہوا تو سال بھر تک حافظ صاحب کے پیر میں ایک چکر تھا۔ دہلی سے اوکھلا اوکھلا سے دہلی۔ اگر جسمانی تکلیف ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ جامعہ کے معمار فقط جامعہ ہی میں ہیں۔ جامعہ کے باہر بھی اس کے بہت سے معمار ہیں جو اپنی اپنی بساط کے موافق کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں یا کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جب عمارت کا کام شروع ہوا تو اس کی نگرانی کے لئے انجینئر کی ضرورت تھی۔ بھلا بیچاری جامعہ ہزاروں روپے خرچ کر کے انجینئر کہاں سے

رکھتی، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خواجہ لطیف حسن صاحب پانی پتی نے اپنی اعزازی خدمات پیش کر دیں۔ خواجہ صاحب بڑھاپے کے باوجود گھنٹوں چل پھر کر کام کی جانچ پڑتال کرتے تھے۔ اسٹیشن اوکھلا سے عمارت تک جو ایک میل کا فاصلہ ہے پیدل چل کر آیا کرتے تھے۔ کرائے کی معمولی رقم کا بوجھ بھی جامعہ پر ڈالنا گوارا نہ تھا۔
خواجہ صاحب کے دل میں جامعہ کا درد جامعہ والوں سے کچھ کم نہ تھا۔

سترھواں سال

اگست ۱۹۳۶ء سے جولائی ۱۹۳۷ء

آئیے اب اوکھلے چلیں لیکن آئندہ سے ہم اوکھلے کی بجائے "جامعہ نگر"
کہا کریں گے جب کوئی شخص بستی بساتا ہے تو اس کا اچھا سا نام بھی رکھا جاتا ہے
کئی نام تجویز ہوئے ایک صاحب نے کہا "حکیم اجمل خاں صاحب (مرحوم) کے
نام پر "اجمل نگر" ہونا چاہیئے لیکن "جامعہ نگر" نام پڑھنے پڑھانے کے خیال کو ظاہر
کرتا ہے اسی مقصد سے یہ بستی بسائی جا رہی ہے اس لئے سب کی یہی رائے ہوئی
کہ "جامعہ نگر" نام رکھا جائے۔

منتقلی کے وقت مدرسہ ابتدائی کے طلباء دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان میں سے
مقیم طلباء تو جامعہ نگر بھیج دئے گئے اور غیر مقیم طلباء قرول باغ ہی میں رکھے گئے۔ شہر
والوں کے لئے اس مدرسہ کی ضرورت بھی تھی۔ جامعہ نگر کے مدرسہ کو جامعہ کا "مرکزی
ابتدائی مدرسہ" قرار دیا گیا اور قرول باغ کے مدرسہ کو شاخ کی حیثیت قرار دے کر
اس کا نام تعلیمی مرکز ملا" رکھا اس کے نگراں جامعہ کے سابق طالب علم سید احمد علی
صاحب آزاد مقرر ہوئے۔ جامعہ کے دوسرے شعبے بدستور قرول باغ میں کام کرنے
لگے۔ ابھی ان کی منتقلی کا سوال ہی نہ تھا۔

جامعہ نگر کی یہ پہلی عمارت نامکمل تھی۔ برآمدوں کے فرش بن رہے تھے۔ آنے جانے میں رکاوٹ تھی، ترائی ہو رہی تھی۔ کوئی چیز کمرے میں بچھا نہیں سکتے تھے کیونکہ کمروں میں فرش پڑ رہے تھے۔ لڑکے اتنا جانتے تھے کہ یہ "ہمارا کمرہ ہے" مگر رہتے کہیں اور تھے ساری عمارت میں دروازے اور کھڑکیوں کا نام و نشان نہ تھا۔ جہاں تہاں اینٹوں اور ملبوں کا ڈھیر تھا۔ میدان ناہموار تھے۔ عارضی طور پر "محمد علی ہال" بھی نہیں بنا تھا۔ پاخانے بھی نہیں تھے، صبح صبح جنگلوں میں ضرورت سے فراغت کے لئے چلے جاتے۔

بچوں میں یہی تو ایک بڑی خوبی کی بات ہے کہ وہ اگلی پچھلی فکروں سے دور جو کچھ ہو رہا ہے اس میں اپنی دلچسپیاں ڈھونڈھ لیتے ہیں۔ مدرسہ ابتدائی کے استاد بھی ان ہی کے ساتھ رہ کر اس بات کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لئے اس بے سروسامانی میں بھی لطف پیدا کر لیتے۔ اینٹوں کے ڈھیر سے سائے کا کام لے کر فائدہ اٹھایا مثلاً کوئی استاد اپنا حساب کتاب لے کر دہیں بیٹھ جاتا۔ جس کا زمانہ تھا کمروں کی ترائی کو یہ سمجھتے رہے کہ خس کی ٹٹیوں پر چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ زینوں کی ریلنگ نہیں تھی۔ یہ سمجھتے رہے کہ پہاڑ پر چڑھنے کی مشق کر رہے ہیں۔ رشید احمد صاحب صدیقی نے اس زمانے میں کئی مضمون دہلی ریڈیو پر سنائے ہیں مثلاً "سیلاب کے آنے پر" "دبا کے آنے پر" "حادثہ پیش آنے پر" وغیرہ وغیرہ اگر رشید صاحب ہمارے ساتھ ہوتے تو انھیں ایک اور موضوع مل جاتا یعنی "بنتی ہوئی عمارت میں رہنے سہنے پر" ہم لوگ اگر مصیبتوں کی طرف دھیان دیتے تو چند دن رہنا مشکل ہو جاتا۔ دماغ بگڑتا ہی رہتا۔ مردہ دلی اور زندہ دلی میں یہی فرق ہے۔ مدرسہ ابتدائی کے من چلے استادوں اور لڑکوں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کریں گے مگر کرائے کی عمارتوں میں نہیں رہیں گے ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنی بات کو نبھانے کے لئے وہ کسی سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اس سال مطبخ کی تنظیم ایک خاص چیز ہے چونکہ جامعہ نگر میں از سر نو ہر ایک کام کو

ٹھیک ٹھاک کرنے کا موقع ملا تھا، اس کی ابتدا مطبخ سے ہوئی۔ ہر ایک ملازم کے لئے کھانا پکانے کے کپڑے نئے بنوا کر دئے گئے۔ نیکر، کرتے، ایپرن (سفید چغے) وغیرہ۔ اکبر صاحب (مرحوم) نگران مدرسہ، کھانے پینے میں بڑا سلیقہ رکھتے تھے۔ آپ کی پسند کے مطابق بچوں کے لئے خاص طرح کے برتن خریدے گئے۔

کھانے کے پروگرام میں ایک وقت گوشت اور ایک وقت سبزی لازمی رکھی۔ پروگرام موسم کے لحاظ سے بازار میں سبزیوں کے لحاظ سے بنایا جاتا تھا۔ افطار و سحر میں خاص اہتمام ہوتا۔ ورائٹی میں دلچسپی کے لئے جرمن کھانا، پشاوری کھانا، دکن کی دعوت وغیرہ کے عنوان سے پروگرام ہوتے تھے۔ کھانے کی لذت کے لئے احمد باورچی کا نام ضامن تھا، منشی محمد خاں صاحب کا ناپ تول اسے متوازن کر دیتا تھا، منور اور رشید بھی احمد کے ساتھیوں میں تھے۔ بعد میں ہیڈ باورچی کی ذمہ داری مشتاق کے سپرد ہوئی، جنھوں نے اس معیار میں اضافہ کر دیا۔ اس موقع پر یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ بچوں سے کھانے کی جو فیس وصول کی جاتی تھی وہ سب بچوں کے کھانے پر خرچ کر دی جاتی تھی۔ جامعہ کی مالی حالت سے اس کا خاص تعلق نہ تھا یعنی جامعہ میں روپے پیسوں کی کمی کا بچوں کے کھانے پر کسی قسم کا اثر نہ پڑتا تھا بلکہ جامعہ خود مقروض ہو کر خاص رقم اپنے میزانیئے سے بچوں کے کھانے پر خرچ کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ معمول کی ورائٹی کے علاوہ "عید ڈنر" سرما گرما کے "الوداعی ڈنر" تہواروں پر خاص پکوان، اس قسم کے پروگرام پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ ان دنوں مطبخ کا انتظام میرے ذمہ تھا، اکبر صاحب کے کھانے کا ذوق، حفیظ صاحب کے سلیقے نے مجھے مجبور کیا کہ اس سال "عید ڈنر" کی تقریب بڑے سلیقے اور نمونے کی منانی چاہیئے تاکہ جنگل میں منگل کا لطف آجائے قرول باغ سے اساتذہ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ دعوت نامے کے تین حصے کر کے (۱) دعوت نامہ (۲) آداب تقریب۔ (۳) عید مبارک کے نیچے نظیر اکبر آبادی کے چند مزاحیہ اشعار

چھپوا کر ہر ایک لڑکے اور استاد کے پاس بھجوا دیئے تھے چونکہ اس میں قطار نمبر اور نشست نمبر بھی درج تھا اس لئے اوّل اور دوم والوں کے پاس بھی نام بنام دعوت نامے بھیجے گئے تاکہ یہ داخلے کے وقت ٹکٹ کا کام دیں اور اپنی نشست کا نمبر دیکھ کر بیٹھیں، کاغذ کے تین حصّے اس طرح کئے گئے تھے کہ اسے تین حصوں میں موڑنے سے چھوٹی سی کتاب دکھائی دیتی تھی یہ اسی ترتیب سے درج ہیں۔

پہلا صفحہ (خط)

مطبخ جامعہ نگر دہلی   بسم اللہ

۲۲ر فروری ۱۹۳۷ء

۸ر ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ

جناب محترم السلام علیکم

عید کے دوسرے روز ۸ بجے رات کو مطبخ کے ہال میں جامعہ کے سب لوگ ایک جگہ کھانا کھائیں گے۔

جناب سے درخواست ہے کہ کرم فرما کر ممنون کیجئے۔

ناظم طعام

بخدمت شریف جناب ....

دوسرا صفحہ (آداب تقریب)

۱۔ پوشاک۔

۱۔ عید کے منتخب لباس کے ساتھ کھدر کی سفید ٹوپی۔

۲۔ شمامۃ العنبر (عطر) کے لئے ایک رومال

۲۔ داخلہ۔

ا۔ گھنٹی بجنے پر آپ کا داخلہ مشرقی دروازے سے ہوگا۔

۲۔ آپ ہال میں قطار نمبر .... نشست نمبر ....
پر تشریف رکھیں گے۔

۳۔ جناب شیخ الجامعہ صاحب، اساتذہ کے ساتھ داخل ہوں گے۔
حاضرین کھڑے ہو جائیں گے۔

۳۔ بیٹھنے پر۔

۱۔ رومال معطر کئے جائیں گے۔

۲۔ کھانا سر منتظم کے اِذن بسم اللہ پر شروع ہوگا۔

۳۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ اپنا ہاتھ اٹھائیں گے۔

۴۔ کھانے کے بعد۔

۱۔ عید کی نظمیں۔ ۲۔ شکریہ۔

(شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر الوداعی ڈنر پر ہوا کرتی ہے۔ اس کی
تفصیل آگے آئے گی۔)

۳۔ واپسی اسی دروازے سے ہو گی جہاں سامنے کے حصے میں ہاتھ دھونے
کا سامان رکھا ہے۔

تیسرا صفحہ (عید مبارک)

جس جا پہ ہانڈی چولھا تواا ور تنور ہے
خالق کی قدرتوں کا اسی جا ظہور ہے
چولھے کے آگے آنچ جو جلتی حضور ہے
جتنے میں نور سب میں یہی خاص نور ہے

اس نور کے سبب نظر آتی ہیں روٹیاں۔

(نظیر اکبر آبادی)

محمد شفیع الدین نیر نے بچوں کے لئے نظموں کی دو اچھی سی کتابیں "بچوں کا تحفہ" کے نام سے لکھی ہیں نظمیں ہر موضوع پر ہیں اس لئے جو تقریب بھی ہو بچے اس تحفہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس "عید ڈنر" پر صبوح الدین متعلم پنجم نے نیر صاحب کی نظم "عید کا چاند" گائی تھی۔

موسم سرما یا گرما کی چھٹیوں سے پہلے الوداعی ڈنر کے موقع پر شیخ الجامعہ صاحب تقریر کیا کرتے ہیں۔ اس سال کے موسم سرما کے الوداعی ڈنر کی تقریر یہاں درج ہے

"عزیزو۔ تم آج کئی مہینے کے بعد اپنے گھروں کو جانے کی تیاری کر رہے ہو وہاں اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور عزیز و اقارب سے ملو گے کوئی اپنی ننھی بہن کے لئے کھلونا خرید کر لایا ہوگا۔ کوئی بھائی کے لئے مکتبہ سے کتابیں لے جا رہا ہوگا۔ تمہیں گھر جانے کی یہ خوشی مبارک ہو، خدا کرے گھر پر سب کو خیریت سے خوش اور تندرست پاؤ۔ ہر محنت کے بعد کچھ آرام ضروری ہوتا ہے اس لئے تم کو بھی کئی مہینے کی محنت کے بعد یہ آرام ملنا ہی چاہیئے مگر تمہاری محنت کچھ اس قسم کی ہے کہ اس کا آرام اور محنتوں کے آرام کی طرح نہیں ہوگا۔ اور آراموں میں تو پہلے کا کام بند ہو جاتا ہے اس آرام میں وہ کام جاری رہتا ہے اس لئے کہ تعلیم کا کام واقعی کبھی بند نہیں ہوتا۔ کبھی بیج بونے کا کام ہوتا ہے تو کبھی فصل کاٹنے کا۔ تم گھر جا رہے ہو تو اس آرام اور تعطیل کے زمانے میں تمہیں اس پانچ مہینے کے کام کا پھل اپنے عزیزوں کو دکھانا ہوگا۔ وہ تم سے کہیں گے نہیں مگر تمہاری بات چیت کو غور سے سنیں گے تمہاری چال ڈھال کو غور سے دیکھیں گے اگر تم پہلے سے زیادہ تمیزدار سمجھدار معلوم ہو گے تو ان کا جی خوش ہوگا۔ اگر تم پہلے ہی کی طرح پاؤ گے تو وہ سمجھیں گے کہ تم نے اتنے دن یہاں بیکار ہی کاٹے۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے عزیزوں کو مایوس

نہ کرو گے۔ تمہارے استادوں کی محنت کا بھی سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ تم اپنے گھر پر جا کر ثابت کر سکو کہ تم پہلے سے بہتر لڑکے بن کر آئے ہو، تم نے اس مدرسہ میں صاف رہنے کا سبق سیکھا ہے۔ گھر پر بھی صاف رہنا۔ تم نے یہاں وقت پہ اٹھنے، وقت پہ سونے، وقت پہ کھانے، وقت پر کام کرنے، وقت پر نماز پڑھنے کا سبق سیکھا ہے اسے گھر پہ بھول نہ جانا۔ تم نے یہاں آپس میں مل جل کر رہنے اور کام کرنے کا سبق سیکھا۔ گھر پہ اپنے بھائی بہن سے لڑ جھگڑ کر یہ نہ ثابت کرنا کہ تم یہاں سے نکلتے ہی اس سبق کو بھول گئے۔ تم نے یہاں اپنے بڑوں کا ادب کرنا سیکھا ہے۔ گھر پہ اپنے بزرگوں اور سرپرستوں کا اسی طرح ادب کرنا۔ اگر تم یہ سب سبق یاد رکھو گے تو جامعہ کے اچھے بچے سمجھے جاؤ گے۔ تمہارے مدرسہ کی نیک نامی ہو گی اور یہ وہ بن سکے گا جو ہم تم سب مل کر اسے بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی ہندوستان میں بچوں کا سب سے اچھا مدرسہ جس پر ہم کو تم کو بھی ناز ہو۔ جس پر ہماری قوم بھی فخر کر سکے۔ بس خدا حافظ۔ تمہیں یہ سفر مبارک ہو۔"

آئیے اب مدرسہ چلیں، یہ ہال میں مجمع کیسا ؟ معلوم ہوا کہ بنک و دکان کا ساتواں سالانہ جلسہ ہو رہا ہے، رپورٹ تو بہت ساری ہو چکی، وہی حصہ سن لیں جو اس سال سے متعلق ہے۔

"حضرات! بنک کا ساتواں سال شروع ہونے کے چار ماہ بعد ہم لوگ یہاں جامعہ نگر میں منتقل ہوئے۔ ضرورت تھی کہ تعلیمی مرکز نمبر (۱) اور جامعہ نگر دونوں میں یہ شعبے قائم رہیں اس لئے بنک اور دکان کا سرمایہ دو برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ بنک کے اراکین جہاں جہاں رہ گئے ہیں وہیں ان کی رقمیں بھیج دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتی ملکیت کی تقسیم میں ہر ایک مدرسہ کو

ڈیڑھ ڈیڑھ سو کا مال ملا، اسی طرح ہر ایک کے ذمے سو سو کا قرض بھی واجب الادا کیا گیا۔"

جامعہ کے جو ادارے شہر میں رہ گئے تھے، ان کے کارکن اس جلسے میں مدعو تھے۔ کھانے کا انتظام تو بنک دکان اور مطبخ کی طرف سے ہوا تھا اور قرول باغ سے آنے کے لئے لاریوں کے دام سب نے خوشی سے ادا کئے تھے، منزل ثانوی اور اعلیٰ کے مطبخ سے ان لڑکوں کی جنس لے لی گئی تھی۔ اس طرح کسی پر بھی بار نہ پڑا اور ایک مشترکہ جشن ہو گیا۔

آیئے ایک جماعت بھی دیکھ لیں۔ دیواروں پر چارٹ لگے ہوئے ہیں جماعت کے کسی لڑکے سے پوچھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے، مگر دوسری جماعت کا لڑکا اس کا جواب کس طرح دے گا، فکر کی بات نہیں۔ اس مدرسہ میں رواج ہی ایسا ہے کہ لڑکے مہمانوں کو اپنا کام آپ سمجھا لیتے ہیں۔ یہ لڑکے مہمانوں سے ڈرتے نہیں ہیں البتہ ان کی تعظیم کرتے ہیں ادب سے پیش آتے ہیں۔

"اچھا صاحبزادے یہ دیوار پر لگے ہوئے چارٹ کیسے ہیں۔؟" سلیمان مشہود چارٹ کے قریب جاکر چارٹ دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"دیکھئے اس چارٹ کے تین حصے ہیں۔ ہر ایک حصہ کاپی کے برابر ہے ایک حصے میں اوپر لکھا ہوا ہے "اردو املا" دوسرے میں لکھا ہے "ہمارے مضمون۔ تیسرے میں لکھا ہے "حساب" ہر مہینے کے آخر میں ان تینوں چیزوں کا کام نمونے کے طور پر لگا دیا جاتا ہے۔ ہمیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اگست میں کیسے تھے، ستمبر میں کیسے رہے اور اب کیا حال ہے۔ یہ دیکھئے اگست میں املا کی بہت ساری غلطیاں ہوتی تھیں مگر اب بہت کم ہوتی ہیں۔ یہ رہا میرا پہلا مضمون اور یہ رہا اس مہینے کا اور یہ حساب دیکھئے۔ اگست کا کام دیکھ کر مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے۔"

اس سال معائنے کی کمیٹی نے بھی جو خواجہ غلام السیدین صاحب خواجہ عبدالحق صاحب، پروفیسر محمد عاقل صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پر مشتمل تھی۔ اس قسم کے کام کو پسند کیا ہے۔

اسی سال "محمد علی ٹرافی" میں یہ تبدیلی ہوئی کہ تحریر و تقریر کے ساتھ ساتھ جسمانی کھیلوں کا مقابلہ بھی شامل کر لیا گیا۔ اس تبدیلی کے لئے نگران مدرسہ نے عبدالغفور صاحب کو چنا۔ انتخاب موزوں تھا۔ پڑھنے پڑھانے کے ساتھ ساتھ غفور صاحب کھیلوں میں بھی عملی حصہ لیتے ہیں، بچوں کے کردار کو سمجھتے ہیں، اس سے انہیں پڑھائی میں مدد ملتی ہے۔

اس جلسہ میں جناب این۔ آر۔ ملکانی صاحب مہتمم ہریجن بستی (دہلی) نے انعامات تقسیم کئے۔ آپ نے فرمایا:-

"تم ابھی چھوٹے ہو۔ تمہیں کھیلنے کا حق ہے خوب کھیلو، کودو اور خوب تقریریں کرو لیکن ایک بات ہے جب بڑے ہو جاؤ تو پھر کم بولنا اور زیادہ سوچنا اور جتنا سوچا اس سے زیادہ کام کرنا۔ کام سے میری مراد خدمت ہے۔ کس کی خدمت؟ یہ تم جانتے ہو۔"

شہر سے دور ہونے کی وجہ سے بچوں کو پھلوں کے حاصل کرنے میں دشواری ہوتی تھی اس ضرورت نے "خوانچہ" کے شعبے کا اضافہ کیا، اس شعبے کو بنک چلاتا ہے۔ مگر اس کا انتظام ایک علیحدہ جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اس طرح بنک کو اپنی رقم کسی کاروبار میں لگانے کا اچھا ذریعہ ہاتھ آگیا ہے۔ خوانچہ کے "منصوبہ" میں طلباً پھلوں اور ترکاریوں سے متعلق اپنے نصاب کو پورا کرتے ہیں۔ ڈرائنگ بناتے ہیں حساب کتاب کرتے ہیں لین دین سیکھتے ہیں۔ کھیلوں کے مقابلے، عیدین کے جلسوں کے موقعوں پر اشیاء ادھر ادھر گھوم کر بیچتے ہیں عیب نہیں سمجھتے ہیں دوکان سجاتے ہیں۔

جس جگہ بستی بسائی جائے وہاں میونسپلٹی نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے خاص کر ایسی حالت میں کہ چھٹی جماعت کے "معلومات عامہ" کے نصاب میں "میونسپلٹی کا کام" موجود ہے۔ حفیظ صاحب کو چھٹی جماعت میں اس "منصوبہ" کو چلانے کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ لڑکوں سے جامعہ نگر کی پیمائش کروائی میونسپل حدود مقرر کروائیں، آبادی کو مختلف حلقوں میں تقسیم کیا۔ رائے دہندوں کی فہرست بنوائی۔ رائے دینے کی شرائط کا اعلان ہوا۔ امیدواری کی درخواستیں منگوائی گئیں۔ پولنگ اسٹیشن قائم ہوئے، انتخاب عمل میں لایا گیا۔ صفائی اور روشنی کی نگرانی ہونے لگی۔ راستوں اور سڑکوں کے لئے نگراں صاحب مدرسہ کو توجہ دلائی گئی۔ میونسپل حدود میں پیشاب کرنے والوں پر مقدمے چلائے گئے۔ آگے چل کر یہ بچوں کی حکومت کا حصہ بنا دیا گیا۔

دیواروں پر لکھنے والوں کا خیال رکھا گیا۔ راستے میں کاغذ بکھیرنے والوں کی خبر لی گئی۔ ہندوستان کے مشہور رہنما خان عبدالغفار خاں صاحب کی خدمت میں میونسپلٹی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ خان صاحب بہت سے سپاسنامے لیتے رہے ہیں لیکن مدرسہ ابتدائی کے بچوں کا سپاسنامہ غالباً زندگی میں پہلی بار لیا ہوگا۔

کسی تہوار کی چھٹی میں چہارم کے طلباء سید مجتبےٰ حسین صاحب کی نگرانی میں آگرے کے سفر پر گئے تھے۔ تعلیمی استفادہ تو ہوا ہوگا مگر چاندنی رات میں تاج سے باہر آنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

آیئے پھر قرول باغ (دہلی) چلیں کیونکہ مدرسہ ابتدائی کے علاوہ باقی تمام تعلیمی انتظامی ادارے فی الحال وہیں ہیں۔

تعلیمی مرکز نمبر ا کے نگراں احمد علی صاحب پروجکٹ طریقے کے بہت حامی ہیں، آپ کا یہ خیال ہے کہ استاد میں امنگ ہو تو اس طریقہ سے وہ تمام مضامین کی تعلیم دے سکتا ہے۔ ہاں حساب میں مزید مشق کے لئے اسے علیحدہ سے انتظام کرنا ہوگا۔ آپ نے

اس مدرسہ میں سال بہ سال کئی پروجکٹ چلائے۔ احمد علی صاحب کے نباتات پروجکٹ کا حال "ایک شاہد نے اس طرح لکھا ہے :۔

" مدرسہ کا دروازہ آج عنوان جلسہ کی مناسبت سے سبزیوں ہی سے تیار کیا گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ہندوستان کے نقشہ پر نظر پڑی۔ یہ زمین پر بنا ہوا تھا اور بنانے میں ملک کے صحیح طول و عرض، سطح کی پستی و بلندی، دریاؤں کے رخ اور مقامات کی صحت کا خیال رکھا گیا تھا۔ سلسلۂ کوہ ہمالیہ میں مان سرودر جھیل اور پہاڑ کی مشہور چوٹیاں خوب بنائی گئی تھیں۔ اس نقشہ کا مقصد ملک کی نباتات کو ظاہر کرنا تھا۔ صحن مدرسہ میں چاروں طرف مختلف قسم کے پھولوں اور سبزیوں کیاریاں تھیں۔ ایک طرف متعدد پھلوں اور پھولوں کے بیج رکھے ہوتے تھے، دوسری طرف چھوٹی چھوٹی کتابیں نظر پڑیں، کسی کا نام گیہوں تھا کسی کا چاول، کوئی شلجم تھی کوئی مولی، اصل میں یہ بچوں کے مضامین تھے جنھیں انھوں نے سلیقہ سے لکھ کر خوبصورت کتابوں کی شکل دیدی تھی، صحن سے گذر کر ہم اندر داخل ہوئے تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ قرول باغ کے علاوہ دہلی اور نئی دہلی سے بھی لوگ آئے تھے۔ ہال میں ہر طرف رنگا رنگ تصویریں لگی ہوئی تھیں اور چاروں طرف میزوں پر سبزیوں، غلوں، پھلوں اور پھولوں کو خوب صورتی سے سجایا گیا تھا "

اس کے بعد جلسہ کی کارروائی دیکھی۔

دہلی میں رہنے والوں کے لئے تاریخی مقامات کی سیر، تفریح کا درجہ رکھتی ہے لیکن پروفیسر محمد مجیب صاحب جیسے مورخ بچوں کے ساتھ ہوں تو اس سیر کی تعلیمی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ مدرسۂ ثانوی کے طلباء کی درخواست پر آپ نے رہنمائی کا کام انجام دیا، جناب سعد انصاری صاحب مرحوم اس کے منتظم تھے۔

انجمن اتحاد نے کئی مہمانوں کا استقبال کیا اور ان سے فائدہ اٹھایا مولانا ثناء اللہ

صاحب امرتسری یوں تو جامعہ میں پہلے بھی تشریف لا چکے تھے لیکن تقریر آپ نے پہلی دفعہ فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ایسے ہیں جن میں یا تو صرف مذہبی تعلیم ہوتی ہے یا ایسے ادارے ہیں جن میں مذہبی تعلیم ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے خوشی کا اظہار فرمایا کہ جامعہ نے ان نقائص کو سامنے رکھ کر اپنا نصاب بنایا ہے۔ جس سے ہمارے لڑکے نمونے کے مسلمان بنیں گے۔

مولانا عطار اللہ شاہ صاحب بخاری کی تقریر بھی اس سال کی ایک خصوصیت ہے۔ انجمن اتحاد کے نوجوانوں نے آپ کی تقریر کا اہتمام کیا تھا۔ مولانا کمال خطابت کا نمونہ تھے۔

اسی انجمن میں تاقبؔ اور جوؔش نے بھی دلوں کو گرمایا۔ اس سال کے عہدہ دار محمد طیّب صاحب نائب صدر عبدالملک صاحب ناظم کا سب سے بڑا کارنامہ "حلقۂ مطالعہ" کا قائم ہونا ہے۔ اس میں کالج کے طلبا کسی عنوان پر بہت ساری کتابیں پڑھ کر اپنے اپنے خیالات حلقے میں پیش کرتے تھے۔ پروفیسر محمد عاقل صاحب کی نگرانی میں یہ کام ہوتا تھا۔ عاقل صاحب کو مطالعہ کا شوق ہے۔ ایک عرصہ تک رسالہ جامعہ کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ سیاسی مسائل سے دلچسپی ہے۔ آپ معاشیات کے پروفیسر تھے۔

اس سال کی ایک اور خصوصیت "شعبۂ دینیات" کے انتظام میں "دینی خطبات کا سلسلہ" ہے۔ خواجہ عبدالحیٔ صاحب ناظم دینیات، اسلامیات کے پروفیسر تھے۔ آپ نے بڑوں کے لئے قرآن شریف کی تفسیر اور بچوں کے لئے "ہمارے رسولؐ"، "خلفائے اربعہ" نامی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی دعوت پر ہندوستان کے ان مشہور عالموں نے جامعہ میں تقریریں کیں۔ اس طرح اپنے آپ کو جامعہ سے وابستہ کر دیا۔ عنوانات درج ہیں۔

۱۔ مقصد قرآن :۔ مولانا احمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور

۲۔ امثال القرآن :۔ مولانا نجم الدین صاحب سابق پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور

۳۔ اسلام میں دولت کی تقسیم :۔ مولانا غلام مرشد صاحب آنریری پروفیسر۔۔۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

۴۔ اسلام اور موجودہ مسائل :۔ مولانا ابوالبرکات حکیم عبدالرؤف صاحب دانا پوری

۵۔ حدیث :۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی۔

۶۔ قدیم علماء کا تعلیمی نصب العین :۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب صدر یار جنگ بہادر۔

ان خطبات میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب، مولانا عبدالقادر صاحب قصوری، مولانا بشیر احمد صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز، مولانا حامد اللہ انصاری صاحب غازی نے شرکت فرمائی۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جشن زرّیں میں جامعہ کے طلباء اور اساتذہ کی ایک جماعت بھی شرکت کے لئے علی گڈھ گئی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے کانفرنس کے شعبۂ ثانوی تعلیم کے اجلاس کی صدارت فرمائی اور پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔ اے۔ (علیگ) نے شعبہ معاشیات و اصلاح معاشرت کے جلسے میں ایک مقالہ ہندوستان کا مسئلہ آبادی پڑھا۔

طلباء اپنی تعلیم کے سلسلہ میں جماعت میں جو کام کرتے ہیں وہ بھی خاص تعداد میں کانفرنس کی تعلیمی نمائش میں بھیجا گیا تھا جہاں وہ غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا۔ جامعہ کی نمائش کے لئے ایک مستقل کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ اس نمائش کے سلسلہ میں

تین درجن کے قریب جامعہ کو انعامات ملے۔ سب سے زیادہ اشیاء بھیجنے کے صلے میں جامعہ ٹرافی کی بھی مستحق سمجھی گئی۔ بچوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے اس کام کو بہت پسند کیا۔ صوبہ متحدہ (یو، پی) کے ڈائرکٹر تعلیمات مسٹر دیسائی نے یہاں تک فرمایا کہ میرے دل میں طرز تعلیم کے متعلق جو آرزوئیں ہیں وہ جامعہ کی نمائش میں عملی طور پر موجود ہیں۔"

اس سال کے مہمانوں کی فہرست طویل ہے۔ جلسوں کے سلسلے میں چندہ کا ذکر آگیا ہے۔

ایک اندوہناک خبر بھی ہے کہ ہماری جامعہ کے نائب محاسب محمد یوسف صاحب تاباں جو ایک عرصہ سے بیمار تھے انتقال فرما گئے۔ آپ کی جوان موت پر جامعہ کی ساری برادری متاثر ہوئی۔ بچوں کے بنک کے پہلے آڈیٹر آپ ہی ہیں۔ آپ نے بنک کی ابتدائی حالت بہتر بنانے میں ہر طرح کی مدد کی اور کارکنوں کو سمجھایا کہ حساب کس طرح رکھا جاتا ہے۔ آپ کے بعد بشیر احمد صاحب انصاری نائب محاسب نے بنک کی مدد کی۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کے انتقال کے بعد انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء میں جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کو امیر جامعہ مقرر کیا۔

جامعہ جب تک قرول باغ میں تھی طبیہ کالج کے ڈاکٹر اور حکیم، جامعہ کے کارکنوں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے: "ان میں ڈاکٹر عباس، ڈاکٹر شرما، ڈاکٹر ظفریاب، ڈاکٹر محمد علی، حکیم فرید احمد صاحب خاص ہیں۔" جامعہ نگر میں منتقل ہونے کے بعد ڈاکٹر شرما صاحب نے اپنا جانشین ایسے شخص کو بنایا جس نے اپنی مہارت اور زندہ دلی سے جامعہ میں ہر دل عزیزی حاصل کر لی یہ ہیں ڈاکٹر بہادر، بعد میں کچھ اور تبدیلیاں ہوئیں لیکن ڈاکٹر صاحب پھر اپنے دوستوں میں آملے۔ ایک دن آپ فرمانے لگے، جامعہ کی سوسائٹی میں جو انس میں پاتا ہوں، یہ دوسری جگہ کم ملے گا۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں جب جامعہ کا سنگِ بنیاد رکھا گیا تو اس وقت پیارے لال شرما اینڈ سنز کے مینجنگ

۱۔ حکیم اجمل خاں

۲۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۳۔ عبدالمجید خواجہ

ڈائرکٹر رگھونندن سرن نے اعلان کیا تھا کہ جامعہ کے یہاں منتقل ہونے پر اشرفی دیوی ٹرسٹ کی طرف سے جامعہ کو لاری دی جائے گی، اسی سال یہ وعدہ پورا ہوا۔ یہ لاری فرید احمد ڈرائیور کے سپرد ہوئی۔

اس سال کے آخر تک چندہ دینے والے ہمدردوں کی تعداد ۵ ہزار اور چندے کی اس سال کی پوری رقم ۲۵ ہزار روپے ہوگئی تھی۔ دفتر ہمدردان اور چندہ وصول کرنے والوں کے اخراجات اسی رقم سے پورے کیے جاتے تھے۔

اٹھارھواں سال؛

اگست ۱۹۳۷ء سے جولائی ۱۹۳۸ء

مدرسہ ابتدائی میں اس سال کی نئی چیز سالانہ رپورٹوں کا ایک نئے ڈھنگ پر لکھا جانا ہے۔ سال کے آخر میں بچّوں کی جو سالانہ رپورٹیں بھیجی جاتی ہیں ان میں پڑھنے لکھنے کے کام پر تبصرہ کے علاوہ بچّوں کے دیگر مشاغل کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ بچوں کی ذہنی صلاحیتوں اور ان کے رجحانات کو دکھایا جاتا ہے، گویا اس رپورٹ میں بچوں کی تعلیمی، سماجی، دینی، سیاسی (بچوں کی سیاست جس سے انھیں واسطہ پڑتا ہے) حالات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس رپورٹ کو لکھنے کے لئے استاد سال بھر تک بچوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کا کارڈ رکھتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بچّوں کی برائیاں تو نمایاں طور پر نظر آتی ہیں لیکن ان کی اچھائیاں جو صحیح راہ نہ ملنے کی وجہ سے بھونڈی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں، دب جاتی ہیں بعض دفعہ یہ بھی برائی کی شکل میں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس تفصیلی رپورٹ سے والدین کو بھی بچّوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اکبر علی صاحب نگران مدرسہ نے ان رپورٹوں کو رواج دے کر بچوں کی ایک صحیح خدمت کی ہے۔ نمونے کے طور پر ایک

طالب علم کی رپورٹ درج ہے جس سنہ کی یہ کہانی ہے اس وقت چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔

.... ابتدائی ششم عمر بارہ سال۔

" یہ بچہ ہمارے یہاں تین سال سے ہے اس عرصہ میں ہم نے ان کو جاننے اور ان کی مناسب تعلیم و تربیت کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اس میں ہمیں بہت حد تک کامیابی ہوئی ہے اور ہم بچہ کی ترقی سے بہت مطمئن ہیں لیکن ظاہر ہے کہ باوجود بہترین کوشش کے اتنے عرصہ میں ہم کسی بچہ کی تربیت اس طرح نہیں کر سکتے کہ اس کی سیرت کی تشکیل مکمل ہو جائے اور اس میں کسی قسم کی خامی نہ رہ جائے۔ مندرجہ ذیل رپورٹ میں جہاں کہیں بچہ کی کسی خامی کا ذکر کیا گیا ہے وہ خدانخواستہ کسی قسم کی عیب جوئی کے خیال سے نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے تجربہ اور ہمدردانہ مشاہدہ سے سرپرست اور آئندہ اتالیق کو بہترین مشورہ دیں تاکہ وہ ہماری کوششوں کو جاری رکھ سکیں اور اس کی روشنی میں وہ بچہ کی سیرت کو بہتر سے بہتر بنا سکیں۔

سال بھر میں بیمار تو نہیں ہوئے لیکن دبلے پتلے اور کمزور ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ان کی جسمانی کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت کی غفلت کا نتیجہ بچہ کے حق میں مضر ہوگا۔ کھیل اور ہلکی ورزش کے علاوہ ان کی غذا سادہ مگر صحت بخش ہونی چاہیئے۔ دودھ انڈا اور پھل ان کے لئے مفید ہوگا۔ اگر طبی مشورے سے کوئی مقوی دوا استعمال کرائی جائے تو بہت اچھا ہے تعلیمی اعتبار سے درجہ کے ممتاز طلبا میں سے ہیں درجہ کا کام نہایت پابندی سے بلا تاکید از خود کر لیتے ہیں۔ کام، صفائی اور سلیقہ

سے کرتے ہیں لیکن سوائے درجہ کے مقررہ نصاب کے اور کتابوں کے پڑھنے
کا شوق نہیں ہے۔ طبیعت میں تجسس اور تلاش کی کمی ہے جس کے بغیر یہ اپنے
مفروضہ کاموں کو بے شک خوش اسلوبی سے انجام تو دے سکیں گے لیکن ان کی
ترقی محدود رہے گی۔ ضرورت ہے کہ اس جذبہ کو بیدار کیا جائے۔ نیک اور
اطاعت شعار ہیں۔ اپنی تمام عادتوں میں صاف ستھرے اور باقاعدہ ہیں اپنی
چیزوں کو ترتیب اور حفاظت سے رکھتے ہیں۔ کفایت شعار ہیں لیکن اندیشہ
ہے کہ جزرسی میں اعتدال سے نہ بڑھ جائیں قدرے کم سخن ہیں لیکن جب
بولنے کی ضرورت ہو تو بے دھڑک بولتے ہیں۔ ساتھیوں سے تعلقات
اچھے ہیں، ہنستے ہیں، بدمزاج نہیں ہیں کھیل اور ورزش میں پابندی سے
شریک ہوتے رہتے ہیں۔ کھیلتے بھی اچھا ہیں لیکن کھیل سے جن اخلاقی خوبیوں
کی تربیت ہوتی ہے وہ ان میں کماحقہٗ پیدا نہیں ہوسکیں۔ جہاں تک اپنی
ذات کا تعلق ہے ان میں بہت خوبیاں ہیں مگر اچھا شہری ہونے کے لئے
یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ذات کے علاوہ جماعت کے مفاد کا بھی خیال
رکھے اور ضرورت کے وقت اس کے لئے کچھ قربانی بھی کرسکے ابھی تک ان
میں اجتماعی یا سماجی تخیل کی کمی ہے۔ اگر جامعہ میں ان کا کچھ عرصہ اور قیام رہا
تو امید ہے کہ یہ خامی دُور ہو جائے گی۔ یوں بہت ہونہار ہیں ذہنی اعتبار سے
اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسی صلاحیتیں رکھنے والے
بچے کے لئے مناسب ہے کہ اسے چند سال اور اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کا
موقع دیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انشاء اللہ اپنی زندگی میں ایک کامیاب
انسان ہوں گے۔ ان میں ابھرنے کی صلاحیتیں ہیں۔ ذہنی استعداد بہت اچھی
ہے اور اپنے درجہ میں ان کی ہمیشہ ممتاز حیثیت رہی ہے پابندی اور استقلال

سے کام کرنے والے میں یہ ان طلبا میں سے ہیں جن سے ساتھی، اساتذہ سبھی مطمئن ہوتے ہیں، یہ تحریر اس غرض سے ہے کہ ہم انھیں اس سے بھی بہتر دیکھنا چاہتے ہیں اور ہمیں ان کی تکمیل سیرت دیکھ کر خوشی ہوگی۔ ان کی تعلیم ابھی جاری رہنی چاہیئے۔"

اس قسم کی رپورٹ لکھنے کے لئے جن چیزوں سے مدد ملتی ہے امتحان میں ان کا بھی خیال رکھا گیا یعنی تعلیم کے امتحان کے بعد تربیت میں بھی بچوں کو نمبر ملے۔ تربیت کے سلسلہ میں جن باتوں کا خیال رکھا گیا ان میں صحت و صفائی، نماز، خدمت عام، سیاسی بیداری، زندہ دلی، فراخ دلی، کھیل کا فن اور معمولات کی پابندی نو چیزیں تھیں۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بچوں نے اپنے استادوں کو بھی ان ہی نو صفات پر الگ الگ نمبر دیئے اور بلا کسی رو رعایت کے پوری دیانت کے ساتھ بچوں کی طرح بعض استاد کسی کسی مضمون میں فیل ہوئے اور بعض رعایتی نمبروں سے پاس۔ امتحان کے سلسلہ میں ششم کے بچّوں کو چند عام سوالات دیئے گئے تھے۔ ان میں "مدرسہ کی خامیاں اور ان کی اصلاح کی صورت" "اوکھلے کے قریب کے کسی گاؤں کی معاشرت کا حال" بھی ان سوالوں میں سے تھے بچّوں نے بڑی دلچسپی سے ساتھ ان کے جواب لکھے ان دونوں کے دیکھنے سے بچوں کے مشاہدے اور فیصلے کی قوت کا پتہ چلتا ہے۔

اکبر صاحب کے زمانے میں دو چیزوں نے اور فروغ پایا۔ ایک تو کشتی اور دوسرے پیراکی۔

اکبر صاحب مرحوم خوبیوں کے آدمی تھے، مطالعہ ان کا خاص شغل تھا، صبح کی کشتی، شام کی پیراکی سے دلچسپی تھی۔ مذاق سلیم پایا تھا، جیسا آدمی ویسی باتیں!!

اس سال کا نیا پروجکٹ "یوم تاسیس" کا مشترکہ پروجکٹ تھا ابتدائی اول اور دوم میں بانیان جامعہ کے نام بتائے اور لکھائے گئے ۔ ۔ ۔ ۔۔۔۔

دوسری جماعت میں جملہ، جامعہ کے بارے میں ضروری معلومات لکھائی گئیں کبوتر اور خرگوش کی دو کہانیوں کو نقل کے طور پر انھوں نے بڑی دلچسپی سے کھیلا ان نقلوں سے اُستاد کی یہ غرض تھی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
بچے غلامی اور آزادی کا فرق کسی حد تک سمجھ لیں، سمجھدار بچوں نے جامعہ کے بانیوں کے حالات سنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

ابتدائی سوم میں اس سے ذرا زیادہ کام ہوا جامعہ کی کتابوں اور رسالوں کو جو بچوں کے لئے شائع ہوئی ہیں دیکھا بعض کہانیاں پڑھیں اور کچھ لکھنے کی مشق بھی کی۔ اس کے علاوہ تمام مدرسہ کے طلباء کی صوبہ وار اور جماعت وار تعداد معلوم کی۔

ابتدائی چہارم والوں نے ایک کتاب "ہمارے استاد" کے نام سے تیار کی دیباچہ میں لکھا ہے" جامعہ میں ہر سال نئے نئے بچے داخل ہوتے ہیں۔ ان میں کے کچھ تو مستقل تعلیم پانے کے لئے رہ جاتے ہیں اور کچھ تھوڑی سی مدت گزرنے کے بعد اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکوں کو جامعہ کے تمام استادوں کے متعلق پوری واقفیت نہیں ہوتی ہے۔ صرف ان ہی استادوں کو وہ کچھ جانتے اور سمجھتے ہیں جن سے ان کا براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہوتا ہے۔ مدت سے ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ طلباء کی رہنمائی کے لئے کوئی پمفلٹ ہونا چاہیئے۔ جامعہ نگر کی ابتدائی چہارم نے (جس کے کلاس ٹیچر سید مجتبےٰ حسین صاحب تھے) اس ضرورت کو پورا کیا۔ یہ کام بھی ایک خاص "منصوبہ" کے سلسلہ میں انجام پایا ہے۔ بچوں کو اس کی ضرورت محسوس کرائی گئی۔ سوانح عمری کا مقصد اور فائدہ بتلایا گیا پھر یہ کہ جامعہ کے استادوں سے واقف ہونے کے لئے ہر ایک کے متعلق کس قسم کی معلومات فراہم کرنی ضروری ہے۔ اس ضمن میں بچوں نے چند سوالات ترتیب دئے قول باغ

کا سفر کیا، تعلیمی مرکز کے استادوں سے مل کر ان کے حالات نقاط کی شکل میں قلم بند کئے۔ پھر انھیں کاپیوں پر پھیلایا۔ اصلاح لی۔ کاتبوں نے صاف کیا۔ یہ کاتب بھی ان ہی میں سے تھے۔ "ہمارے استاد" تو محض استادوں کے مختصر حالات کا مجموعہ ہے۔ معلومات عامہ کے گھنٹے میں لڑکوں نے استادوں کی پیدائش کے مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کیں ڈرائنگ کے سلسلے میں تصویریں جمع کیں۔

پنجم جماعت نے بانیان جامعہ اور شعبہ جات جامعہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ ششم جماعت نے اسی کام کو ذرا بڑے پیانے پر پھیلا کر ایک رسالہ مرتب کیا جس میں بانیان جامعہ اور شعبہ جات جامعہ پر مضامین تھے۔ تاسیس جامعہ کے ضمن میں قدرتی طور پر علی گڈھ یونیورسٹی، دیوبند اور ندوۃ کا سوال آ جاتا ہے۔ ان کے بارے میں طلبا نے مختصراً معلومات حاصل کیں۔ حلقہ ہمدردان جامعہ اور جامعہ کی آمدنی اور خرچ کے سلسلے میں استاد نے نصاب سے متعلق جتنا بھی کام نکل سکتا ہے پورا کرانے کی کوشش کی کسی جلسے کے لئے مشترکہ پروجیکٹ کو چلانے کی اب تک یہ صورت تھی کہ ایک شخص کو نظامت کے فرائض سپرد ہو جاتے تھے۔ یہ ناظم جماعت کے استادوں سے مشورہ کر کے کام تقسیم کر دیتا تھا۔ پھر استادوں کے عام جلسہ میں جلسہ کے انتظامات اور کام پر گفتگو ہو جایا کرتی تھی۔ ایک چھوٹی جماعت کام کی تفصیلات ٹھیک طریقہ سے طے کر سکتی ہے اس لئے اس کام میں یہ تبدیلی ہوئی کہ مشترک پروجکٹ چلانے کے لئے استادوں کی ایک مختصر کمیٹی بنائی جانے لگی۔ ان ہی میں سے ایک ناظم بھی ہوا کرتا مذکورہ پروجکٹ کے ناظم عبدالجلیل صاحب ندوی تھے

ان کاموں کی نمائش کرنے کے لئے ۲۹ اکتوبر کو جامعہ نگر میں جب تاسیس کا جلسہ ہوا تو خوش قسمتی سے جناب عبدالمجید خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے پہلی دفعہ جامعہ نگر تشریف لائے۔ مدرسے کے دروازے پر تمام طلبا دو رویہ صف باندھے

کھڑے تھے۔ ہر ایک مانیٹر نے اپنی جماعت کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا۔ پھر سب لوگ جلسے میں پہنچے۔ جلسہ ۴ بجے شروع ہوا حسب دستور ایک بچہ جلسہ کا صدر ہوا۔ رپورٹ سنائی گئی۔ آخر میں خواجہ صاحب نے تقریر فرمائی۔ اس تقریر میں بچوں کے کاموں پر خوشی کا اظہار تھا۔ اور ترقی، کامیابی کی دعائیں۔ بڑوں کی ثابت قدمی اور ہمت پر آفریں اور ان کے قائم رہنے کی تمنا۔ ہر طرف سے آنے والے مصائب کے باوجود جامعہ کے زندہ رہنے، بڑے سرپرستوں اور بزرگوں کی علیحدگی کے بعد بھی ترقی کرنے، اور محتاجی و بے کسی کی حالت میں شاندار عمارت کھڑی ہو جانے پر حیرت تھی۔ آئندہ کے لئے آرزوئیں، تمنائیں۔ غرض کہ لفظ لفظ گہرے تعلق بے حد مسرت، دلی دعاؤں اور کامل خلوص کا آئینہ تھے۔

جب تک جامعہ قرول باغ میں تھی لڑکے مختلف مسجدوں میں نماز ادا کرتے تھے جامعہ نگر میں یہ سہولت ہوگئی ہے کہ ایک جگہ جمع ہو کر اپنے انتظام میں جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں۔ چونکہ لڑکوں کی اکثریت رہتی ہے اس لئے ان ہی کی رعایت سے جمعہ کا خطبہ اُردو میں ہوتا ہے۔ ہر ایک استاد باری باری سے کسی موضوع پر تیاری کر کے جمعہ کا خطبہ پڑھتا ہے، عبدالجلیل صاحب اُستاد مدرسہ ابتدائی نے اس قسم کا پہلا خطبہ دیا تھا اسلامیات میں آپ کا مطالعہ اچھا ہے۔ خوش مزاج اور ملنسار ہیں۔

تعلیمی مرکز میں بھی کئی پروجکٹ چلائے گئے۔ احمد علی صاحب نے پرند، جانور وغیرہ کئی پروجکٹ چلائے۔ تیسری جماعت والوں نے "صفائی پروجکٹ" چلایا۔ ہم ہر سال کی کہانی میں کسی نہ کسی نئے پروجکٹ کا خلاصہ درج کرتے ہیں اس سال ایک خلاصہ درج ہے اس لئے کسی اور پروجکٹ کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

منزل ثانوی کی بزم ادب میں "چمن" کے نام سے قلمی ماہوار رسالے کا انتظام پہلے سے تھا لیکن ہندوستان، اسلامی دنیا اور ممالک غیر کے سیاسی اور تاریخی حالات کے

لڑکوں میں عام کرنے کے لئے "وال پیپر" (دیواری اخبار) کا انتظام کیا گیا جس میں تازہ مسائل پر مختصر مضامین ہوتے ہیں۔ کارٹون بنائے جاتے ہیں۔ لڑکے نقشے کھینچتے ہیں گراف تیار کرتے ہیں۔ اس کی ابتدائی حالت کو بہتر بنانے میں استادوں میں علی احمد صاحب اور لڑکوں میں سید حسن اور فیض الرحمٰن نے خاص حصّہ لیا تھا۔ علی احمد صاحب جامعہ کے سابق طالب علم اور سائنس کے استاد تھے۔ معلومات عامّہ کے مضمون سے خاص دلچسپی تھی۔ "معمل حکمیات" سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے اپنے شاگردوں سے کئی چیزیں بنوائی ہیں۔ گویا یہ جامعہ کی مصنوعات تھیں۔ "جامعہ کیمیکل انڈسٹریز" کے نام سے انھیں فروخت کرنے کا انتظام بھی تھا۔ چیزوں کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ لڑکے اپنے روزمرّہ کے کام کرتے ہوئے انھیں آسانی سے بنائیں۔ روشنائی، منجن، ویسلین، مچھر بچاؤ، تیل، آئس کریم کا سفوف، بہت کامیاب مصنوعات ثابت ہوئیں۔

منزل ثانوی میں ایک اور خاص تبدیلی "قومی ہفتہ" کا منایا جاتا ہے۔ اب یہاں بھی اس تقریب کو "منصوبہ" کے تحت منایا جانے لگا اس سال کے چند عنوانات یہ تھے۔ "وفاق" "ہمارا معاشرتی نظام" "ہندوستان کی تجارت خارجہ" "ہندوستان کی جہاز رانی" "قومی زندگی میں سائنس کی اہمیت" "مسلمانوں کا ذہنی انتشار" وغیرہ۔

حرفہ کے کام میں یہ اضافہ ہوا کہ "بخاری" کے علاوہ جلدسازی کا کام بھی سکھایا جانے لگا۔ جامعہ کے سابق طالب علم مہدی حسن صاحب اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونا چاہتے تھے۔ آپ نے اسی کام کو منتخب کیا تھا۔ جامعہ کے لڑکوں کی کتابوں کے علاوہ کتب خانہ جامعہ کا کام کافی مل جایا کرتا تھا۔

ایک عرصہ سے یہ تجویز تھی کہ ثانوی کے لڑکوں کا "بینڈ" ہونا چاہیئے۔ اسلامیہ ہائی اسکول شملہ کی طرف سے عبدالرب صاحب نے "بینڈ باجہ" کا ایک سیٹ تحفہ کے

طلبہ نے پیش کیا جس سے یہ کام بھی شروع کر دیا گیا۔

بزم ادب کی طرف سے آگرہ کی سیر کا پروگرام بنا، ایک جماعت سائیکلوں پر روانہ ہوئی۔ دوسری لاری پر۔ صدر بزم ادب اقتدار رشاد الحق صاحب نگران مدرسہ ثانوی کی رہنمائی میں یہ سفر بہت کامیاب رہا

آگرہ میں مدرسہ شعیبیہ، جامعہ کا گویا مستقل مہمان خانہ ہے جناب منیجر صاحب کی شفقت بزرگانہ کہیں اور جانے ہی نہیں دیتی۔ سعید احمد صاحب زبیری (منیجر مدرسہ) جو درحقیقت مدرسہ کی روح رواں ہیں جامعہ کے بچوں سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اس دفعہ بھی قیام شعیبیہ میں ہوا۔ فتح پور سیکری میں بابو ریاض احمد صاحب کی عنایات سے بڑی سہولت رہی اور آرام بھی ملا۔

اس سال جامعہ کے دو استاد مزید تعلیم پاکر اپنے کام پر واپس ہوئے۔ جامعہ کے سابق طالب علم سعید انصاری صاحب جامعہ سے بی۔ اے۔ کے بعد تعلیم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ بھیجے گئے تھے۔ مولوی محمد عاقل صاحب نے علی گڈھ سے بی۔ ٹی۔ کیا، آپ ایم۔ اے۔ بھی ہیں آپ کی شخصیت میں خوش مزاجی اور صوفیانہ رنگ کا بڑا اچھا امتزاج ہے وارد ھا کی تعلیمی کانفرنس میں (جو گاندھی جی کی دعوت پر بلائی گئی تھی) حصّہ لینے کے لئے جامعہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب تشریف لے گئے تھے، واپسی پر محمد مجیب صاحب نے اپنے خاص انداز میں کانفرنس کی کارروائی پر روشنی ڈالی۔ دوسرے جلسہ میں ظریف لکھنوی پھر ایک دفعہ لڑکوں کو محظوظ کیا ان کی مشہور نظم "شامت الیکشن" لڑکے دوبارہ سننا چاہتے تھے وہ بھی سنائی۔

اس سال "اردو اکادمی" میں دو مقالے پڑھے گئے۔ حیدرآباد دکن کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر غلام یزدانی صاحب اپنی اثری تحقیق اور کاوش کے لئے ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں مشہور ہیں۔ آپ نے "ہندوستان کے آثار قدیمہ" کے عنوان سے

اپنا قیمتی مقالہ سنایا۔

دوسرا مقالہ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے "جزیہ" کے عنوان سے پڑھا۔

ڈاکٹر سید حسن صاحب امریکہ سے لوٹ کر ہندوستان آئے تو آپ نے "اسلامی دنیا" کے نام سے دو تقریریں کیں، جلسہ کی صدارت آصف علی صاحب بیرسٹر نے کی تھی۔

جن لوگوں نے تقریریں کیں گویا وہ اس سال کے ہمارے مہمان بھی تھے ان کے علاوہ ڈیرہ دون پبلک اسکول کے صدر مسٹر فٹ نے بچوں کے کام کو غور سے دیکھا اور بہت پسند فرمایا۔ واپسی پر ڈیرہ دون سے چند استاد جامعہ نگر بھیجے تاکہ یہاں کا طریق کار سمجھیں۔ کانگریس کی صوبائی حکومت کے دو وزراء نسیمن نوری صاحب (بمبئی) حافظ محمد ابراہیم صاحب (یو۔پی) کی آمد بھی قابل ذکر ہے۔

اسی زمانے میں کانگریسی وزارتیں برسر اقتدار آئی تھیں۔ صوبجات متحدہ آگرہ اودھ کی حکومت کے وزیر حافظ محمد ابراہیم صاحب "ادکھلا نہر" کی عمارتوں میں آکر ٹھہرے تو جامعہ نگر کے بچوں نے بھی دعوت دی۔ آپ نے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا کہ "میں نے اپنی زندگی میں بہت سے سپاسنامے لئے ہیں لیکن بچوں کے اس سپاسنامے کو ہمیشہ یاد رکھوں گا"

....

جامعہ کے ایک بڑے محسن سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد دکن جامعہ نگر تشریف لائے تو بچوں نے ان کا شاندار استقبال کیا۔ عصرانہ دیا گیا۔ بچوں نے سپاسنامہ پیش کیا جس کے جواب میں آپ نے فرمایا۔

"بچو، اس وقت میرا دل مسرت سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے تمہارے مدرسہ اور

تم سے بہت امیدیں ہیں تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا شیخ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)
ایک ایسا آدمی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ خدا کرے تم قوم کے ایسے رہنما
ثابت ہو جن پر جامعہ ہی نہیں بلکہ سارا ملک فخر کرے۔"

تقریر کے بعد سر اکبر حیدری نے بچوں کے لئے اپنی جیب خاص سے ایک ہزار
روپیہ عطا فرمائے۔ ان روپوں سے جامعہ نے بچوں کے لئے کھیل کا سامان خریدا۔

موت اور زندگی ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ ایک اندوہناک خبر بھی ہے۔ اپریل میں
ڈاکٹر اقبال کا انتقال ہو گیا۔ وہی اقبال جن کے کئی ترانے بچوں کو یاد ہیں۔
بڑوں کے لئے ایسے شعر لکھے "جو قلب کو گرما دے اور روح کو تڑپا دے"۔

علی گڑھ کے زمانے کی بات ہے عید کے دن صبح جب ہم لوگ بستر سے
اُٹھے تو دیکھا کہ کمرے کے اندر "پیام عمل" کے نام سے اقبال کے کلام کا ایک بند نہایت
خوشنما چھپا ہوا موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب نے عید کا یہ تحفہ ہر ایک کو دیا ہے۔

آپ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک فلسفی اور مفکر بھی۔ انسانیت کے علمبردار،
خدا اور رسولؐ سے عشق رکھنے والے۔ ڈاکٹر اقبال ساری عمر مسلمانوں میں اسلام کی
صحیح اور سچی روح پھونکتے رہے۔

آپ جب کبھی جامعہ میں تشریف لاتے تو لڑکوں کو یہی نصیحت کرتے کہ وہ
دین اور دنیا دونوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے اندر اسلام کی سچی تڑپ پیدا
کریں۔

اقبال ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا زندہ کلام ہمارے درمیان ہے۔

مکتبہ جامعہ کی نمائش بھی ذکر کے قابل ہے۔ جو اسی سال "یوم تاسیس" کے موقع پر بڑے پیمانے پر کی گئی تھی۔ مکتبہ کے پاس نمائش کے لئے سوائے کتابوں کے اور کیا رکھا تھا لیکن کارکنوں کی سلیقہ شعاری نے اسے اتنا دلچسپ اور خوش منظر بنا دیا تھا کہ دور دور سے چل کر آنے والے لوگ بھی خوش اور مطمئن لوٹے۔

خوب صورت چھپی ہوئی کتابوں کے علاوہ نمائش میں تین چیزیں خاص تھیں ایک تو وہ نقشے اور تصویریں جن میں مکتبہ جامعہ کی تدریجی ترقی کو ظاہر کیا گیا تھا ایک نقشہ میں جامعہ نگر میں بنی ہوئی عمارت کی تصویروں سے کام لے کر یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر مکتبہ کا کل مال اس کی اصلی قیمت پر فروخت ہو جائے تو آج وہ اس سے ڈھائی گنی عمارت آسانی سے بنا سکتا ہے۔ (جامعہ نگر کی ایک عمارت پر پچھتر ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں) اس کے علاوہ مکتبہ جامعہ کے مصنفین، مؤلفین اور مترجمین کی تصویریں بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ شیشوں میں لگائی گئی تھیں۔ ایک دوسرے نقشہ میں مطبوعات جامعہ کی شعبہ وار تقسیم کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اب تک ہر شعبے میں کتنے صفحات مکتبہ شائع کر چکا ہے۔

دوسری چیز کتابوں کے مسودے تھے۔ کتاب لکھنے والے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چیزیں ایسے ہی موقع پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان بچوں اور بڑوں نے جنھیں مضمون نگاری کا شوق ہے ان مسودوں کے دیکھنے میں بڑی دلچسپی لی۔

تیسری چیز کتابوں کی جلدیں اور ان پر گرد پوش تھے۔ جلد کے اوپر کتاب کی حفاظت کے لئے ایک اچھا سا موٹا اور دبیز کاغذ چڑھایا جاتا ہے جس پر کوئی نہ کوئی ڈیزائن ہوتا ہے۔ اس ڈیزائن سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتاب کس مطلب کی ہوگی۔ مکتبہ کی کوشش یہ ہے کہ تمام کتابیں خصوصاً جامعہ کی چھپی ہوئی کتابیں،

جلد کے ساتھ لوگوں کو ملا کریں تاکہ کتاب خراب نہ ہونے پائے اس کوشش کے نمونے ایک بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔

یہ کام حامد علی خاں صاحب اور جامعہ کے چند اور سابق طالب علم بدرالحسن صاحب محمد یوسف صاحب جیسے محنتی نوجوانوں کی کوشش سے برابر ترقی کر رہا تھا۔ حامد صاحب کی ذہانت، تیزی، محنت، نفاست نے مکتبہ کو ایک معیار پر پہونچا دیا تھا۔ مکتبہ کے کاموں میں آپ دن رات مشغول رہتے تھے۔

دفتر ہمدردان جامعہ ہر سال کے شروع میں یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ اس سال اتنی رقم جامعہ کے ہمدردوں کی طرف سے پیش کی جائے گی۔ گذشتہ سال کے لئے ۲۵ ہزار کا اعلان تھا، اس سال کے لئے ۳۰ ہزار کا اعلان کیا تھا (چندوں کے اخراجات اس میں شامل ہیں۔) سال کے وسط تک تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ رقم گذشتہ سال کے مقابلے سے بھی کم رہے گی۔ لیکن خدائے تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس سال کی تعطیلات میں یہ پوری کرلی گئی۔

انّیسواں سال

اگست ۱۹۳۸ء سے جولائی ۱۹۳۹ء

اس سال کی ایک نئی چیز استادوں کے مدرسے کا قیام ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ۱۹۳۵ء میں اس کا افتتاح ہونے والا تھا لیکن یہ کام ملتوی ہو گیا تھا۔ اب جبکہ سعید انصاری صاحب امریکہ سے واپس آگئے تھے تو اس کی ابتدا بھی ہو گئی۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ پچھلے سال ہری پورہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی اور ذاکر صاحب کی "قومی بنیادی تعلیم" کی اسکیم منظور ہو گئی تھی اس لئے جامعہ نے استادوں کے مدرسے میں اسی "قومی بنیادی تعلیم" کی تربیت کا نصاب رائج کر دیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں دو طرح کے ٹریننگ اسکول تھے۔ ایک وہ جو مضامین کی تعلیم کو کتابوں کے ذریعے دلچسپ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرے وہ جو کسی کام کو مقصد قرار دے کر اور اس مقصد کو علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنا کر بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا چاہتے تھے (جسے پروجکٹ میتھڈ کہتے ہیں) مثلاً موگا کا ٹریننگ اسکول لیکن ان کے ہاں اس بات کی کوئی قید نہیں تھی کہ کام ایسا منتخب کیا جائے جس میں کچھ نہ کچھ آمدنی کی صورت بھی ہو، ہو سکتا ہے کہ لڑکے "سمندر پروجکٹ" کا انتخاب کر کے اپنی تعلیم جاری رکھیں اسمیں خرچ تو ہے آمدنی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

گاندھی جی ایک عرصہ سے اس فکر میں تھے کہ اگر قومی حکومت قائم ہوگئی تو موجودہ نہج (سرکاری مدارس کے طریقے) پر تعلیم دینے سے جو نقصان اب ہوتا ہے اس وقت بھی قائم رہے گا پھر اس تعلیم سے ہاتھ سے کام لینے کی صلاحیتیں نہیں ابھرتی ہیں۔ گاندھی جی اس مفلس ہندستان کو خوشحال دیکھنا... چاہتے تھے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ لوگ ہاتھ سے کام لینے کے عادی ہوں اور کسی کام یا دستکاری کو اختیار کریں، نوکری کا انتظام سب کے لئے تو ہونے سے رہا اس لئے گھریلو صنعتوں کو ترقی دینے کی ابتدا وہ مدرسوں سے کرنا چاہتے تھے، ملک کی خوش قسمتی ہے کہ گاندھی جی کی اس محدود اسکیم کو تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ٹھیک ٹھیک سوچ کر ان دونوں چیزوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ذاکر حسین جیسا ماہر تعلیم مل گیا وہ جامعہ میں تقریباً دس برس سے "مقصدی طریقۂ تعلیم" کا تجربہ کر رہے تھے معاشیات کے ماہر کی حیثیت سے وہ اس بات کی فکر میں تھے کہ موجودہ تعلیم میں کمانے کی صلاحیت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے کہ اتنے میں ان کا ایک دھندلا خاکہ وردھا کے دعوت نامے میں نظر آنے لگا ذاکر صاحب جانتے تھے کہ گاندھی جی ایک باعمل انسان ہیں، انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کو کر دکھائیں گے۔ اگر اس وقت ہم الگ رہے تو معلوم نہیں وہ اسکیم کس شکل میں سامنے آئے۔ جن لوگوں کو بچوں کی بہبود کا زیادہ خیال رہتا ہے اگر انھیں علم ہو جائے کہ ایک تجویز بچوں سے متعلق تیار ہو رہی ہے جو عمل میں آ کر رہے گی اور اگر اس وقت خاموش رہے تو وہ جیسی کچھ بھی ہے نافذ ہو جائے گی تو ایسے موقعوں پر درد رکھنے والا دل خاموش نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر ایک دفعہ اپنے دل کی بات تو کہہ کر ہی رہے گا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو ذاکر صاحب کو وردھا کھینچ کر لے گیا۔ پھر جن لوگوں نے بنیادی کانفرنس کے اس پہلے جلسے میں ذاکر صاحب کی پہلی تقریر غور سے پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ ذاکر صاحب اپنا ایک الگ مسلک رکھتے ہیں۔ اور یہ علیحدگی اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس خیال کو پھیلانے کے لئے ہے جسے وہ عزیز رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کی وردھا کانفرنس والی تقریر

پڑھی ہے وہ ہمارے خیال کی تائید کریں گے ۔

گاندھی جی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بچوں کو ان کے ڈاکٹر یا حکیم سے چھڑا کر کسی عطائی کے سپرد کر دیں یا محبت کے جوش میں اندھے ہونے والے ماں باپ کو اس کا موقع دیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے بڑی خوشی سے یہ تمام کام ایک کمیٹی کے ذریعہ ڈاکٹر ذاکر صاحب کے سپرد کر دیا۔ اس کمیٹی کے لوگ پہلے سے مفید تعلیمی تجربے کر رہے تھے۔ تھوڑی سی مدت میں تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ایک ایسی رپورٹ پیش کی جس میں اسکیم کو چلانے کے لئے تمام ضروری باتیں آ گئی ہیں، مثلاً (۱) بنیادی اصول (۲) مقاصد (۳) استادوں کی تعلیم (۴) نگرانی اور امتحانات (۵) انتظام (۶) نصاب وغیرہ۔

اس اسکیم کی تین بنیادی باتیں یہ ہیں :-

۱۔ سب بچوں کے لئے تعلیم مفت اور لازمی ہو۔

۲۔ تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہونا چاہیئے۔

۳۔ کسی حرفہ کے ذریعے بچوں کو تعلیم دی جائے۔

اس رپورٹ کو سامنے رکھ کر ہری پورہ کے سالانہ اجلاس میں کانگریس نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ڈبلو، آئی، آر نائیکم صاحب کو اختیار دیا کہ وہ گاندھی جی کی رہنمائی میں ایک تعلیمی بورڈ بنا کر اس اسکیم کو چلائیں۔ چنانچہ اس بورڈ کے صدر ذاکر صاحب اور سکریٹری نائیکم جی بنائے گئے۔

اس بنیادی تعلیم کی اسکیم کو سامنے رکھ کر ۳ اگست ۱۹۳۸ء کو استادوں کے مدرسہ کا افتتاح ہوا۔

اس جلسہ میں کتنی سادگی ہے، صاف ستھری جگہ پر کرسیاں بچھی ہیں جہاں موسم گرما کی مناسبت سے شربت کا انتظام بھی ہے۔ لوگوں میں بڑی خوشی تو اس بات کی ہے کہ جامعہ میں

ایک نئے اور بڑے کام کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ذاکر صاحب کی ایک مختصر تقریر کے بعد اس مدرسہ کے پرنسپل جناب سید انصاری صاحب نے تعلیم کے ماہروں کے پیامات سنائے۔ صرف چند پیام یہاں درج ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے اس کام سے بڑے لوگ بھی کتنے متفق ہیں۔

امریکہ سے "نیو ایجوکیشن فیلوشپ" کے صدر مسٹر زیلیاکس، لکھتے ہیں۔

"میں آپکو اور آپکے لایق رفقار کو اس نئی اور شاندار کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپکا یہ مدرسہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو۔"

اسی امریکہ سے تعلیم کے تین اور مشہور مفکروں نے اپنے پیامات بھیجے ایک تو جان ڈیوائی دوسرے پروفیسر کلپیٹرک، تیسرے ڈاکٹر انگلہارٹ۔

انگلستان کے مشہور ماہر تعلیم مسٹر ایبٹ وڈ جو پچھلے دنوں سرکاری دعوت پر ہندوستان کے تعلیمی معاملات میں حکومت ہند کو مشورہ دینے آئے تھے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"استادوں کے مدرسہ کے قیام کی خبر میرے لئے بہت مسرت بخش ہے معلوم ہوا ہے کہ اس مدرسہ میں ذاکر حسین کمیٹی (واردھا اسکیم) کی ہدایات اور سفارشات کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ خدا آپ کی امیدیں بر لائے!"

انگلستان کے صوبہ کینٹ کے مہتمم تعلیمات مسٹر ای۔ ایس۔ ڈیوس کا پیام بھی سنایا گیا۔

جرمنی کے سابق امپیریل چانسلر ڈاکٹر پالس موتھ اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

"میں آپ کو اس نئے شعبہ کے قیام پر مبارکباد دیتا ہوں اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں!"

اپنے ملک سے مہاتما گاندھی، سر اکبر حیدری، سر شاہ سلیمان، ڈاکٹر ضیاء الدین

مسٹر بی۔جی کھیر، مولانا ابوالکلام آزاد، آر۔ ایس نسلا، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سپرائن، پروفیسر اے۔ بی جلیم۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ خواجہ غلام السیدین۔ آچاریہ نریندر دیو، میاں عبدالحیٰ کے پیامات بھی دلچسپی کے ساتھ سنے گئے۔

یہ افتتاح قرول باغ کی ایک کرائے کی عمارت میں ہوا تھا جس سے متصل جامعہ کے دیگر ادارے تھے۔ بنیادی تعلیم کے اصول ڈاکٹر ذاکر صاحب پڑھایا کرتے تھے پروفیسر محمد عاقل صاحب "دیہی زندگی کی معیشت" پر درس دیتے تھے۔ سعید انصاری صاحب کے ذمے عام اصول تعلیم اور مضامین کے پڑھانے کا طریقہ تھا اردو زبان کے کام کا ایک حصہ میرے ذمہ تھا۔ نور محمد صاحب کل ادارے کے انچارج تھے۔ ماسٹر عبدالحیٰ صاحب کے پاس لکڑی اور گتے کا کام تھا۔

طلباء سے کل ۳۰۰ روپئے سالانہ فیس لی جاتی تھی جس میں بورڈنگ اور کھانے وغیرہ کا خرچ شامل تھا۔ ان میں سے پورے وقت کے استاد صرف دو تھے یعنی سعید انصاری صاحب اور نور محمد صاحب، باقی اساتذہ جامعہ کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔

جب بھی مالی مسئلہ جامعہ کے سامنے آیا سعید انصاری صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ جامعہ کے شعبوں کو جہاں تک ہو سکے خود کفیل بنانے کی کوشش کی جائے جب یہ نیا کام سعید صاحب کے سپرد ہوا تو آپ نے اپنی سوجھ بوجھ اور کفایت شعاری سے اس مدرسہ کو خود کفیل بنا کر چھوڑا۔ آپ کی اس کوشش سے جامعہ کے استحکام کو بڑی مدد ملی تعلیمی مسائل پر آپ کی نظر گہری ہے مختلف تعلیمی عقائد کا آپ احترام کرتے ہیں

اس خیال سے کہ ہماری مستقل بستی جامعہ نگر ہے۔ اس سال ۷ مئی کو اس مدرسہ کا سنگ بنیاد جامعہ نگر میں نہر کے کنارے رکھا گیا۔ جامعہ کی تمام برادری اور شہر کے دیگر حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی۔

یہ عمارت جناب فدا احمد خاں صاحب شروانی اور کے سنتانم صاحب کے

عطیہ سے شروع ہوئی۔ ان کے مرحوم بھائی جناب تصدق احمد خاں صاحب شروانی جامعہ کے معتمد رہ چکے تھے۔

سنگ بنیاد رکھنے سے قبل پروفیسر محمد مجیب صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ نے ایک مبسوط تقریر کی۔ اس کے جواب میں مرحوم فدا احمد صاحب کے دوست۔ کے سنتانم صاحب نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی اور سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد فدا احمد خاں صاحب نے ایک مختصر اور پرجوش تقریر کی۔ آخر میں جناب سعید انصاری صاحب، پرنسپل اُستادوں کے مدرسہ نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا کہ اس شدید گرمی میں شہر سے اس قدر دور تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔

جامعہ نگر کے بچوں نے مختلف ورزشی کھیلوں اور مدرسہ ثانوی کے طلبہ نے بینڈ سے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

اس موقع پر مکتبہ جامعہ کی طرف سے خوبصورت کارڈ پر مولانا حالی کی یہ رباعی چھاپ کر تقسیم کی گئی۔

دُنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
ہر شے کو یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

محمد مجیب صاحب کی تقریر کا ایک حصہ درج ہے۔

"جامعہ والے ایک چھوٹی سی جماعت ہیں مگر اس جماعت کی ساری محنت اور سارا کام بے کار ہو جائے گا اگر وہ اپنی ملت میں فنا ہو کر اپنے نصب العین کو ہندستان کے مسلمانوں کا نصب العین نہ بنا سکی۔" آگے چل کر فرماتے ہیں "اور کہیں ہم یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لئے بنتی ہے اور ہمیں اپنا نام

اس طرح بڑھاتا ہے کہ اس کے لئے کوئی عمارت کافی نہ ہو، جامعہ جب قائم ہوئی تو شاید کچھ لوگوں کو اس کی اُمید تھی کہ ہندوستان کو بہت جلد سوراج اور جامعہ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا لیکن یہ غلط فہمی جلد دُور ہوگئی اور حالات نے ہمیں یقین دلایا کہ جامعہ جب تک صبر و استقلال کا نمونہ نہیں بنے گی اسے کسی خدمت کے لائق نہ سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو آزمائیں گے، زندگی اور محنت کو ایک تجربہ پر صرف کریں گے۔"

اسی سال یکم مارچ کو "انجمن طلبار قدیم" کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے پرانے اور سب سے پہلے طالب علم ہیں۔ آپ نے سنگ بنیاد رکھتے ہوئے بھرے مجمع میں فرمایا۔

"جب بھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھرتھراتا ہے۔ ایسے موقعوں سے فائدہ اٹھا کر میں اہلِ جامعہ کو یاد دلاتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارہ کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتی ہیں یا قید خانہ، اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقاصد کو بھول جائیں تو وہ عمارتیں ان کے مقاصد و ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہیں، اگر عمارتیں ہی مقصود بالذات بن جائیں تو وہ جیل خانہ ہیں جن سے حوصلوں، اُمنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے وقت میں نے یہ کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے مقاصد کو نہ بھول جائیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں سے دھکا دیکر نکال دیں اور ہمارے مقاصد اور ارادوں کے ان مقبروں کو گرا دیں، مجھے

اُمید ہے کہ جامعہ کے پرانے لڑکے اس مقصد کو نہیں بھولیں گے۔"

اس موقع پر انجمن طلبار قدیم کے عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ برکت علی صاحب ناظم، خاکسار نائب ناظم، اور بدرالحسن صاحب خزانچی بنائے گئے۔

اب طلبار کی دلچسپیوں پر ایک نظر ڈالیں۔

مدرسہ ابتدائی میں ایک یہ جدت دیکھنے میں آئی کہ مقیم طلبار ہر جمعہ کو صبح کی نماز کے بعد ہی محمد علی ہال میں موجود رہتے۔ حمد، نظمیں اور ترانے ہوتے۔ صبح کی مناسبت سے ایسے ترانے بھی ہوتے جو سونے والے بچوں کو ہال کی طرف کھینچ لاتے، یہاں کی حاضری لازمی نہیں تھی۔ صرف ذوق کا معاملہ تھا، کہنے میں یہ بات چھوٹی معلوم ہوتی ہے مگر اس کی یاد قدیم طلبار میں ہمیشہ گھر کرنے والی تھی۔

عیدپر "ہوٹل پروجکٹ" چلانے کا سلسلہ بھی اسی سال سے شروع ہوا۔ اس قسم کے کاموں کی ابتدا چودھری محمد علی صاحب نے کی جنھیں اس کام کا اچھا سلیقہ تھا۔

چونکہ رمضان کا مہینہ تھا، عید آنے والی تھی، اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعلیمی مرکز نمبرا میں "مشترکہ قرآن پروجکٹ" چلایا گیا۔ پہلی جماعت میں قرآن کے بارے میں ایک ایک بات بتائی گئی مثلاً "یہ قرآن ہے" "یہ اللہ کی کتاب ہے" "اس میں نصیحتیں ہیں" وغیرہ دوسری جماعت میں قرآن سے اخذ کی ہوئی تین کہانیاں، سنائی اور لکھائی گئیں۔ قرآن پر ایک نظم بھی پڑھائی گئی تیسری جماعت نے اولوالعزم انبیار کا حال سمجھا اور لکھا۔ قرآنی آیات کے نئے مختلف ڈیزائن تیار کئے۔ چوتھی جماعت کے پاس "کاغذ سازی" کا منصوبہ تھا، اس نئے پروجکٹ سے اس کا تعلق قائم کرتے ہوئے بچوں نے اس بات کی تحقیقات کی کہ نزول قرآن سے اس وقت تک قرآن کن کن چیزوں پہ لکھا گیا۔ اس قسم کی چیزیں جمع بھی کی گئیں کہ ان پہ لکھائی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ مثلاً درختوں کے پتے۔ لکڑی، ہڈی پتھر خاص طرح کے کاغذ، جلسہ کی آرائش کے لئے کاغذ کی چیزیں بھی تیار کیں، پانچویں

جماعت میں علاوہ چند مضامین کے مثلاً قرآن غیروں کی نظر میں، قرآن کی تہذیب، قرآن کے ترجمے، کن کن زبانوں میں ہوئے۔ اس جماعت کا خاص کام ایسے نقشے بنانا تھا جس میں یہ دکھایا گیا ہو کہ قرآن کی تعلیمات کس زمانے میں کن کن ملکوں میں پہنچیں۔ چھٹی جماعت کے پاس باغبانی پروجکٹ تھا، اس کام کی مناسبت سے بچوں نے ان آیات کا انتخاب کیا جن میں پانی۔ نہر، باغات۔ دریا۔ بارش۔ بجلی۔ پودے۔ میوے۔ غلے۔ کھیتی کا ذکر ہے۔ اس طرح طلبا کو پورے قرآن کے ترجمے کو پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس شوق نے انہماک کی صورت اختیار کر لی۔ طلبا ترجمہ کے مطالعہ میں محو ہو جاتے تھے۔ اور مندرجہ بالا آیتیں ڈھونڈھ نکالتے تھے۔ رسالہ "چمن" نے "قرآن نمبر" نکالا۔

ان سب کاموں کی رعایت سے جلسہ کی آرائش کی گئی۔ اور نمائش کا انتظام بھی ہوا۔ اس نمائش میں قرآن کے مختلف قلمی نسخے، ترجمے، قدیم مطبوعہ کتب بھی توجہ کا مرکز تھیں اس جماعت نے دیوار پر سرسوں کے پتوں سے یہ آیت "إِنَّا شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا" سجا کر اس کے نیچے اس کا ترجمہ سرسوں کے بیج میں بویا تھا جو جلسہ کے دن پھوٹ آیا تھا۔ قرآن کی فطرت نگاری کو عمل کی صورت میں دکھانے کی یہ بھی ایک اچھی صورت تھی۔

یہ پروجکٹ سید احمد علی صاحب آزاد اور عبدالواحد صاحب سندھی کی رہنمائی میں چلایا گیا تھا۔ آپ نے موگا کے ٹریننگ اسکول میں "مذہبی تعلیم" پر خاص معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو اس اسکول کی خصوصیات میں سے تھی، یعنی مذہبی تعلیم کو کس طرح دلچسپ بنا کر پڑھانا چاہیئے۔ قرآن پروجکٹ کا یہ جلسہ بچوں کی انجمن کے انتظام میں ہوا تھا، اس کے صدر رشید نعمانی صاحب تھے۔ آپ نے جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ رشید صاحب کی بات چیت، ان کے سلیقے اور صفائی سے انجمن کے جلسوں میں سلیقہ پیدا ہوا۔

مدرسہ ابتدائی نے میلاد النبی پروجکٹ کو اپنا معمول بنا لیا تھا، تعلیمی مرکز نمبر ا نے " قرآن پروجکٹ " پر کئی سال تک کام کیا۔

کہنے کو تو " المصور " مدرسہ ثانوی کا ایک پندرہ روزہ رسالہ تھا لیکن اس نے جماعت کے کاموں میں خصوصاً اردو، جغرافیہ، تاریخ ڈرائنگ کے مضامین میں تحقیق جستجو کا شوق پیدا کر دیا تھا طلباً تاریخی واقعات کی چھان بین کرتے ماضی اور حال پر کارٹون نقشوں کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ چونکہ پروجکٹ کے طریقۂ کار نے مدرسہ ابتدائی میں اپنی جڑیں مضبوط کر لی تھیں، اس لئے ثانوی والے بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔ المصور کے ذریعے " قومی ہفتہ " کا پروجکٹ مدرسہ ثانوی میں ایک ماہ پہلے سے شروع ہونے لگا۔ اس سال اس کے " آزادی نمبر " پر ایک نظر ڈالیں تو قومی تحریک کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً۔

۱۔ ہندوستان کی آزادی میں حیدر علی اور سلطان ٹیپو کا حصہ۔
۲۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ
۳۔ وہابی تحریک اور دوسرے علماء کا حصہ تحریک آزادی میں۔
۴۔ کانگریس۔
۵۔ مسلم لیگ۔
۶۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ۔
۷۔ تحریک آزادی میں جامعہ کا حصہ۔
۸۔ تحریک خدائی خدمتگار۔

کانگریس کے تری پورہ سیشن میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کے زیر اہتمام تعلیمی نمائش ہوئی تو ابتدائی اور ثانوی کے طلباء کا کام بحیثیت مجموعی نمایاں نظر آیا تھا ــــــ تحریری کام کو بعض جاننے والوں نے غور سے پڑھا اور اسے نمونے کا کام بتلایا۔

اس سال کی ایک اور خاص بات یا اضافہ یہ ہے کہ شفیق الرحمن صاحب قدوائی نے

حلقہ ہمدردان جامعہ سے علیحدہ ہوکر ایک نیا شعبہ "تعلیم و ترقی" قائم کیا۔ یہ کام پہلے مدرسہ شبینہ کے نام سے حافظ فیاض احمد صاحب نے شروع کیا تھا لیکن ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اپنا پورا وقت اس کام میں دے۔ باہر کے ملکوں کی کوششوں کا غور سے مطالعہ کرے اور اپنے ملک میں اپنے حالات کے مطابق خصوصاً مسلمانوں کے لئے مضبوط اور صحیح بنیادوں پر اس ادارہ کو چلائے۔ یہ کام اب صرف مدرسہ شبینہ تک محدود نہیں رہا بلکہ بالغوں کے تعلیم دینے کے جو ذرائع اور موقعے نکل سکتے ہیں، ان سب کو پروگرام میں شامل کر لیا گیا .....
مثلاً (۱) تختیوں پر لگے ہوئے مستقل اعلانوں کے ذریعہ قرآن شریف اور حدیث کی تعلیم جیسے کتبوں کا نام دیا گیا ہے۔ (۲) چھوٹے چھوٹے کم قیمت پمفلٹ (کتابچہ) کے ذریعہ مذہبی معاشی، سیاسی امور میں رائے عامہ کی تربیت (۳) دیواری اخباروں کے ذریعہ روزمرہ کے حالات سے لوگوں کو واقف کرانا (۴) ماہوار جلسوں کا اہتمام (۵) ڈراموں کے ذریعہ سماجی حالت کا سدھار (۶) گشتی کتب خانہ کے ذریعے لوگوں میں پڑھنے کا شوق جاری رکھنا۔ (۷) رات کے مدرسے میں درس دینا، ظاہر ہے یہ پروگرام بہت وسیع تھا۔ جیسے جیسے لوگ ملتے گئے اس کام کا پھیلاؤ ہوتا گیا۔ شفیق صاحب نے حلقہ ہمدردان جامعہ کی طرح اسے بھی کامیاب بنا کر چھوڑا۔ اس کام میں اتار چڑھاؤ آتے رہے لیکن شفیق صاحب نے کبھی ہمت نہ ہاری۔

اس شعبے کی پنج سالہ کارگزاری کا حال ۱۹۴۲ء میں بیان کیا جائے گا۔

یوم تاسیس کی ایک نئی بات یہ تھی کہ ہر ایک تعلیمی اور انتظامی شعبے کی نگران نے اپنے شعبے کی رپورٹ سنائی آخر میں قائم مقام شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے سکون سے بہنے والے صاف شفاف چشمے کی طرح حاضرین کی پیاس بجھائی۔ تقریر یہ ہے

• جامعہ نے جہاں کئی اور باتوں میں عام روش اور عام وضع کو چھوڑا ہے وہاں تاسیس کی تقریب منانے میں بھی انوکھا چلن اختیار کیا ہے۔ ایسا چلن کہ اس پر

رعب اور شان کا فریب کھائے ہوئے لوگ مسکراتے ہیں۔ قاعدے اور ضابطے کے سیدھے رستے پر چلنے والے حیران ہوتے ہیں یا الجھتے ہیں مگر سادگی اور خلوص ایمانداری اور انکسار کے قدر دان کو اس میں کچھ نہ کچھ دل میں رکھنے اور ساتھ لے جانے کو ضرور نظر آجاتا ہے۔ میں ان دنوں جامعہ میں نہ تھا جب اسے سرکاری یونیورسٹیوں کے ڈھرے پر چلانے اور رسم رواج کو برتنے کی کسی قدر کوشش کی جاتی تھی۔ جب اس کی فکر ہوتی تھی کہ تاسیس کے دن ملک کا کوئی آبرو دار شخص آکر تقریر کرے۔ سندیں تقسیم کرے اور سند کے ساتھ طالب علموں کو ایسی نصیحتیں بھی کرے جس پر عمل کئے بغیر تعلیم کی سند ایک ڈھکوسلا سمجھی جاتی ہے۔ جس سال میں آیا، تاسیس کے دن شکایت اور تنقید نے جشن منایا تھا، پھر کچھ دنوں یہ خیال رہا کہ اس تقریب کو جامعہ کی دولت اور اثر کا نہیں تو جامعہ کی ملنساری مہمان نوازی، اور ادبی ذوق کے اظہار کا ایک موقع بنانا چاہیئے۔ لیکن تقریب کی صورت ہنگامے کی ہوتی یا خاموشی کی۔ محفل عام ہوتی یا خاص جامعہ والوں کی، ہم نے خدمت کا جو ارادہ کیا تھا اسے ہم کسی نئے پہلو سے دیکھتے اور تازہ شوق کے ساتھ دل سے لگاتے ضرور تھے۔ ہم اس دنیا کو جو خرچ اور آمدنی کو برابر رکھنا چاہتی ہے اور حوصلے کو مالی استطاعت کی قینچی سے کترتے رہنا کامیابی کا راز سمجھتی ہے کبھی خوش کرنے کی فکر نہیں کی، ہم نے اپنی کارگذاری کو کبھی، اعداد و شمار کے جو کھٹے میں بند نہیں کیا۔ ہم کبھی خود اپنے مطمئن نہ تھے کہ دوسروں کو مطمئن کریں۔ ہم نے اپنا کام خود ہی اپنے سر لیا تھا۔ ہم کس سے کہتے کہ دیکھئے جو کام ہمارے سپرد ہے وہ انجام پارہا ہے۔ جو روپیہ ہمیں ملتا ہے وہ حسب تخمینہ خرچ ہوتا ہے۔ ہم تو بس یہ کرتے رہے کہ جو رستہ ہم نے طے کر لیا تھا اس کی لمبائی کو ناپیں، ہم نے جو ترقی کی تھی اس کا اندازہ کریں اور وہ بھی صرف اس لئے کہ زیادہ

اُمید اور حوصلے کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔ ہمارے لئے مناسب بھی یہی تھا۔ ہماری ترقی کے معنی یہ تھے کہ جو مقصد ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا اسے خود زیادہ صاف دیکھ سکیں، جو ارادے اپنے دلوں میں رکھتے تھے انھیں زیادہ مضبوط پائیں، جو کام ہم کر رہے تھے اس سے اپنے آئندہ کاموں کو زیادہ ممکن اور قریب ہوتے دیکھیں۔ ہماری کارگزاری کا اگر ایک پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک معمول کی استقلال کے ساتھ پابندی کی اور دوسرا اور ہمارے دلوں کو زیادہ عزیز پہلو یہ تھا کہ ہم نے ایک نئے اور بہتر معمول کی طرح ڈالی، ہم نے اگر کچھ بنایا تھا تو اسے مٹا کر بہتر چیز بنانے کی دُھن میں بھی لگے تھے۔ اور سب سے بڑی بات جس میں سمجھئے کہ جامعہ کے وجود کا راز بھی پوشیدہ ہے، یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں کے ساتھ خود بھی بنتے رہے۔ جامعہ کی کارگزاری ہمارے دلوں کی کیفیت، ہماری واردات قلبی سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ جامعہ کوئی ادارہ یا اداروں کا مجموعہ نہیں ہے ہمارے دلوں کی کہانی بھی ہے، کوئی عمارت یا عمارتوں کا مجموعہ نہیں ہے۔ بہتے چشموں کا ایک جال ساہے کہ جس سے زمین سیراب اور بستی شاداب ہوتی ہے۔

چشموں کو بہانے کے لئے ایک بڑا چشمہ بھی چاہیئے کہ جس کی روانی زمین کی ناہمواری کو اپنے تلووں میں لیتی ہزاروں رکاوٹوں میں سے رستہ نکالتی چلی جائے چشموں کا بہاؤ اسی کے زور سے ہوتا ہے ان کے نغمے اسی کے گیت سے بنتے ہیں۔ یہ روانی، یہ زور، یہ نغمہ سرائی اسی کو نصیب ہوتی ہے جسے خدا دے۔ اپنا کام وہی کر سکتا ہے، اپنی بات وہی کہہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی سال سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جامعہ کی تاسیس کے دن جامعہ کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہمارے شیخ الجامعہ کی زبانی بیان ہوا اور انھوں نے وہی کہا جو ان کے دل

یں تھا ان کی شخصیت نے ان کی باتوں کو ایک آئینہ بنا دیا کہ جس میں ہم اپنی اور جامعہ کی صورت دیکھتے تھے مگر وہ صورت نہیں کہ جس کی تصویر کاغذ پر اتاری جا سکے بلکہ وہ صورت جس کے رنگ، تاریخ، مذہب، انسانی شخصیت کے رنگوں سے مل کر زندگی پر اس طرح چھا جاتے ہیں جیسے آسمان پر افق کے رنگ، جامعہ کی تاسیس کی تقریب سچ پوچھئے تو انھیں رنگوں کا پھوٹنا اور پھیلنا ہمارے کاروبار کا ان کی روشنی میں چمک اٹھنا تھا۔

اس سال ہم اپنی تاسیس اس شان سے منا نہیں سکتے لیکن ہم اپنے پھیلاؤ کو اپنے کام کے پھیلاؤ کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے جو مختلف ادارے ہیں ان کے مقاصد کو جوڑ کر جامعہ کے بڑے مقصد کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ ہمارے شعبوں کا مختصر سا حال آپ ان کارکنوں کی زبانی سنیں گے جن کے وہ اس وقت سپرد ہیں۔ میں آپ کو صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ کام جسے ہم مشق اور تجربہ کہتے ہیں اب آہستہ آہستہ نظیر اور سند بن رہا ہے۔ ہم کو اب یہ ذمہ داری پوری کرنا ہوگی کہ تعلیم کے جن طریقوں کو ہم آزما چکے ہیں ان میں مہارت پیدا کریں تاکہ آئندہ ترقی کی بنیاد مضبوط رہے ہمارا ہر کام اب اس سہولت اور صفائی سے ہونا چاہیئے جو پختہ ارادے اور کامیاب شوق کی سچی علامت ہے۔ اب ہمارے لئے لازمی ہو گیا ہے کہ تفصیلی کاموں میں آپ اپنے چارہ ساز بنیں۔ ایک مرکز سے قوت حاصل کرنے کی بجائے اپنے جوش اور شوق سے مرکز کو تقویت پہنچائیں اور اس اشتراک عمل کو قائم رکھتے ہوئے جو ہماری چھوٹی سی جماعت کا مایۂ ناز ہے اپنے مخصوص کام کو جامعہ کے مجموعی کام اور مجموعی مقصد سے اس طرح ہم آہنگ کر دیں کہ جو کچھ ہونا چاہیئے وہ آپ ہی ہوتا رہے۔ ہمارا کام اب تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے، اس اعتبار

سے نہیں کہ افراد کے ذمہ زیادہ کام ہو گیا ہے یا شعبوں کی تعداد زیادہ ہوتی جا رہی ہے بلکہ اس سبب سے کہ ہندوستان کی تعلیمی اور تہذیبی زندگی سے وہ تعلق جو ہمارے دل اور ارادے تک محدود تھا، اب ایک نیا روپ لے رہا ہے۔ اب یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہمیں اپنے اندرونی کام کی طرف سے پورا اطمینان ہو تا کہ ہم وہ مطالبے پورے کر سکیں جو ہماری قوم اس وقت ہم سے کر رہی ہے اور جنھیں پورا کئے بغیر جامعہ اپنے اصل مقصد تک نہیں پہنچ سکتی۔"

چند رنج کی خبریں بھی ہیں، اسی سال جامعہ کے دو بزرگ استاد جو اپنے بڑھاپے کی وجہ سے گھروں پر آرام کر رہے تھے، خبر آئی کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ مولانا سید شرف الدین صاحب مومن اچھے ادیب اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ترک موالات کے زمانے میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ چھوڑ کر جامعہ میں تشریف لائے تھے۔ آپ بڑے دیندار تھے موسم چاہے کیسا ہی ہو پانچوں وقت کی نماز ٹھیک وقت پر مسجد میں ادا کرتے اور تہجد بھی پڑھتے آپ کے پاس ایک نوٹ بک تھی اگر کوئی کام خلاف شریعت ہو جاتا تو اسے نوٹ کر لیتے اور کوشش کرتے کہ آئندہ ایسی بات نہ ہونے پائے۔ دوسرے بزرگ منشی علی محمد خاں صاحب تھے۔ آپ بھی پکے دیندار، متقی اور پرہیزگار تھے۔ خطاطی کے فن میں آپ کو درجۂ کمال حاصل تھا، رستم قلم کہلاتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ قطعہ جامعہ کے بعض حضرات کے پاس اب بھی محفوظ ملے گا۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد
یا قطعۂ نظر زیار می باید کرد

جامعہ کے سابق خازن مسٹر جمنا لال بجاج کا انتقال ہوا، آپ جامعہ کے قدیم ہمدردوں میں سے تھے، جامعہ میں ایک عرصہ تک غریب طلباء کے وظائف کے لئے خاص رقم آپ کی طرف سے جمع رہتی تھی جب جامعہ کی عمارت بننے لگی تو آپ نے ۱۶ ہزار روپئے اسی غرض سے دئے تھے۔

اس سال ملک کے بہت سے مشہور لوگ جامعہ میں آئے انجمن اتحاد والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور لڑکوں کو دیر تک ان کے خیالات سننے اور چہرے پہچاننے کا موقع دیا۔ کانگرس کے صدر سبھاش چندر بوس، بابو راجندر پرشاد، پروفیسر کے۔ ٹی شاہ۔ بی مکرجی (اسپشل آفیسر لازمی تعلیم، بہار) چینی پروفیسر محمد ابراہیم، کابل کے مشہور شاعر اور ادیب سرور خاں صاحب گویا۔ پروفیسر بارلو، سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا آزاد سبحانی سبھوں نے مختلف وقتوں میں تقریریں کیں۔ بیرون ملک سے روس کے مشہور عالم موسیٰ جاراللہ صاحب جن کی روسی ترکی عربی زبانوں میں تصانیف مشہور ہیں، جامعہ میں تشریف لائے اور کچھ دن تک جامعہ میں مقیم رہے۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ انگلستان کے ایک رکن سالٹر ڈیونیر نے جامعہ کے معائنے کے بعد فرمایا۔

> "جامعہ کے معائنہ میں مجھے بہت لطف آیا۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی سیاحت عالم کے دوران میں بہت سے مدرسوں کا معائنہ کیا ہے مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ میں نے آپ کی درس گاہ کو سب سے زیادہ دلچسپ پایا"

کانگریس کی دعوت پر مصر کی وفد پارٹی کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا کسی وجہ سے ہندوستان نہیں آسکے لیکن اس پارٹی کے چار اور مشہور کارکنوں کو ہندوستان بھیج دیا تھا یہ لوگ جامعہ میں بھی آئے عصرانہ دیا گیا۔ انجمن اتحاد نے جلسہ کا انتظام کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس انجمن کے اعزازی رکن ہیں۔ آپ ہی نے صدارت فرمائی۔

اس سال جتنے بڑے بڑے عطیے ملے ہیں اس سے پہلے کبھی نہ ملے تھے عمارت کے لئے ریاست حیدرآباد سے ایک لاکھ روپے کی یکمشت امداد ملی۔ آپ کو یاد ہوگا ۱۹۳۰ء میں اسی ریاست سے عمارت کے لئے یکمشت پچاس ہزار روپوں کے علاوہ ایک ہزار روپے ماہوار

هو الباقی
دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو
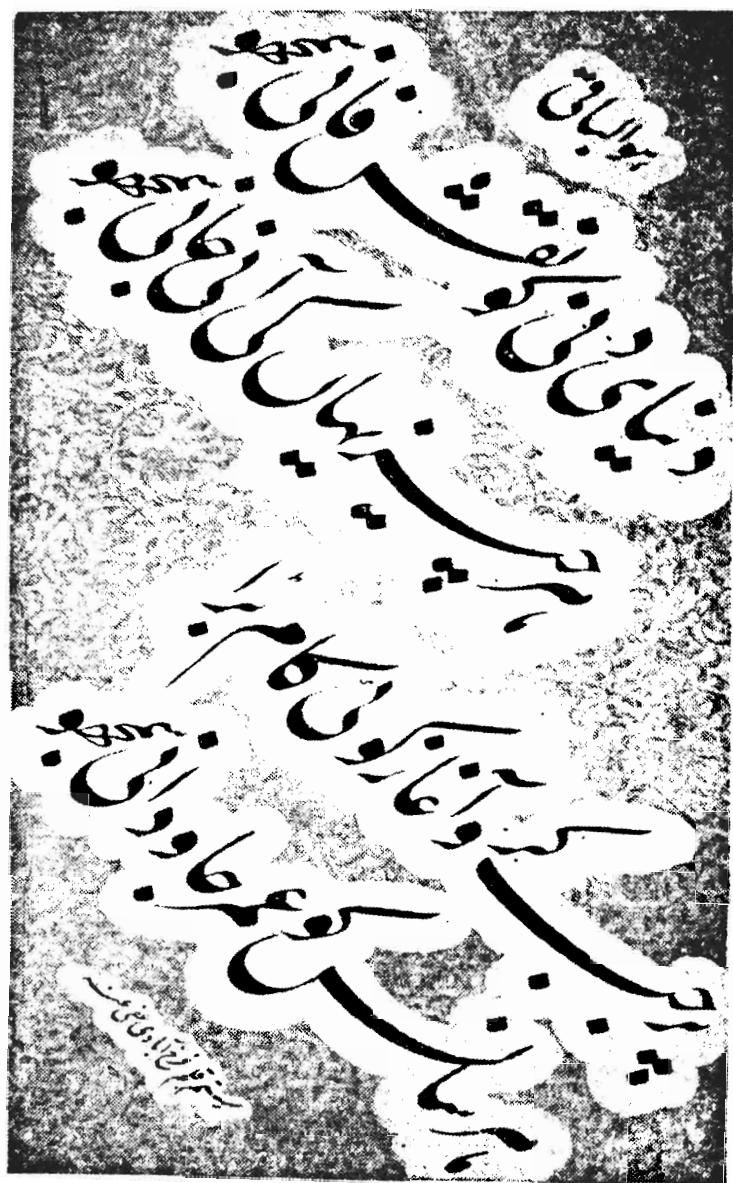
جاری ہوئے تھے۔ اس فیاض ریاست نے بہت سی درس گاہوں کو اس طرح کی امداد دی ہے۔

دوسرے عطیے یہ ہیں۔

سالانہ عطیے۔

تعلیمی سنگھ وردھا — ڈھائی سو روپے ماہوار استادوں کے مدرسہ کے لئے

ریاست کشمیر — " "

جہاز راں کمپنی مغل لائن — " " (وظائف کے لئے)

یکمشت عطیے:۔

۱۔ احمد علاؤالدین صاحب پانچ ہزار روپے

۲۔ کمال یار جنگ بہادر، دو ہزار "

۳۔ نواب زادہ ذوالفقار علی خاں صاحب جاگیردار کرنال۔ پانچ سو روپے

۴۔ عبداللطیف خاں صاحب انجینئر کی معرفت لال چند صاحب مینجنگ ڈائرکٹر پانچ سو روپے

۵۔ قلات کے وزیر اعظم خان بہادر میاں نصیرالدین صاحب۔

۶۔ جامعہ کے سابق طالب علم علی حسن صاحب۔ سنگاپور سے۔ ایک ہزار روپے

نتیجے کے طور پر جامعہ نگر میں دوسری بڑی عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ یہ عمارت مدرسہ ثانوی کے لئے بننے لگی۔

روپیوں کے حاصل کرنے میں یوں تو ہر اس شخص نے شفیق صاحب کا ساتھ دیا جس میں اس کام کی صلاحیت تھی مگر شفیق صاحب نے اس مشکل کام کو ممکن بنا دیا تھا۔ خواجہ عبدالحیٔ منظور احمد صاحب آپ کے خاص ساتھیوں میں تھے۔

۱۹۲۸ء

اب تک انجمن تعلیم ملی کے مختصر دستور اساسی سے جامعہ کا کام چل رہا تھا جو ۳۰ ستمبر میں منظور ہوا تھا مگر جامعہ کے کام کا پھیلاؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک مفصل دستور اساسی کی

ضرورت تھی۔ اس کے مرتب کرنے میں یہ خیال سامنے آیا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو انجمن کے کاموں کا ایک حصہ مان کر کام چلانے کی بجائے کیوں نہ جامعہ ہی کو مقصود مان کر دستور بنایا جائے چنانچہ اس سال انجمن تعلیم ملی کے دو جلسوں میں ایک نئے مسودے پر غور ہوا بالآخر انجمن تعلیم ملی کی بجائے "دستور اساسی جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے ۰ ر دسمبر ۱۹۳۸ء کے جلسے میں یہ دستور آخری شکل میں منظور کر لیا گیا اور ۳ر جون ۱۹۳۹ء کو اسے رجسٹرڈ کرا لیا گیا۔ اس کی چند خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ اس انجمن کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی ہوگا۔

۲۔ اس انجمن کے مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) ہندوستانیوں، خصوصاً مسلمانوں میں ایسی دینی اور دنیوی تعلیم کو جو قومی اور ملی ضرورتوں کے مطابق اور صحیح اصول تعلیم پر مبنی ہو، رواج دینا اور اس مقصد کے لئے مناسب تعلیمی ادارے قائم کرنا، ان کا انتظام کرنا اور ان کی نگرانی کرنا۔

(ب) امتحان لینا اور سند اور تصدیق نامے دینا۔

(ج) اشاعت علوم کا کام کرنا، علمی تحقیقات کا انتظام کرنا اور اس میں مدد دینا۔

(د) تعلیمی تجربات کرنا۔

(ہ) انجمن کے اغراض کے لئے معاہدے کرنا، روپیہ قرض لینا یا دینا، جائداد منقولہ اور غیر منقولہ حاصل کرنا اور اس پر قبضہ رکھنا۔

(و) جائداد منقولہ یا غیر منقولہ خریدنا، یا اس کے کسی جزو یا کل کو، جو سردست انجمن کے قبضہ میں ہو فروخت کرنا، پٹہ پر دینا، تبادلہ کرنا، کاروبار میں لگانا یا کسی اور صورت سے منتقل کرنا۔

(ز) انجمن کے مقاصد کو حاصل کرنے اور اس کے اداروں کو چلانے کے لئے سرمایہ جمع کرنا چندے اور عطیے وصول کرنا،

(ح) اور وہ سب تدابیر کرنا جو مذکورہ بالا مقاصد کے حصول کے لئے ضروری یا مفید ہوں۔

۳۔ اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے مقاصد کے حصول میں انجمن مندرجہ ذیل بنیادی

اصولوں کی پابند ہو گی :۔

(الف) یہ ایک خود مختار تعلیمی جماعت ہو گی جو اپنے دستور اور قواعد ضوابط اور نصاب تعلیم کے بنانے اور ان میں ترمیم و تنسیخ کرنے میں حکومت کی مداخلت یا کسی اور بیرونی مداخلت کو گوارا نہیں کرے گی۔

(ب) یہ کوئی ایسی امداد قبول نہیں کرے گی جس کے ساتھ کوئی شرط اس کے کسی متعہد اصول کے خلاف لگائی گئی ہو۔

(ج) اس کی تعلیم گاہوں میں عام طور پر بذریعہ تعلیم اوّل سے آخر تک اُردو ہو۔ البتہ خاص صورتوں میں دوسری زبانوں میں بھی تعلیم دی جا سکے گی۔

(د) یہ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے پیروؤں میں باہمی رواداری اور دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔

۴۔ انجمن حسب ذیل اراکین پر مشتمل ہو گی۔

(الف) مندرجہ ذیل اشخاص (۱) جو اس عہد نامے پر دستخط کر چکے ہیں تاوقتیکہ وہ عہد نامہ کی پابندی کریں :۔

میں .... ولد .... عہد کرتا ہوں کہ میں بیس سال تک یا تا حیات (ان میں جو مدت بھی کم ہو) انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت کروں گا اور کبھی مبلغ ایک سو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ اپنی خدمت کا نہ لوں گا۔ میں انجمن کے مقاصد اور اس کے دستور کا پوری طرح پابند رہوں گا اور اس دستور کے تحت جو قواعد ضوابط وقتاً فوقتاً بنیں گے ان کی پابندی کروں گا۔

(ب) جامعہ ملیہ کے وہ اساتذہ یا رکن جو آئندہ مذکورہ بالا عہدنامے پر دستخط کریں اور اس کی پابندی کرتے رہیں بشرطیکہ وہ کم سے کم پانچ برس ڈیڑھ سو روپے ماہوار یا اس سے کم پر جامعہ کی خدمت کر چکے ہوں اور بشرطیکہ مجلس منتظمہ ان کے انتخاب کی سفارش کرے

ا ۵ انجمن کے موجودہ ارا کین کی کل تعداد میں کم سے کم ⅔ اس کی تائید کریں۔

(ج) جامعہ کے سابق امنا میں سے مندرجہ ذیل حضرات۔ ۱۔ سیٹھ جمنالال بجاز (وردھا) ۲۔ سیٹھ جمال محمد صاحب (مدراس) ۳۔ مولوی عبدالحق صاحب (دہلی) ۴۔ عبدالمجید خواجہ صاحب (الٰہ آباد) ۵۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی (اعظم گڑھ)

(د) ملک کے سربرآوردہ اشخاص اور جامعہ کے استادوں اور کارکنوں میں سے زیادہ سے زیادہ سات اشخاص، جنھیں جامعہ ملیہ کی قابل قدر خدمات کی بنا پر انجمن کے موجودہ اراکین کی مجموعی تعداد میں سے کم سے کم ⅔ منتخب کرے۔

۵۔ اراکین مذکورہ زیر دفعہ ۴ (الف) و ۴ (ب) بیس سال تک عہد نامہ مندرجہ دفعہ ۴ (الف) کی پابندی کرنے کے بعد تاحیات انجمن کے رکن رہیں گے۔

۶۔ اراکین مذکورہ زیر دفعہ ۴ (ج) تاحیات رکن رہیں گے۔

۷۔ اراکین مذکورہ زیر دفعہ ۴ (د) تین سال کے لئے منتخب ہوں گے البتہ مدت رکنیت ختم ہونے کے بعد پھر منتخب ہو سکیں گے۔

۸۔ انجمن اپنے اراکین میں سے حسب ذیل عہدہ دار منتخب کرے گی۔

۱۔ امیر جامعہ ۲۔ شیخ الجامعہ ۳۔ خازن جامعہ

اس دستور کے مطابق مندرجہ ذیل عہدے دار کام کرنے لگے۔

۱۔ امیر جامعہ	عبدالمجید خواجہ صاحب
۲۔ شیخ الجامعہ	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب
۳۔ خازن	پروفیسر محمد مجیب صاحب
۴۔ مسجّل	حافظ فیاض احمد صاحب

بیسواں سال

اگست ۱۹۳۹ء سے جولائی ۱۹۴۰ء

گذشتہ سال قرول باغ میں استادوں کے مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ جامعہ نگر میں اس کی عمارت کا کچھ حصہ بن گیا تھا، اس مدرسہ کو گاؤں کے ماحول میں کرنا تھا۔ کام کو آگے بڑھانے ٹھیک طریقہ سے چلانے کے لئے عمارتوں کا انتظار رہے تو کام کی رفتار دھیمی پڑجاتی ہے۔ جوش کم ہوجاتا ہے اس لئے طے یہ ہوا کہ جیسے بھی ہو یہ مدرسہ جامعہ نگر میں منتقل ہوجائے۔ جامعہ اسٹور کے ساتھ جو چند کوارٹر بنے ہوئے ہیں یہاں استادوں اور لڑکوں کا رہنا تجویز ہوا۔

اس خیال سے کہ استادوں کا مدرسہ اور مدرسہ ابتدائی میں تال میل رہے، منتقی اسباق میں سہولت ہو، استادوں کے مدرسہ کے پرنسپل سعید انصاری صاحب، اکبر علی صاحب کی جگہ نگران مدرسہ مقرر ہوئے۔ آپ نے اس مدرسہ میں تین نئی چیزوں کی ابتدا کی۔

(۱) اسکاوٹنگ (۲) چڑیا گھر (۳) بچوں کا اخبار

چڑیا گھر کا انتظام عتیق احمد صاحب کے سپرد کیا۔ آپ کو ان چیزوں کا نہ صرف شوق تھا بلکہ اپنا کام لگن سے کرتے تھے۔

چڑیا گھر کا کام ابتدائی حالت میں تھا۔ یوں سمجھئے کہ ایک کٹیا کے تین حصے کرکے اس میں

طوطے، مینا، فاختہ، لال، خرگوش کے لئے جگہ نکال لی گئی تھی۔ کبوتروں کے کابک علیحدہ تھے۔ بطخوں کے تیرنے کے لئے چھوٹا سا حوض بنا دیا گیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال اگرچہ متعلقہ جماعت کرتی ہے لیکن بشیر احمد صاحب جمعدار بھی اس سے غافل نہیں رہتے ہیں۔

اسکاؤٹنگ کا انتظام محمد عمر صاحب کے سپرد ہوا۔ آپ کی خوش وضعی اور ملنساری مشہور تھی۔ آپ کی امداد کے لئے راجہ نذیر احمد صاحب جیسے مستعد اور رضا کار استاد تھے۔

تیسرا کام یعنی "بچوں کا اخبار" میرے سپرد کیا گیا۔ یہ پندرہ روزہ دیواری اخبار تھا۔ حسب عادت اس کا بھی سال بھر کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس پروگرام کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مدرسہ کی دلچسپیاں موسم کی تبدیلیاں تہواروں کے زمانے کے مطابق ہر مہینے ایک نئے انداز میں یہ دیواری اخبار نکلا کرتا تھا جس میں تصویریں بچوں کے مضامین سے متعلق اقتباسات شائع ہوتے تھے۔ کتابت کا کام مضمون نگار کے ذمے تھا۔ اخبار کے لئے مہینے بھر کا کام تمام جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ استاد اس کام کو نصاب کا جزو بنا کر پورا کرتے تھے۔

تعلیمی سال کے شروع ہونے سے لے کر ختم ہونے تک جس ترتیب سے یہ اخبار نکلا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:-

اگست کا مہینہ ابتدائی کاموں کی وجہ سے خالی رہا۔

ستمبر میں (۱) "برسات" اور (۲) "حفظان صحت" نمبر نکلے۔

اکتوبر میں (۳) "سیر و تفریح" اور (۴) "تاسیس نمبر"

نومبر میں (۵) "عید" (۶) "دیوالی" نمبر

دسمبر اور جنوری (۷) "سردی" اور (۸) "عید اضحیٰ" (مع محرم) نمبر نکلے۔

فروری میں (۹) "بہار" اور (۱۰) "ڈراما نمبر"

مارچ میں (۱۱) "میلاد النبی" (۱۲) "ہولی نمبر"۔

اپریل میں (۱۳) "قومی ہفتہ" اور (۱۴) "گرمی" نمبر

مئی میں (۵۱ء) ۔ سالنامہ " نکلا جس میں سال بھر کے اچھے اچھے مضامین اور تصویروں کا انتخاب تھا۔ اس سال کتب خانہ بھی میرے ذمہ رہا۔ ذیل کے پروگرام پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی :۔

۱۔ اعلانات (پوسٹر) کے ذریعہ کتابوں کے حوالے سے طلبا میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنا۔

۲۔ نئی کتابیں یا رسالے کتب خانہ میں آنے پر دلچسپ اعلانات شائع کرنا۔

۳۔ ہر ایک استاد اور طالب علم کا ذاتی کھاتہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ سال بھر میں کس نے کتنی کتابیں پڑھی ہیں۔

۴۔ منتخب کتابوں کا مطالعہ کرا کے لڑکوں سے ان پر تبصرہ لکھوانا اور انعامات دینا۔

۵۔ شعراء اور مصنفوں کی تصویر کے نیچے ان کی تصنیفات کی فہرست۔

قومی ہفتہ کے دن لڑکوں نے " دیانت " اور " قوم پرست طالب علم " ڈرامہ کئے۔ پوربی زبان میں جو نقل سیف اللہ نے کی تھی اسے دیکھ کر حاضرین لوٹ لوٹ گئے۔

نواب صاحب رام پور کے تشریف لانے پر لڑکوں نے ایک سپاسنامہ پیش کیا پھر عصرانہ دیا گیا۔ آپ کے ہمراہ ریاست کے وزیر اعظم سید بشیر حسین صاحب زیدی بھی تھے۔ دیگر مہمانوں میں ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری، سر رضا علی صاحب اور خواجہ حسن نظامی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ بچوں کے سپاسنامے کو نواب صاحب اور دوسرے مہمانوں نے بہت پسند فرمایا۔ اسکاؤٹ بچوں نے نواب صاحب کو " گارڈ آف آنر " دیا۔ نوٹ سیکھنے والے نے اپنے کمالات دکھائے۔

اس سال تعلیمی مرکز کی ایک خاص چیز کمزور طلباء کی کمزوری دور کرنے کا ایک تجربہ تھا۔ یہ کام اس مدرسہ کے استاد محمد اکرام خاں صاحب کے سپرد ہوا جو تیسری جماعت کو پڑھا رہے تھے اس جماعت کے ۸ بچوں میں عام طور سے پڑھنے اور گنتی کی ہمارت کی کمی تھی آپ نے مختلف کھیلوں اور گتے کے کام کے ذریعہ ان بچوں میں خود اعتمادی اور عام مقبولیت کا جذبہ پیدا کیا انھیں کہانیاں سننے، دوسروں کو کہانیاں پڑھ کر سنانے اور زبانی کہانیاں سنانے کا کام شروع ہوا ساتھ ہی

سے تو پڑھی ہوئی کہانیوں کو اپنی زبان میں لکھنے، کھیلوں کی رپورٹیں لکھنے، گتے کی بنائی چیزوں کا حال لکھنے
ان کا حساب کتاب رکھنے اور سیر تفریح کا حال مدرسے کے جلسوں میں سنانے کی کوششوں سے ان طلبا میں لکھنے
پڑھنے اور حساب کرنے کا شوق پیدا ہوا اس کام میں اس کتب خانہ سے بھی بہت مدد ملی جو جماعت کے ان
"کمزور" طالب علموں نے خود اپنی جماعت کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابوں سے بنایا تھا۔

مدرسہ ثانوی کا کام سال بہ سال ترقی کرتا جا رہا تھا جس طرح مدرسہ ابتدائی والے
پروجیکٹ کے جلسوں میں ان کاموں کی نمائش لگاتے اور اپنی کارگذاری کو ظاہر کرتے ہیں۔
اسی طرح ثانوی والوں نے بھی اس قسم کے کاموں کی طرف توجہ کی، تاسیس کے جلسوں میں
تمام ادارے حصہ لینے گئے تھے۔ ثانوی والوں نے قومی ہفتہ کو اپنا کر مختلف قسم کا دو دن
کا پروگرام بنایا جس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

۱۲ اپریل، ۸ بجے صبح کو جلسہ مباحثہ منعقد ہوا۔ عنوان تھا "اس ایوان کی رائے
میں اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے"۔ مدرسہ ثانوی جامعہ کے ایک طالب علم نے
تجویز پیش کی اور دوسرے نے مخالفت میں تقریر کی اس کے بعد عربک ہائی اسکول، فتحپوری
مسلم ہائی اسکول اور راجبس ہائی اسکول کے نمائندوں نے تقریریں کیں۔ آخر میں تجویز پر
رائے لی گئی تو بہت بڑی اکثریت سے منظور ہو گئی۔

سہ پہر کو ۴ بجے سے ۶ بجے تک طلبا کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش کی گئی اور
۸ بجے رات کو ایک ڈرامہ ہوا۔ ڈرامہ کا عنوان تھا "شاعر کی دنیا" دوسرے دن یعنی ۱۳
اپریل کو ۸ بجے صبح سے ۱۱ بجے تک ادبی مجلس ہوئی جس میں مدرسہ ثانوی کے طالب علموں
نے اپنے لکھے ہوئے مضامین سنائے۔ سہ پہر کو ۴ بجے سے ۶ بجے تک طلبہ کی بنائی ہوئی
چیزوں کی دوبارہ نمائش کی گئی اور ۹ بجے رات کو انگریزی ڈراما Handy
and the post اسٹیج کیا گیا۔

اُردو کا ڈراما سید وقار عظیم صاحب نے کرایا تھا۔ وقار صاحب کو اردو ادب سے

دلچسپی ہے، تنقیدی نگاہ اچھی ہے، اس پروجکٹ میں ثانوی کے ایک طالب علم احمد دین نے ناظم کا کام اس خوبی سے انجام دیا کہ پورے مدرسہ میں ایک بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ اس پروجکٹ کی کامیابی کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگر طالب علم بھی چاہیں تو استادوں کے محض اشاروں پر وہ بڑا کام انجام دے سکتے ہیں پھر ثانوی کے طلباء میں اپنا کام آپ کرنے کی صلاحیت دن بدن بڑھتی رہتی ہے۔

منزل ثانوی کی ایک جماعت تعلیمی سیر کے لئے روانہ ہوئی۔ اجمیر، جے پور، چتوڑ گڑھ، اودے پور کے تاریخی مقامات دیکھے۔ جے پور میں کنور عبدالباقی خاں صاحب سابق جامعی کے یہاں بطور مہمان ٹھیرے تھے۔

اس خیال سے کہ استادوں کے مدرسہ کے طلباء کو جامعہ کے اور بچوں سے ملنے جلنے اور انھیں سمجھنے کا موقع ملے، استادوں کے مدرسہ کی انجمن طلباء نے اپنے سالانہ پروگرام میں دو چیزوں کو جگہ دی۔ ایک تو جامعہ کے بچوں میں کھیلوں کا مقابلہ، دوسرے بچوں کے مشاعرے کا انتظام، یہ دونوں چیزیں اسی سال شروع ہوئیں۔

استادوں کے مدرسہ کے طلباء کے لئے ایسا کام تجویز ہوا جس میں پندرہ دن کے لئے کسی قریب کے دیہات میں کیمپ لگائیں۔ وہاں اسکاؤٹنگ سیکھنے کے علاوہ اس دیہات کے لڑکوں میں صفائی و حفظان صحت کا خیال پیدا کریں۔ اس کے لئے دیہات کی صفائی اور ان کی تفریح کے لئے کیمپ فائر اور ہو سکے تو ڈرامے کا پروگرام رکھا گیا۔ ہر سال پندرہ دن کے لئے کسی پر فضا مقام پر ڈیرا ڈالتے ہیں۔ اس سال اخلاص احمد صدیقی صاحب اور سکسینہ صاحب آرگنائزر ہندوستان اسکاؤٹنگ ایسوسی ایشن کی وجہ سے اس کام میں جان پڑگئی تھی۔ لڑکوں نے کھیل کھیل میں بہت کچھ سیکھا صدیقی صاحب نے تھوڑے دنوں میں جس طرح ایک منظم جماعت پیدا کر دی تھی، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے

"انجمن اتحاد" نے دو خاص کام انجام دئے۔ ایک تو انٹر کالج، مباحثہ (دہلی کے

تمام کالجوں کے درمیان تقریروں کا مقابلہ) اس میں عربک کالج، لا کالج، دہلی یونیورسٹی اور جامعہ کے لڑکوں نے حصہ لیا تھا۔ دوسرے مولوی عبدالحق صاحب کی سترویں سال گرہ کی خوشی میں رسالہ "جوہر" کا "عبدالحق ادب نمبر" نکالا۔

۷ار نومبر ۱۹۳۹ء کو جب کفیل خان یا نظام خان چپراسی نے گھنٹی کی گھنٹی بجادی تو طلباء، اساتذہ جماعتوں سے باہر نکل آئے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب صحتیاب ہو کر اچانک جامعہ نگر پہنچے ہیں۔ انجمن اتحاد نے دوسرے دن جلسہ کیا "سپاسنامہ" پیش کیا جواب میں آپ نے فرمایا:۔

"مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان چند مہینوں کی میری غیر حاضری میں جامعہ کے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ اب جامعہ اتنی مضبوط اور مستحکم ہوگئی ہے کہ ہم سب مل کر اس کی مخالفت کریں اور اس کو مٹانے کی کوشش کریں تو بھی ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جامعہ اب ایک ایسا نادر درخت ہے جس کی جڑیں بہت نیچے اور بہت دور تک پہنچ چکی ہیں اور جسے بڑی سے بڑی آندھی بھی متزلزل نہیں کرسکتی۔"

اُستادوں کے مدرسے کی انجمن طلباء میں ایک سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا:۔

اس وقت اگر کانگریسی وزراء نے استعفیٰ دے دئے ہیں تو ہمیں اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ یہ ہمارے لئے بہت مفید ہے۔ جب وقت ہماری حکومت برائے نام برسر اقتدار آئی تو اس تعلیمی تحریک میں اچھے اور بُرے ہر قسم کے لوگ بھر گئے مگر جب ہماری حکومت نہیں ہوگی تو اس میں صرف وہی لوگ آئیں گے جنھیں اُس سے دلچسپی ہوگی۔ اس کی اچھائیوں کا یقین رکھتے ہوں گے۔ اس کی خوبیوں کے معترف ہوں گے۔ جب ہم اس میں کامیابی حاصل کرلیں گے اور تجربہ کا دور ختم ہو جائے گا تو اس وقت اگر ہماری حکومت ہوئی تو یہ اسکیم پھر عام ہو جائے گی۔"

دوسرے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ :-

"اگر آپ لوگ حکومت کا سہارا چھوڑ کر دیہاتوں میں چلے جائیں اور وہاں بچوں کو تعلیم دینے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ غریب دیہاتی آپ کو بھوکا نہ رہنے دیں گے"

رجسٹریشن ایکٹ کے تحت ۴ جون ۱۹۳۹ء کو جامعہ کے دستور کی رجسٹری کرائی گئی تھی اس دستور میں اور جامعہ کے خط و کتابت والے کاغذوں پر جامعہ کا نشان بنا ہوا ہے۔ پیام تعلیم والوں نے بچوں کے لئے اس کی تشریح کی درخواست کی تو ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھ کر دیا۔

جانتے ہو اس نشان کا مطلب کیا ہے۔؟ دیکھو اس میں سب سے اوپر ایک ستارہ ہے جس میں لکھا ہے، اللہ اکبر۔ جب اندھیری رات میں غریب مسافر جنگل بیابان میں سفر کرتے ہوئے راہ بھٹک جاتے ہیں، کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا تو وہ ستاروں کو دیکھ کر راستہ نکالتے ہیں۔ جامعہ والوں کو راستہ بتانے والا ستارہ یہی "اللہ اکبر" کا ستارہ ہے۔ ان کی نظر اسی پر جمی ہے یہی دنیا کی اندھیاری میں انھیں راہ بتاتا ہے اس لئے کہ یہ جتاتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے جس نے اس کے آگے سر جھکایا، اس نے سچی زندگی کا پتہ پایا اس کے سامنے جھک کر پھر یہ سر کسی اور کے سامنے کیسے جھک سکتا ہے۔ اس چمکتے ہوئے ہدایت کے تارے کے نیچے ایک کتاب ہے، جس پر لکھا ہے "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ" یہ کتاب قرآن پاک ہے، اسی سے خدا نے اپنے بندوں کو اپنی مرضی کا پتہ دیا کہ وہ کیا چاہتا ہے کس طرح نیکی کرکے، آپس میں ایک دوسرے کو بھائی بھائی جان کر، غریب امیر کا فرق مٹاکر، رنگ روپ کی تمیز ہٹا کر آقا اور غلام کی تقسیمیں مٹا کر اس کے بندے، اچھے سچے بندے بن سکتے ہیں، اسی کتاب نے آدمیوں کو تاریکی سے روشنی میں پہنچایا اور جو راہ بھٹک گئے تھے انھیں بھی سیدھی راہ بتائی

اور اسی کے لانے والے نے اپنی پاک زندگی کی مثال سے اپنی آنکھوں کی تاثیر اور دل کی گرمی سے ایک گروہ ایسے نیک آدمیوں کا تیار کر دیا جس نے دنیا سے طرح طرح کی برائیوں کو مٹا دیا اور اس میں خدا کی سچی برادری قائم کی۔

اس نشان کے دونوں طرف کھجور کے دو پیڑ ہیں، یہ کیا ہے؟ یہ اس دیس کا نشان ہیں جہاں خدا کا یہ آخری پیام لانے والا پیدا ہوا۔ اس بنجر وادی کا نشان جس میں یوں تو کچھ اگتا نہ تھا، پر جہاں دین الٰہی کے پودے نے جڑ پکڑ لی۔ جو لوگ ناموافق حالات سے اپنے کاموں میں گھبرا جاتے ہیں ان کے لئے یہ درخت ڈھارس کا سامان ہیں کہ اس دیس سے جہاں ان کھجوروں کے سوا اور پھول بوٹا نام کو نہ تھا ہدایت کے چشمے ابل پڑے جن سے دلوں کی بستیاں سیراب ہو گئیں پھر تم ظاہری حالات کو دیکھ کر کیوں تھر تھرانے ہوتے ہو"

" سب سے نیچے ایک پتلا سا ہلال ہے جس میں لکھا ہے "جامعہ ملیہ اسلامیہ" یہ ہلال ابھی چھوٹا سا ہے لیکن جیسے ہلال بڑھ کر چودھویں رات کا چاند بن جاتا ہے اسی طرح یہ جامعہ جس کے کام کی ابھی ابتدا ہے انشاء اللہ بڑھ کر روشن چاند بنے گی اور دیکھنے والوں کی آنکھوں کا سرور ہو گی، مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے سب بچے ان باتوں کو اپنے دل میں جگہ دیں گے جو جامعہ کے اس چھوٹے سے نشان میں چھپی ہوئی ہیں اور بڑے ہو کر ایسے اچھے آدمی بنیں گے کہ ان کی بھلائی سے خود ان کا ان کے خاندان کا ان کے دیس کا اور ساری انسانیت کا نام اجاگر ہو گا۔

" بچو! نیک بنو، نیکی کرو، جاگو اور جگاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان ننھے ننھے ہاتھوں سے کیا کر سکتے ہو، ان ننھے ہاتھوں میں بڑا زور چھپا ہوا ہے اس زور کو کام میں لاؤ۔ اور اپنے لئے اور دوسروں کے لئے برکت کا سبب بن جاؤ"

اس سال ایک نئے کام کی ابتدا ہوئی وہ ہے، بیت الحکمۃ، مولانا عبید اللہ صاحب

سندھی مرحوم جو ہندوستان کے مشہور عالم اور رہنما تھے۔ سالہا سال کی جلاوطنی کے بعد جب ہندوستان لوٹے تو ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر آپ نے یہ طے کیا کہ عمر کا باقی حصہ جامعہ ملیہ کی آزاد فضا میں گذاریں گے چنانچہ "بیت الحکمت" کے نام سے آپ نے ایک ادارہ کی ابتدا کی جس میں طلباء کو شاہ ولی اللہ صاحب کا فلسفہ اور قرآن مجید کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے۔ آپ کے خاص رفیقوں میں محمد سرور صاحب تھے جو اس ادارے کے ناظم بھی تھے۔ آپ نے بی۔اے۔ کے امتحان میں اسلامیات اور عربی میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ سرور صاحب کو مولانا کی تعلیمات سے بہت دلچسپی تھی آپ نے مولانا کے خیالات کو کتابی شکل میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کا نام ہے "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" محمد عرفات صاحب نوری بھی رفیقوں میں سے تھے۔ آپ نے مدرسہ نورالعلوم (بہرائچ) میں تعلیم پائی ہے۔ اسلامیات سے دلچسپی تھی۔

اس سال مہمانوں کی اتنی کثرت رہی کہ پچھلے انیس سال کا رکارڈ پیچھے رہ گیا۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم اور وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، جامعہ کے سابق طالب علم پیر الٰہی بخش صاحب وزیر تعلیمات صوبہ سندھ ان دونوں حضرات کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے گئے۔

نورالحسن صاحب برلاس اردو پروفیسر ٹوکیو (جاپان) یونیورسٹی اور مسز برلاس ڈاکٹر آر۔ ایس۔ اگروال، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا آزاد سبحانی نے "انجمن اتحاد" کے جلسوں میں تقریریں کیں۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے مولانا عبیداللہ صاحب سندھی سے ملاقات کی اور جامعہ کے کاموں کو دیکھا۔

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی جامعی کی نگرانی میں دارالعلوم، ندوۃ العلماء کے لڑکوں کی ایک جماعت جب دہلی کے تاریخی سفر پر آئی تو اس نے جامعہ کے کاموں کو بھی دیکھا بھالا۔

اسی سال لاہور سے خبر آئی کہ جامعہ کے سابق استاد عبدالکریم صاحب فاروقی کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کی ظرافت اور خوش طبعی سے لڑکے ان سے بہت مانوس تھے۔

اُستادوں کے مدرسہ کے کتب خانہ کے لئے جنوری ۱۹۳۹ء میں تعلیمی سنگھ نے آٹھ سو روپئے دئے تھے، اس سال (جون ۱۹۴۰ء میں) اس کے ورک شاپ کے لئے دو ہزار روپئے یکمشت دئے۔ اس کالج کی عمارت کا ایک حصہ (جہاں اب تعلیم دی جاتی ہے) بن چکا تھا۔ مدرسہ ابتدائی کی عمارت کے مقابل دوسری بڑی عمارت تکمیل پانے والی تھی، پہلی دفعہ ریاست حیدرآباد کے یکمشت ۵۰ ہزار روپیوں کے عطیے سے پہلی عمارت بنی تھی۔ اب اس دوسری عمارت کے لئے بھی اسی ریاست نے (جون ۱۹۳۹ء میں) ایک لاکھ روپے دیئے۔

جامعہ کی ان عمارتوں کے نقشے مسٹر ہائنس نے بنائے تھے۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر لوگ حیرت کرتے ہیں کہ ان فقیروں نے ایسی شاندار عمارتیں کیسے بنالیں۔ پھر ان کا طرز بھی ہر نظر کو اپنی طرف کھینچتا ہے ہو سکتا تھا کہ ہم اتنا ہی روپیہ خرچ کرتے اور کوئی بھدّی سی عمارت بنالیتے مگر جب جامعہ کے پاس ایک پیسہ بھی عمارتوں کے لئے نہ تھا، اس وقت بھی جامعہ والے اچھے نقشے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ نقشہ بنانے کے لئے روپیہ تو دینے کو تھا نہیں، مفت ہی کام نکالنے کی فکر تھی، ایک نقشہ کسی بڑے سرکاری انجینئر سے بنوایا گیا، ایک علی گڈھ کے ایک نوجوان انجینئر نے بنایا، جامعہ والوں نے بھی طبع آزمائی کی۔ اسی زمانے میں کہیں ذاکر صاحب حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک جرمن انجینئر مسٹر کارل ہائنس (Carl Heinz) سے ملاقات ہوگئی۔ سنا ہے کہ یہ ایک ترکی شاہزادے پرنس عبدالکریم کے ساتھ حیدرآباد پہنچے تھے۔ وہاں نہ جانے کیسے جامعہ عثمانیہ کے ایک پروفیسر صاحب کے یہاں مہمان ہو گئے۔ پرنس تو آگے بڑھ گئے، شاید جاپان چلے گئے اور یہ ہائنس صاحب یہیں رہ پڑے۔ لاأبالی سے آدمی ہیں۔ بس اپنے فن کی دھن میں باتیں کرتے کرتے درجنوں نئے خیالات بتادیتے ہیں۔ ذاکر صاحب سے جرمن جاننے کی وجہ سے جلد ہر آم
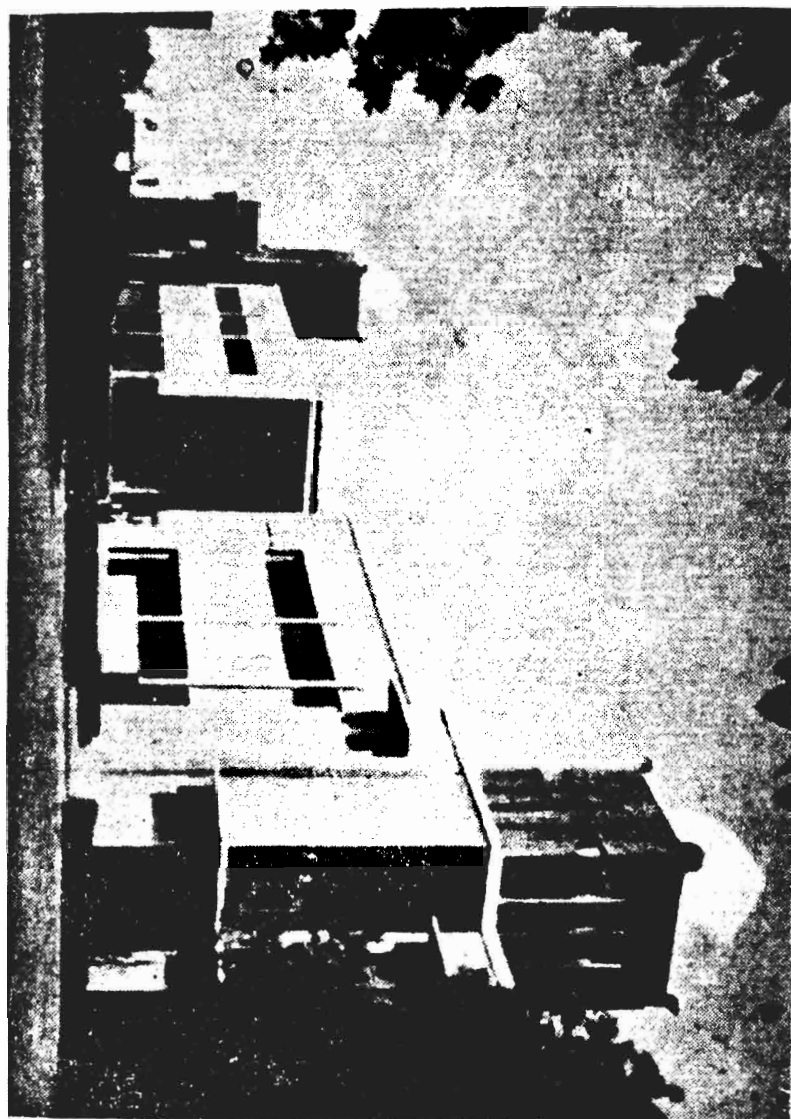
ہو گئے۔ ذاکر صاحب نے موقع غنیمت سمجھا اور جامعہ کے لئے نقشہ بنانے کی فرمائش کردی۔
دیوانہ کو "ہو" کا بہانہ۔ ہائنس صاحب نے انھیں حیدر آباد کی ملاقاتوں میں کئی تجویزیں تیار
ڈالیں مگر ذاکر صاحب سے ان پر بحث و گفتگو کے بعد کہتے کہ بدل دوں گا۔ دوسری دفعہ
ملتے تو معلوم ہوتا کہ وہ نقشہ پھاڑ ڈالا، دوسرا تیار ہے۔ یوں ہی روز نئے نئے نقشے بنتے رہے
مگر کچھ طے نہ ہوا۔ ذاکر صاحب دہلی آگئے۔ دو چار مہینے بعد ہائنس صاحب بھی آن موجود
ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن رات کو قرول باغ میں ذاکر صاحب کے مکان پر دستک دی۔
ان دنوں ذاکر صاحب کی اہلیہ بھی موجود نہ تھیں۔ گھر میں صرف ذاکر صاحب اور مجیب صاحب
رہتے تھے بجلی اس وقت تک وہاں لگی نہ تھی۔ ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ بارش ہو رہی تھی کہ
یہ حضرت وارد ہوئے، سر سے پیر تک تربتر بھیگی مرغی، رات ایک بان کی چارپائی پر کاٹی۔
صبح حوائج سے فراغت میں بھی ویسی ہی دقتیں پیش آئیں جیسی ہندوستان والوں کو پہلے پہل
یورپ میں پیش آتی ہیں مگر یہ آرٹسٹ آدمی تھے، سب جھیل گئے اور لطف یہ کہ مزے لے کر۔
اب ان کی اور ذاکر صاحب کی بڑی دوستی ہوگئی اور اسی زمانے میں انھوں نے یہ نقشہ بنایا
جس کو بعد میں تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ منظور کیا گیا۔ عمارت کا طرز ایک نیا طرز ہے اس میں
موجودہ طرز کے خطوط بھی ہیں، اسلامی شان بھی ہے، حسن بھی ہے، قوت بھی ہے، ہائنس ہیں
تو جدید طرز کے ماہر، پیرس میں تعلیم پائی ہے مگر مقلد نہیں ہیں کہتے ہیں کہ عمارت جس کام
کے لئے ہو اس سے اس کی سیرت پیدا ہوتی ہے۔ معمار میں احساس حسن ہوتا ہے تو صحیح
تناسب سے سب کچھ بنتا ہے، اچھا معمار کسی دوسرے کی تقلید نہیں کرتا ہے۔ ان سے کسی نے
پوچھا کہ جامعہ کی عمارت کس طرز کی ہے تو بولے "جامعہ طرز" کی۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے
کہ ہائنس نے یہ سب کام بے پیسہ کے کیا اور اگرچہ دوسری جگہ انھیں خوب پیسہ ملتا تھا حیدر
آباد، بھوپال، اور کشمیر میں انھوں نے اچھا روپیہ کمایا لیکن جامعہ کا کام ابتدائی زمانے میں
مفت کیا۔ روپے کی طرف سے کچھ ہیں بھی بے نیاز سے۔ جب ملتا ہے تو اسے پاس رکھنا نہیں

جانتے اور نہ ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ دوست احباب میں سب تقسیم کر دیتے ہیں، پھر وہی تہی دست کے تہی دست۔

خواجہ لطیف حسن صاحب انجینئر کا ذکر ستر ھویں سال کی کہانی میں آگیا ہے، ان کے نقشوں کو سمجھ کر ان کے مطابق راجوں سے کام لینے میں مستری عبداللہ صاحب بڑی مہارت رکھتے تھے۔ عمارتوں کے کام پر آپ کی نگاہ اچھی تھی۔ نقشہ کی باریکیاں سمجھ لیتے تھے۔ اقامت گاہ نمبرا و نمبر ۲ کے پچاس فٹ لمبے لنٹل کے کام میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ کھڑی اینٹیں نوانچ کی چوڑائی میں اس طرح لگی ہیں کہ سریئے کا نشان کہیں دکھائی نہیں دیتا ہے، عمارتوں کا کام جاننے والے اس لنٹل کو دیکھ دیکھ کر تعجب اور حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ مستری صاحب کہتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء سے پہلے کی عمارتوں میں یہ کام کہیں نظر نہ آئے گا سب سے پہلے آپ ہی نے اس ترکیب سے لنٹل باندھا ہے۔

اس دفعہ تعمیرات کے ناظم سعید انصاری صاحب تھے۔ آپ ہی کے زمانے میں یہ عمارت مکمل ہوئی۔

جامعہ کی عمارتوں کا کام شروع ہوتے ہی استادوں میں سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں (۱) پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنا مکان بنوایا۔ جہاں تک شوق کو پورا کرنے کا تعلق ہے (۲) میرا شمار دوسرا ہے اسی سال کے ختم ہونے تک علی الترتیب (۳) برکت علی صاحب (۴) سید مجتبےٰ حسین صاحب (۵) سید صغیر احمد صاحب (۶) نور محمد صاحب، (۷) محمد سرور صاحب (۸) منشی مختار احمد صاحب (۹) پروفیسر محمد عاقل صاحب (۱۰) مولانا محمد اسلم صاحب کے مکانات تیار ہوئے ہیں اگلے سال (۱۱) حافظ محمد فیاض صاحب۔ اور (۱۲) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے بھی اپنے مکانات مکمل کرالئے۔

جامعہ نگر اور اُس کے آس پاس کا علاقہ
دریا اور نہر
پہاڑیاں
سڑک
سرحد موضع جوگا بائی
سرحد موضع جسولہ
اُستادوں کے مکانات
اقامت گاہیں
بڑے مکانات
دریا
دریائے جمنا
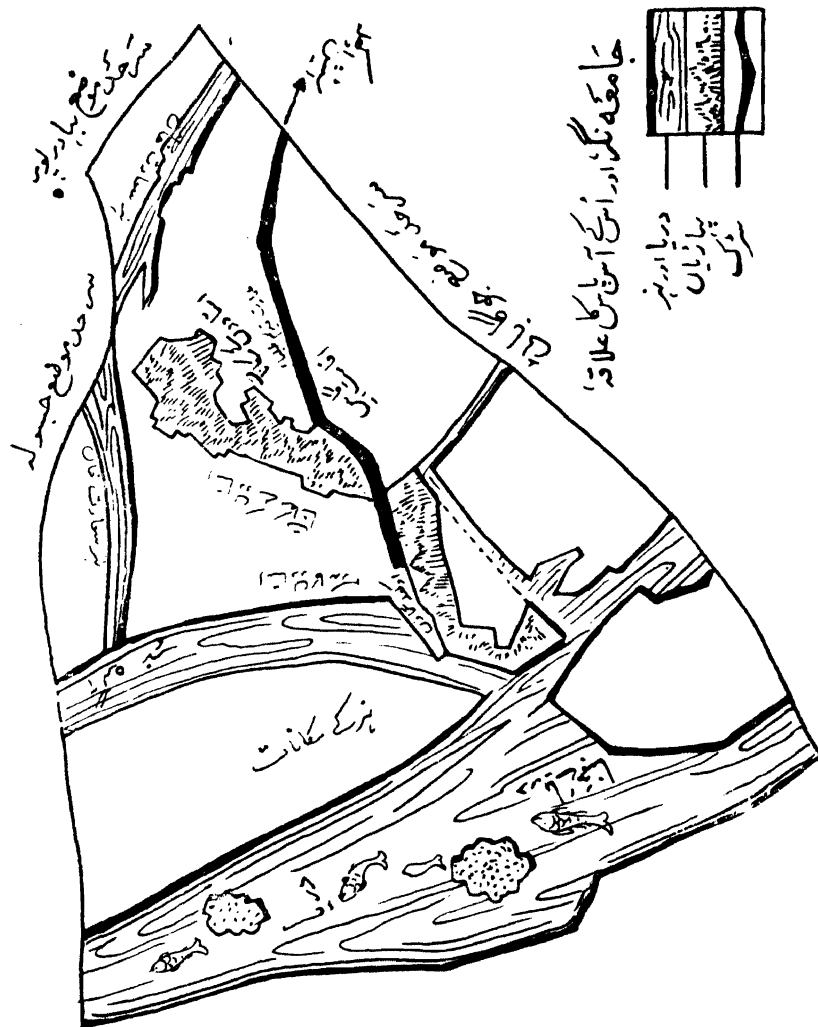
اکیسواں سال

اگست ۱۹۴۰ء سے جولائی ۱۹۴۱ء

جامعہ کی زندگی میں یہ پہلا سال تھا کہ اس کے بیشتر شعبے اپنی عمارتوں میں منتقل ہو گئے یعنی مدرسہ ثانوی اور کالج والوں نے بھی جامعہ نگر کو آباد کیا۔ گو جگہ کی تنگی اب بھی ہے مگر بیس سال سے کرائے کی عمارتوں پر جو کثیر رقم خرچ ہو رہی تھی اس سے تو نجات ملی۔ ہم لوگوں نے اس تبدیلی کو اس طرح محسوس کیا جیسے بیس سال کے جلاوطن جنھیں گھر واپس آنے پر اپنے مکانوں میں رہنے کی اجازت ملی ہو۔

سامنے کا نقشہ جامعہ نگر اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ اسٹیشن اوکھلا کے قریب دہلی سے متھرا جانے والی سڑک سے ایک اور سڑک نکلتی ہے جو مشرق کی طرف مڑ جاتی ہے یہ دریائے جمنا پر جا کر ختم ہوتی ہے اس کا فاصلہ ڈیڑھ میل ہے۔ اس کے دونوں طرف سائے دار درخت ہیں، اسی علاقہ میں "جامعہ نگر" آباد ہے۔ اگر ہم اس سڑک پر مشرق کی طرف رخ کر کے چلیں تو دائیں طرف "انجمن طلبائے قدیم" اور استادوں کے مکان نظر آئیں گے، بائیں طرف عالی شان عمارتیں لڑکوں کے رہنے کی ہیں۔ آگے بڑھیں تو

اسی طرف ڈاکٹر انصاری کا خوب صورت مقبرہ دکھائی دے گا۔ یہاں سے سڑک جنوب مشرق کی طرف مڑ جاتی ہے۔ دائیں طرف کچھ اور مکانات نظر آئیں گے یہ "استادوں کا مدرسہ" اور استادوں کے مکانات ہیں جس جگہ سڑک ختم ہوئی ہے یہ اوکھلا گاؤں ہے۔ یہاں سے نہر کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ یہ نہر "نہر جمن غربی" کہلاتی ہے اور "آگرہ نہر" کے نام سے مشہور ہے یہاں سے جمنا ایک فرلانگ ہے۔ یہ ایک پارک سا ہے جو گھنے درخت، گھاس کے تختوں، پھولوں کی کیاریوں اور بجری کی سڑکوں سے آراستہ ہے۔ لیجئے ہم دریائے جمنا پر پہنچ گئے آیئے ان بنچوں پر بیٹھ جائیں۔ صبح کا سہانا وقت ہے۔ ٹھنڈی ہوا، بگلوں کا اڑنا، سورج کا عکس پانی میں، موجوں کا ہلکا اور بھاری ہونا۔ جامعہ کے لڑکے اور استاد ان چیزوں سے لطف لیتے ہیں۔ ہماری عمارتیں یہاں سے قریب ہی ہیں۔ شہر کے ہنگاموں سے دور، دریا سے آدھ میل اوپر پھر اوکھلا جیسا پر فضا مقام ایک درسگاہ کے لئے اور کیا چاہئے۔

یہ کون ہے لڑکوں کی قطاریں استادوں کی نگرانی میں چلی آرہی ہیں۔ گرمی کا زمانہ ہے صبح صبح پیراکی کا لطف اٹھائیں گے ورزش بھی ہو جائے گی اس معاملے میں ہم لوگ احتیاط سے کام لیتے ہیں پیراکوں کی نگرانی میں لڑکے یہاں آتے ہیں باقاعدہ حاضری ہوتی ہے۔ پھر ان کے چھوٹے چھوٹے فریق بنا کر ایک ایک پیراک کے سپرد کر دیتے ہیں جو انھیں پیرنا سکھاتا اور ان کی نگرانی کرتا ہے۔ لائف بلٹ، رسے، بڑے کی قمیص اور دوسرا ضروری سامان موجود رہتا ہے۔ ضیاء الدین صاحب کی نگرانی میں "پیراکی کلب" بھی اسی سال قائم ہوا تھا۔ ضیاء صاحب حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں جہاں تالابوں اور باؤلیوں کی کثرت ہے یہ بڑے مشاق پیراک ہیں۔ ان دنوں کھیلوں کے ناظم جمیل الرحمٰن صاحب تھے آپ نے کئی سال تک اس کام کو ہنسی خوشی انجام دیا۔ آپ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ لڑکے کھیل سیکھ رہے ہیں۔ آپ کی خوش مزاجی اور قہقہے کھیل کے میدان کو پر مسرت بنا دیتے تھے۔

یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ مدرسہ ثانوی اور کالج کے کھیلوں کی تنظیم کے ذمہ دار رعان اے۔ جے۔ کیلاٹ تھے۔ ہم نے اس سے پہلے کئی جگہوں پر آپ کا ذکر کیا ہے۔

عبدالحمید صاحب کی کوششوں سے چمن بندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ حمید صاحب جامعہ کے سابق طالب علم ہیں۔ گو پڑھے لکھے ہیں لیکن کسانوں کی طرح پھاوڑہ کدال چلانے کا کام بڑے شوق سے کرتے تھے۔ آپ کی نگرانی میں نقیر امالی نے چمن کو آراستہ کرنے میں بڑی محنت سے کام کیا۔

آئیے اب جماعتوں کا کام اور ان کی دلچسپیوں کو دیکھیں۔

ایک نئے جلسے کی ابتدا، مدرسہ کے استاد عبدالقادر صاحب کے ہاتھوں ہوئی۔ پہلی بنک کی طرح پانچویں جماعت والوں سے دکان کا جلسہ کرایا۔ لڑکوں نے یہ بتایا کہ انھوں نے "دکان پروجکٹ" کی حیثیت سے کیا کچھ سیکھا۔ قادر صاحب جیسے دیانتدار استاد کے شاگرد اس دکان کے امین تھے۔ یہ ایک معروف کام ہے اس کا اختصار پیش کرنے کی بجائے ہم تعلیمی مرکز نمبرا کے صرف "گنتی کا کام" کے ایک حصہ کا ذکر کرتے ہیں۔ استادوں کے مدرسے میں بنیادی تعلیم کے تحت ٹریننگ ہو رہی تھی تعلیمی مرکز نمبرا کے تعلیمی کاموں میں بھی پچھلی قسم کے پروجکٹ کے بجائے جن کا ذکر ہوتا آیا ہے، حرفے کے ذریعہ تعلیم دی جانے لگی۔

سید عروج الحسن صاحب نے واردھا ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اس نئے کام کی ذمے داری سنبھالی تھی۔ نمونے کے طور پر ایک کام کا خلاصہ اس طرح ہے۔

جماعت میں بالعموم اتنا انتظام نہیں ہوتا ہے کہ بچے اپنے پاس قرینے سے پنسل، ربر وغیرہ رکھ سکیں۔ فرض کیجیے چوتھی جماعت کے سامنے ہم یہ مسئلہ رکھتے ہیں کہ مذکورہ چیزوں کو قرینے سے رکھنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں! نتیجے کے طور پر یہ بات طے پائی ہے کہ طلباء دو دو ڈبے تیار کریں گے۔ ایک اپنے لئے اور دوسری بچوں کی دکان میں فروخت کرنے کے لئے۔

اس کہانی میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بچوں سے فلاں ترکیب سے ٹرے بنوائی گئی۔ ذکر کے قابل یہ بات ہے کہ ہم مختصراً یہ بتلائیں کہ کام کے دوران میں اور کام ختم ہونے پر لکھنے پڑھنے کا کام کس طرح لیا گیا۔

۱۔ معلومات عامہ (سماجی علوم اور سائنس)

ٹرے کس کام آتی ہے؟

ٹرے کس چیز سے بنی ہے؟

اس موقعے پر گتے کی کہانی سنائی جائے گی۔

گتا پہلے کہاں بنا؟ کس طرح بنا؟ گتا کتنے قسم کا ہوتا ہے؟

کام کے دوران میں، کمرے کی صفائی اور ہاتھوں کی صفائی کیسے رکھی جائے۔

۲۔ زبان:-

ٹرے بنانے کا عمل طلبہ اپنی اپنی کاپیوں پر لکھیں گے۔

ٹرے پر ایک مضمون لکھیں گے۔

ٹرے سے متعلق املا ہوگا۔

۳۔ حساب:-

(ٹرے بنانے کے دوران اور خرید و فروخت کے مسئلے میں اصل لاگت، نفع و نقصان)

طلباء سے ٹرے کی قیمت نکلوائی جائے گی۔ (گتا، کاغذ، لیئی)

فرض کیجیے لاگت آئی ۲۵ پیسے فروخت کی گئی ۳۰، میں تو کتنا نفع ہوگا۔

ٹرے اتنی تعداد میں فروخت کر لیا تو کتنا نفع ہوگا وغیرہ۔

اس طرح سوال حل کرائے جائیں گے۔

۴۔ ڈرائنگ:-

طلباء سے کہا جائے گا کہ ٹرے کا اسکیچ بنائیں اور اس میں وہی رنگ بھریں

جواہری کا رنگ ہے۔ اس موقعے پر بنیادی رنگوں (لال، نیلا، پیلا) کا علم دیا جائے گا اور یہ بتایا جائے گا کہ انہیں یا ان ہی رنگوں کو ملا کر مختلف رنگ بنتے ہیں۔

۵۔ اسلامیات:۔

موقع محل کے لحاظ سے یہ بات سامنے لائی جا سکتی ہے کہ ایمان داری خرید و فروخت کا اہم جزو ہے کردار میں اس کی کتنی اہمیت ہے۔

....

عروج الحسن صاحب کو ہاتھ کے کام میں بڑا ملکہ تھا، نفاست اور تکمیل کا خیال رکھتے تھے۔ آپ کی وجہ سے اس کام کے لئے مدرسہ میں ایک فضاء پیدا ہو گئی تھی۔

ثانوی والوں نے "یوم اقبال" منایا۔ دو ہفتے تک اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری پر لڑکوں نے چھان بین کی۔ مضامین لکھے اور ایک جلسہ میں ترتیب اور سلیقہ کے ساتھ انکو سنایا اور رات میں اقبال کی دو نظموں کو "فیچر" کی شکل میں دکھایا گیا۔ لباس اور منظر بہت خوب تھا۔ لڑکوں نے اقبال کی نظموں کا پورا حق ادا کیا۔ یہ کام تو محمد مجیب صاحب کی رہنمائی میں ہوا تھا اور مضامین کا کام سید وقار عظیم صاحب اور قاسم حسن صاحب کی کوششوں سے پورا ہوا۔ ان حضرات کی شخصیت نے طلباء کے کاموں میں معنی پیدا کئے۔ یوں ادبی، علمی، تفریحی کام ہم آہنگ ہو کر چل رہے تھے۔

اس سال کالج کے نصاب میں یہ تبدیلی ہوئی کہ سالانہ اور سندی امتحانات کے لئے سال بھر کے کام کا رکارڈ لازمی جزو قرار دیا گیا۔ مختلف زبانوں میں لڑکوں سے مضامین لکھوائے جاتے ہیں ان کے نمبروں کو شامل کر کے امتحانوں کا نتیجہ شائع کیا جاتا ہے اس طرح طلباء سال بھر تک کام میں لگے رہتے ہیں۔

عربک کالج میں تقریری مقابلہ ہوا تو جامعہ کالج کے طلباء نے بھی شرکت کی تھی، نتیجہ میں ٹرانی ملی۔ اسی طرح عثمانیہ کلب پانی پت کی ٹرانی تعلیمی مرکز کے لڑکوں نے حاصل کی

انجمن اتحاد میں مولانا اسلم صاحب جیراج پوری نے "اسلام کا آخری رکن" کے عنوان سے اپنا سلجھا ہوا مقالہ سنایا، "اسلامیات" میں مولانا کا گہرا مطالعہ تھا، فروع کے مقابلے میں اصل کو اہمیت دیتے تھے۔ قرآن کی سیدھی سادی تفسیر کرتے تھے نوجوان شاگردوں پر اس کا اثر ہوتا تھا، دینی معاملات ہوں یا دنیوی، مولانا کا فیصلہ دو ٹوک ہوتا تھا۔

ایک اور موقع پر انجمن اتحاد میں بہزاد لکھنوی نے اپنے تازہ کلام سے لڑکوں کو محظوظ کیا۔

بارہویں سال کی کہانی میں زمیں احمد جعفری کے زمانہ تک انجمن اتحاد کے جتنے نائب صدر ہوئے ہیں ان سب کے نام دے گئے ہیں، اگلی فہرست بالترتیب اس طرح ہے

نجم الدین صاحب بدخشانی، کنک چند ڈیکا صاحب، بدرالحسن صاحب، محمد طیب صاحب، اسمٰعیل محمد مدصاصاحب، حافظ ضمیر الدین صاحب، حافظ احمد علی صاحب علوی، حافظ محمد عرفان صاحب۔

لڑکوں کی طرح ملازمین کی انجمن میں بھی، تعلیمی دلچسپیوں کے کام ہونے لگے تھے اس سال انجمن کے اہتمام میں "میلاد النبیؐ" کا جلسہ ہوا تھا جس میں تمام مضامین اس کے اراکین نے اپنی بساط کے مطابق لکھے اور پڑھے مولانا احمد سعید صاحب اس جلسہ کے صدر تھے، آخر میں آپ نے اپنے خیالات سے مستفید فرمایا۔

جامعہ نگر کے آس پاس جو گاؤں ہیں، قدرتی طور پر ان کی اصلاح کی ذمہ داری ہمارے اوپر آتی ہے۔ گذشتہ سال استادوں کا مدرسہ جامعہ نگر میں منتقل ہوا تھا، اس کے قریب ہی اوکھلا، جوگا بائی، جُلینا کے گاؤں ہیں، اوکھلے میں مدرسہ نہ تھا۔ استادوں کے مدرسہ کے کارکنوں کی کوشش سے ۷ راکتوبر ۱۹۳۹ء کو ایک مدرسہ قائم ہوا۔ شروع میں صرف بیس لڑکے تھے۔ دہلی میونسپلٹی نے ۲۵ — ۱ — ۳۰ کے گریڈ میں ایک استاد کا خرچ منظور کیا تھا۔

جب اس سال سلامت اللہ صاحب استادوں کے مدرسہ میں آئے تو گاؤں کے

اس مدرسہ کی دیکھ بھال آپ کے سپرد ہوئی اس مدرسہ کے ایک لائق اُستاد نور محمد صاحب گاؤں کے سدھار کی طرف متوجہ ہوئے۔ سبھی کی دلچسپیوں میں بھی حصہ لینے لگے۔

جامعہ میں بعض کیا اکثر استاد کسی نہ کسی خیال کو لے کر یہاں آئے۔ طوالت کی وجہ سے ہم نے کسی اُستاد کا ذکر صرف اس حالت میں کیا ہے کہ اس سے کوئی خاص کام وابستہ کیا گیا ہو ورنہ جامعہ کے خادم کی حیثیت سے اعلیٰ صفات کے لوگ جامعہ میں کام کرتے رہے ہیں۔ بہت سوں کا ذکر اس کہانی میں نہ آسکا۔ البتہ منسلکات میں ایک فہرست تو ہم نے ۱۹۲۴ء میں کام کرنے والے کارکنوں کی دی ہے۔ دوسری مکمل فہرست جوبلی کے زمانے میں کام کرنے والوں کی منسلک کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس وقت گاؤں کے مدرسے کے سلسلے میں سلامت اللہ صاحب کی بات ہو رہی تھی: .... ہم آپ کی آمد کی وجہ یہاں بیان کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب اپنے طور پر ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو جامعہ کے کاموں کو آگے بڑھائیں، علی گڑھ کی چند ملاقاتوں میں ذاکر صاحب نے سلامت صاحب کی ذہانت اور صلاحیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں جب سلامت صاحب نے بی۔ ٹی کا امتحان پاس کیا تو ذاکر صاحب نے پوچھا "کہیے اب کیا ارادے ہیں۔؟" سلامت صاحب نے کہا "قومی کام کرنا چاہتا ہوں۔" ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "گھاس کھودنا بھی قومی کام ہو سکتا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپ کے اس حساب کی تفصیل کیا ہے؟" آپ نے کہا۔ "ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ ہے۔" تو پھر دہلی تشریف لائیے آپ کو آپ کی پسند کا کام مل جائے گا۔ اس زمانے میں جب کوئی شخص جامعہ میں کام کرنے کے لئے آتا تھا تو اس کی تنخواہ اس کے رہنے سہنے کا معاملہ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ یہ اس کی پہلی آزمائش ہوتی تھی۔ سلامت صاحب اسٹور کے پاس ایک ایسے کمرے میں رہنے لگے جہاں کئی چارپائیاں تھیں مشکل سے ایک چارپائی کی جگہ ملی۔ آپ کے بعد سعید انصاری صاحب کے ساتھیوں میں

ابوالکلام صاحب، تلا رام صاحب کا اضافہ ہوا۔ بس ایک دو سال کا فرق کہئے۔ اس بے سرو سامانی کی حالت میں بھی ہم نئے نئے کاموں کی ابتدا کرتے چلے گئے۔

بچوں کے میلے کی تجویز ایک عرصے سے جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں تھی خصوصاً محترمہ آپا جان کو اس کی بہت خواہش تھی۔ ایک دفعہ تو انھوں نے یہ اعلان بھی کرا دیا تھا لیکن کچھ ایسی دشواریاں پیش آتی رہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

اس مرتبہ رمضان کے مہینے میں جامعہ کی نئی بستی جامعہ نگر (اوکھلا) کے بچوں اور ان کے استادوں نے یہ طے کیا کہ بچوں کا میلہ ضرور منایا جائے۔ دلی میں عید کا دوسرا دن خاص طور سے منایا جاتا ہے۔ لوگ ہر جگہ سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں خصوصاً اوکھلے میں تو ایک میلہ سا لگ جاتا ہے یہ عام طور پر "ٹر" کا دن کہلاتا ہے اس لئے تجویز ہوئی کہ یہ میلا ٹر کے دن ہو تا کہ دلی شہر کے لوگ بھی اس سے دلچسپی لیں۔ اس سے پہلے ۱۹۳۶ء میں مدرسہ ابتدائی کے نگراں اکبر علی صاحب مرحوم نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ محدود آبادی کی وجہ سے (اُس زمانے میں یہاں صرف مدرسہ ابتدائی تھا) عید کی دلچسپیاں محدود ہیں، مقامی میلے کی بناء ڈالی تھی، یعنی کھانے پینے کی چند دکانیں اور بازی گری کے تماشے کا انتظام تھا کہ بچوں کا دل بہلے، اسے مقامی میلہ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن شہر کے لوگوں کو مدعو کرنے اور میلے کی شکل دینے کا کام اسی سال ہوا۔ یہاں اسی میلے کا بیان مقصود ہے۔

بچوں میں میلہ کرنے کی خبر سے ایک جوش اور مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میلے کا سارا کام انہوں نے ہی کیا، استادوں کا کام تو صرف نگرانی یا ہدایت تھی۔ پہلے تو پروگرام بنایا گیا کہ میلے میں کیا کیا ہونا چاہیئے۔ پھر سارا کام بچوں کی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان کمیٹیوں کے نام یہ تھے:۔

"آرائش کمیٹی" میلے کی تمام آرائشگی کا کام اس کمیٹی کے سپرد تھا۔
"کھیل کمیٹی" کھیل کے سارے کام اس کمیٹی کے ذمے تھے۔

"کھانے پینے کی نگرانی کرنے والی کمیٹی"

"کھلونوں اور دوسری چیزوں کی دکانوں کو چلانے والی کمیٹی"

"ڈرامہ کمیٹی"

"مداری اور بازی گر کے کھیلوں کا انتظام کرنے والی کمیٹی"

روشنی، صفائی، اور میلے کا انتظام کرنے والی کمیٹی"

"میلے کی نگرانی کرنے والی کمیٹی" وغیرہ۔

ان تمام کمیٹیوں نے میلے کو کامیاب بنانے کے لئے پورے جوش اور سرگرمی سے کام کیا۔

عید کے دوسرے دن یعنی ۲۸ کے روز دس بجے میلے کا پروگرام شروع ہوا۔ پہلے جناب شیخ الجامعہ صاحب نے جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ بچوں نے موقع کے مناسب عید کا ترانہ پڑھا۔ یہ نظم جناب شفیع الدین نیر صاحب نے میلے کے لئے لکھی تھی۔ نیر صاحب نے میلے کا پروگرام بھی نظم میں لکھ دیا تھا، یہ پروگرام بھی خاص طور سے مقبول ہوا اور میلا کمیٹی کی طرف سے خوشخط چھپوا کر بچوں اور بڑوں میں تقسیم کیا گیا۔

پیام تعلیم کے مدیر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ہم ٹھیک دس بجے جامعہ نگر پہنچے۔ گیٹ سے ذرا ہٹ کر کچھ والنٹیر بچے میلے کا چھپا ہوا پروگرام تقسیم کر رہے تھے۔ یہ پروگرام پڑھتے ہوئے ہم گیٹ یعنی صدر دروازہ کی طرف چلے .... یہ گیٹ پر اور میلے کے راستے میں دونوں طرف کیسے دلچسپ اور مزے مزے کے کارٹون لگا رکھے ہیں۔ انھیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آتی ہے۔ یہ سب بچوں نے ہی بنائے ہیں کیسی اچھی ڈرائنگ ہے۔ ذرا آگے بڑھے تو ایک ننھے سے صاحبزادے نے گھیر لیا کہ "جناب پہلے جامعہ کا جھنڈا تو لیتے جائیے ایک ایک پیسے، ایک ایک پیسے" ان سے چھٹکارا پاکر بائیں طرف مڑے تو کھلونوں، کتابوں اور مٹھائیوں

اور پھلوں وغیرہ کی دُکانیں نظر آئیں۔ گنڈیریوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ عمارت کے اندر دروازے پر تفریح گاہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جاکر دیکھا تو سلیقہ سے میزیں چنی ہوئی تھیں چائے اور کھانے پینے کا انتظام تھا، کھانا بہت عمدہ اور دام بھی مناسب۔ دو تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ یہاں سے فارغ ہوکر پھلوں کی دکان پر کچھ پھل لئے۔ دائیں ہاتھ کی طرف مڑے۔ تعلیمی مرکز نمبر ا والوں کی طرف سے یہاں دارالمطالعہ یا ریڈنگ روم تھا۔ اخبار اور رسالے کافی تعداد میں قرینے سے میزوں پر رکھے تھے، بہت سے اللہ کے بندے آج اور اس ہنگامے میں بھی بڑی توجہ سے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ریڈنگ روم کے برابر ایک اور دکان تا توی کی طرف سے تھی بورڈ پر "قہوہ خانہ" لکھا تھا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ قہوہ ہی پئیں گے اور جو کچھ کھایا پیا ہے سب ہضم ہو جائے گا۔ اندر جاکر معلوم ہوا کہ "جناب قہوہ وغیرہ کچھ نہیں صرف چائے ہے یا لیمو اور سوڈے کا شربت۔ زیادہ جی للچائے تو پراٹھے اور کباب حاضر ہیں"، ہم نے صرف چائے ہی پر قناعت کی۔ چائے بہت اچھی تھی۔ پھر دائیں ہاتھ کی طرف مڑے تو "جامعہ کیمیکل انڈسٹریز" کی دُکان نظر آئی۔ مچھر بھگاؤ تیل، ویسلین، فاؤنٹن پن کی روشنائی، منجن اور دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ اس کے پاس ہی شعبہ نجاری کی دُکان تھی۔ سنگھار میز، الماریاں، کرسیاں وغیرہ رکھی تھیں، ہر چیز نئے نمونے کی تھی۔ عمارت کے دونوں طرف کے کمروں میں بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں سجائی گئی تھیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے بھالتے ساڑھے بارہ بج گئے۔ خیال تھا کہ کہیں آرام کریں کہ ایک پرانے ساتھی مل گئے یہ اب جامعہ نگر میں رہتے ہیں ظہر کی نماز کے بعد کچھ دیر آرام کیا اور پھر چلے میلے کی طرف۔ یہاں پروگرام شروع ہو چکا تھا اور نٹ اپنے کرتب دکھا رہے تھے، نٹوں کے بعد سپیروں نے اپنے کمال دکھلائے۔ پھر لاؤڈ اسپیکر نے اطلاع دی کہ اب آپ لوگ دُکانوں کے پیچھے کے میدان میں تشریف لے جائیے وہاں "ماس ڈرل" ہوگی۔ سب لوگ اس طرف پہنچے۔ یہاں پہلے جھنڈا

لہرایا گیا پھر بچوں نے ترانہ پڑھا۔ ڈرل شروع ہوئی، مدرسہ ثانوی کا پیشنگ رہا تھا۔
بہت ہی پرلطف اور شاندار منظر تھا۔ یوں سمجھئے کہ سارے پروگرام کی جان یہی چیز تھی۔
ڈرل کے بعد بچوں نے اپنے اپنے ہنر دکھلائے پھر عصر کی نماز کے بعد سید محمود اخضر
صاحب استاد نیوٹ کی نگرانی میں بچوں نے نیوٹ کے ہاتھ دکھلائے۔ دوسری طرف
تھے ننھے پہلوانوں کا دنگل شروع ہوا اور اس کے بعد کبڈی بھی بہت مزے دار رہی
کبڈی کے بعد ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور ڈراما دیکھنے کی فکر ہوئی۔ ڈرامے کا
ٹکٹ پہلے ہی خرید لیا گیا تھا۔ ڈرامے دو تھے ایک بڑے لڑکوں کا اور دوسرا بچوں کا
ہم نے دونوں ڈرامے دیکھے۔ چھوٹے بچوں کا ڈراما "دیانت" تھا، اسے عتیق صاحب نے
تیار کرایا تھا۔ غرض دن بھر مصروفیت میں گذرا۔ میلے کی خوش انتظامی سے ہر شخص خوش تھا۔
دوپہر سے میلے میں لوگوں کی آمد ورفت زیادہ ہونے لگی تھی اور شام کو تو کھوے سے کھوا چھلتا
تھا پھر بھی دفتر معلومات، فوری امداد اور پولیس کا اس قدر باقاعدہ انتظام تھا کہ کسی کو ذرا
بھی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ شہر کے لوگ بھی بچوں کی دکانداری اور اخلاق سے بہت خوش تھے
بڑوں کے علاوہ شہر کے بہت سے مدرسوں کے بچے بھی یہ میلا دیکھنے آئے تھے۔ جامعہ نگر
اوکھلا شہر سے کوئی آٹھ نو میل ہے۔ آنے جانے کا انتظام بہت معقول تھا۔ اس معاملے
میں "ہندوستان بس سروس" والوں نے بھی میلا کمیٹی کی بہت مدد کی اور اس نے اپنی بسوں
کے علاوہ ... مزید بسوں کا بھی انتظام کر دیا تھا۔"

یوں تو اس میلے میں سبھی استادوں نے اپنے اپنے شاگردوں کی رہنمائی کی، لیکن
الطاف علی صاحب ناظم تربیت جسمانی، اُستادوں کا مدرسہ نے "اس ڈرل" میں جان ڈال
دی تھی، عبدالواحد صاحب سندھی اس میلے کے ناظم عام تھے، سندھی صاحب نے مدرسہ
کی عام زندگی میں بیداری پیدا کرنے کے لئے بڑا کام کیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں
بھی آپ کی ایسی ہی دھوپ رہتی تھی۔ الطاف صاحب نے صدیقی صاحب کے ساتھ

مل کر سکاؤٹنگ کے کام کی ذمہ داریاں خوب نبھائیں۔

جھنڈا لہراتے وقت بچوں نے نیّر صاحب کی نظم "جاگو اور جگاؤ" پڑھی تھی۔ "حلقہ تعلیم و ترقی" نے اسے چھپوا کر تحفہ کے طور پر تقسیم بھی کیا تھا۔

شروع میں یہ میلا "بچوں کا میلہ" کے نام سے تھا مگر جامعہ کے اور ادارے بھی اس میں حصہ لینا چاہتے تھے اس لئے آگے چل کر اس نے "تعلیمی میلا" کی صورت اختیار کر لی جس سے اس کی افادیت بڑھ گئی۔ رنگینیوں میں اضافہ ہوا تعلیمی نمائش نے مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ جامعہ کے شعبوں کو کام دکھانے کے اور موقعے نکل آئے۔ ایک دن کے ہنگام سے سب کام کیسے انجام پاتے پہلے چند سال میں دو دن پھر تین دن کا پروگرام بننے لگا۔ دیہاتی بھائیوں کی دلچسپیاں بھی شامل کر لی گئیں۔ دہلی کالجوں کے طلباء حصہ لینے لگے ادبی محفلیں بھی منعقد ہونے لگیں۔ کانفرنس کے نمونے دیکھنے میں آئے۔ عورتوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔ دہلی میں ایک سہولت یہ ہے کہ یہاں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے جلسے ہوتے ہیں یہ حضرات بھی مدعو ہونے لگے، مدرسہ ابتدائی سے کالج کی سطح تک ہر معیار کے ڈرامے ہونے لگے، میلے ٹھیلے ہندوستان کی خاص روایات ہیں اس انوکھے "تعلیمی میلا" نے جامعہ کی خصوصیات کے مطابق ایک نیا نمونہ پیش کیا۔ ہر سال نئے پروجکٹ، نئے تعلیمی کام نئی نمائشیں، نئے ڈرامے، نئے نئے جلسے یہ سب آگے چل کر سال بہ سال کی کہانی میں نظر آئیں گے۔

اپریل کے دوسرے ہفتہ میں "بنیادی قومی تعلیم" کی دوسری سالانہ کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سو ڈیلی گیٹوں نے اطراف ملک سے شرکت کی ڈیلی گیٹوں میں مختلف صوبوں کی حکومتوں، ریاستوں اور قومی جماعتوں کے نمائندے تھے۔ یہ کانفرنس نمائندگی کے اعتبار سے مکمل تھی۔

کانفرنس کی افتتاح سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ہندوستانی میں

ایک استقبالیہ تقریر فرمائی۔ راجندر بابو نے افتتاح کیا۔

کانفرنس کے دوسرے دن جناب جے۔ سی۔ چیٹرجی سپرنٹنڈنٹ تعلیمات صوبہ دہلی نے کانفرنس کی نمائش کا افتتاح کیا۔

نمائش میں بعض ریاستوں اور حکومتوں اور جامعہ کے مدرسوں کی چیزیں قرینے سے سجائی گئی تھیں۔ نمائش کو لوگوں نے بہت پسند کیا اور شاید اپنی نوعیت کی ایسی اہم تعلیمی نمائش ہندوستان میں پہلی ہی مرتبہ ہوئی تھی۔

اکثر ڈیلی گیٹ جامعہ نگر ہی میں ٹھہرے تھے۔

کانفرنس میں بنیادی تعلیم سے متعلق مختلف مسائل پر بحث ہوئی۔ مختلف علاقوں کے کام کرنے والوں نے اپنے اپنے علاقے سے متعلق رپورٹیں سنائیں۔

اس کانفرنس کے سلسلہ میں ایک دن دہلی کے ٹاؤن ہال میں کاکا کالیلکر صاحب کی صدارت میں عام جلسہ ہوا۔

خواجہ غلام السیدین صاحب ڈائرکٹر تعلیمات کشمیر نے "بنیادی تعلیم" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔

۱۴ اپریل کی رات کو کانفرنس ختم ہوگئی۔ آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہاں ہم نے جمع ہو کر جن باتوں پر سوچ بچار کیا ہے اُمید ہے کہ آیندہ سال سے اس پر نہایت سرگرمی اور جوش کے ساتھ عمل ہوگا۔ ہم اپنے مہمانوں کی ویسی خدمت نہیں کر سکے جیسی کہ کرنی چاہیئے تھی لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم نے بے دلی سے کام لیا ہو بلکہ کچھ ہماری معذوری اور کچھ ہماری مجبوری تھی مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے آپ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، خواہ آرام پہنچایا ہو، یا تکلیف، یہ سب نہایت محبّت اور خلوص کے ساتھ کیا ہے امید ہے کہ آپ ہماری خامیوں کو نظر انداز فرمائیں گے۔"

مہمانوں میں سے ایک صاحب نے حکومت کے اداروں کی طرف سے اور ایک صاحب نے ریاست کے اداروں کی طرف سے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا، اور تمام اداروں کی طرف سے کاکا کالیلکر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک شکایت ہمارے میزبان اور صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سے ضرور ہے کہ انھوں نے ہمیں وہاں دو دو بار جلسوں میں کھینچا اور دیر دیر تک بٹھائے رکھا۔ سچ یہ ہے کہ ایسے بڑے اور اہم کام کے لئے ہمیں ایسے مستعد اور قابل صدر کی ضرورت تھی۔" جلسہ رات کے گیارہ بجے ختم ہوا۔

کانفرنس کے موقع پر جو لوگ تشریف لائے تھے وہ گویا اس سال کے ہمارے مہمان بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ریاضی کے مشہور فاضل پروفیسر رضی الدین صاحب (جامعہ عثمانیہ) بھی ایک موقع پر تشریف لائے تھے۔

اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کی تفریح کے لئے مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے ڈراما "قوم پرست طالب علم" اسٹیج کیا تھا۔ وقت کی پابندی، سلیقہ، ترتیب، اداکاروں کا کام سب لوگوں نے پسند کیا۔ مجتبیٰ احمد (قوم پرست طالب علم) حفیظ ولاوری (ڈاکو) عبدالرب خاں (داروغہ جیل) محمد اسماعیل (دیوانہ) نے اپنا اپنا کام خوب کیا تھا۔ یہ ڈراما عتیق احمد صاحب کی رہنمائی میں ہوا تھا۔

اس سال کے خاص عطیوں میں ریاست رام پور کا عطیہ ہے، گذشتہ سال اس ریاست سے ۵۰ روپے ماہوار کی امداد ملی تھی، اب دو سو روپے ماہوار ملنے لگے۔

جیسا کہ آگے ذکر آئے گا حیدرآباد دکن کے خاص احباب جنھوں نے شعبہ تعلیم و ترقی کو چلانے کی ذمہ داری لی تھی مولوی محمد حسین صاحب مددگار تعمیرات نے ایک ہزار روپئے اور مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج نے پانچ سو روپئے یک مشت عطا فرمائے۔

بائیسواں سال

اگست ۱۹۴۱ء سے جولائی ۱۹۴۲ء

اس سال جامعہ کے نئے سیشن کا آغاز ایک خاص تقریب سے ہوا، یہ تقریب فوجی طرز کی تھی۔ مدرسہ ابتدائی سے کالج تک کے طلباء اور اساتذہ اور دیگر شعبوں کے کارکن درجہ بدرجہ یعنی پہلے ابتدائی پھر ثانوی وغیرہ قطار در قطار کھڑے تھے۔ اسٹیج خالی تھا، وقت مقررہ پر شیخ الجامعہ صاحب اسکاؤٹ کے ہمراہ تشریف لائے اور مجمع کے سامنے کھڑے رہے۔ اسکاؤٹ طرز کی سلامی دی گئی۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد ترانہ ہوا، پھر شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے فرمایا۔

"جامعہ کے ساتھیو، چھوٹے ساتھیو اور بڑے ساتھیو! تمہیں یہ نیا سال مبارک ہو۔ اگرچہ اس سال کو شروع ہوئے دو ہفتے ہو چکے ہیں اور کچھ نہ کچھ کام ہو رہا ہے مگر ہمارا باضابطہ کام آج سے شروع ہوگا۔ ہمیں یہ جلسہ اب سے پہلے کرنا چاہیئے تھا۔ آئندہ ہم یہ رسم اس سے جلد کرنے لگیں گے۔

میں نے بڑوں اور چھوٹوں دونوں کو ساتھی کہا ہے۔ ساتھی اس لئے کہ ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جو کام

ہمیں کرنا ہے اس میں چھوٹے بھی اتنے ہی شریک ہیں جتنے بڑے۔ ہم سبھی کو مل جل کر کام کرنا ہے، کچھ سیکھنا ہے کچھ سکھانا ہے۔ کام میں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی ہے، ادب، عزت اور محبت کا ہم ساتھیوں میں رشتہ ہے اور یہی ہمارے طریق کار کی رُوح ہے۔

اس سال ہمارے کرنے کے یہ چار کام ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو یہ چار چیزیں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

۱۔ صحت۔ ۲۔ طاقت۔ ۳۔ حسن اور ۴۔ پاکی۔

ان لفظوں کے لئے پرانے لفظ بھی موجود ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر انھیں ترک کر دیا ہے اس لئے کہ وہ بار بار اس قدر بے موقع اور غلط استعمال ہو چکے ہیں کہ اب وہ اپنے معنی چھوڑ چکے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان بے جان لفظوں کو استعمال کروں اور میرے کہنے کا مطلب فوت ہو جائے۔ میں کسی موقعہ سے ہر جماعت کے سامنے علیحدہ علیحدہ اس کی فہم اور سمجھ کے مطابق ان لفظوں کی وضاحت کروں گا۔ لیکن اس وقت مجملاً یہ سمجھ لیجئے کہ ہمیں صحت سے طاقت حاصل کرنا ہے، جسم کی صحت جسم کی طاقت، روح کی صحت روح کی طاقت پھر اس میں حسن پیدا کرنا ہے جسم کا حسن سیرت کا حسن پھر ان تمام چیزوں میں پاکی بھی موجود ہو۔ وہ پاکی جو جسم کو پاک رکھتی اور جو روح کو پاک رکھتی ہے۔

مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا ہے۔ اگر ہم نے اس سال ان چار چیزوں کو حاصل کر لیا تو سمجھ لو کہ ہم نے بہت کچھ کر لیا"

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ شعبوں کی تقریبات کی تاریخوں میں تصادم ہو جاتا ہے لاری کے انتظامات میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ اس سال ان کا یہ حل سوچا گیا کہ تمام اداروں سے سال بھر کے پروگرام حاصل کرنے کے بعد ان کا کیلنڈر بنایا گیا کہ کس ادارے

کی کون سی تقریب کس تاریخ کو ہوگی۔ اس کیلنڈر کی نقلیں متعلقہ شعبہ جات میں تقسیم کر دی
گئیں۔ اس کا نام تعلیمی کیلنڈر رکھا۔ یہ تجربہ کامیاب رہا، سب کام مقررہ تاریخوں پر انجام
پاتے رہے۔

جب ہم شعبوں کے کاموں پر نظر ڈالتے ہیں تو مدرسہ ابتدائی میں بھی ایک نئی چیز
نظر آتی ہے۔ یہ ہے "کھلی ہوا کا مدرسہ" اس کی مختصر رپورٹ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ
کیا چیز ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں اس کی
کتنی اہمیت ہے۔ رفتہ رفتہ اس کام نے فائدے اور دلچسپی کے اعتبار سے اتنی ترقی کی
کہ اس کا شمار مدرسہ کی خاص تقریبوں میں ہونے لگا۔ اس سال کا کام اگرچہ ابتدائی حالت
میں ہوا تاہم اس کی افادیت کا ہم بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"کھلی ہوا کے مدرسے کے لئے اوکھلے سے ۷ میل دور نہر کے کنارے ایک باغ
میں ڈیرے ڈالے گئے تھے۔ جہاں آس پاس کئی گاؤں تھے اور فصل ربیع بہار پر تھی۔
سات میل کا یہ سفر لڑکوں نے پیدل خوشی خوشی طے کیا۔ وہ لڑکے جو جبراً بیل گاڑی میں بٹھا
دئے گئے تھے، راستہ بھر یہی کہتے رہے کہ ہمیں پیدل کیوں نہیں چلنے دیا۔ دوپہر کا کھانا
اگرچہ ڈھائی تین بجے ہوا لیکن کسی نے بھی شکایت نہ کی۔ پھر شام تک ....
بچوں نے۔۔ اسکاؤٹ ماسٹروں کے ساتھ ڈیرے لگانے میں مدد دی۔۔ دوسرے دن
روزانہ کا پروگرام طے ہوا، ڈیرے سجائے گئے۔

کھیل کود میں جہاں طرح طرح کی ورزشیں، اور ڈرل کی دلچسپ مشقیں تھیں
وہاں پڑھنے لکھنے کے کام، تحقیق و تلاش کے مشغلے، اظہار ذات کے مواقع، تعمیری
اور تفریحی مشغلے شامل تھے۔ صبح صبح جھنڈے کی سلامی کے بعد ہلکی ورزش ہوتی پھر
ناشتہ کے بعد لڑکے لکھنے پڑھنے کے کام میں مشغول ہو جاتے۔ یہ لکھنے پڑھنے کا کام
دیہی کے ماحول سے تعلق رکھتا تھا۔ مثلاً گزشتہ دن لڑکوں نے جس گاؤں کے حالات

معلوم کئے ہیں انھیں اپنی استعداد کے مطابق مضمون کی صورت میں لکھنے کی کوشش کرتے
آس پاس کی جس کھیتی کا مشاہدہ کیا ہے اسے قلم بند کرتے، ان کی ڈرائنگ بناتے۔ پھر
گاؤں والوں اور ان کی فصلوں کا حساب کتاب لگاتے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے
بعد انھیں ایک اور موقع دیا جاتا کہ وہ "فرصت کے کام" کے عنوان سے کوئی مشغلہ پیدا
کرلیں۔ چنانچہ ایک ٹولی دیمک کے گھروں کی تلاش میں نکل جاتی۔ تو دوسری پرندوں کے
رنگ روپ دیکھنے کے لئے باغ میں چلی جاتی۔ بہت سے لڑکوں نے درختوں پر چڑھنے
اترنے کا مشغلہ پیدا کرلیا تھا۔ نہ جاننے والے لڑکوں کے لئے یہاں استاد کی ضرورت نہیں
تھی۔ وہ صرف ساتھیوں کو دیکھ دیکھ کر سیکھ جاتے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد آرام ہوتا مگر یہ آرام برائے نام تھا لڑکے اپنی اپنی جگہ رات
میں دکھائی جانے والی نقلیں سوچتے۔ نقلوں کا پلاٹ۔ ان کے مکالمے، ڈائرکٹر، اداکار،
لباس غرضیکہ تمام چیزیں خود ہی طے کرلیتے۔ سہ پہر میں گانے کی مشق ہوتی۔

دن ڈھلنے پر یہ لڑکے اپنے استادوں کی نگرانی میں مشاہدہ کے کام پر چلے جاتے
لوٹ کر آتے تو سورج غروب ہوچکا ہوتا۔ اتنے میں رات کا کھانا سامنے آئے۔ "کیمپ
فائر کی تیاری ہوتی۔

"کیمپ فائر" کھلی ہوا کے مدرسہ کا ایک ضروری مگر سب سے دلچسپ کام تھا اس
میں استادوں سے زیادہ لڑکوں کے شوق اور ان کی رائے پر کام کو دخل تھا۔ کھانے سے
فارغ ہوتے ہی ایک الاؤ کے گرد بیچ اور بڑے اطمینان سے بیٹھ جاتے۔ درمیان میں آگ
روشن کردی جاتی پھر ہر ایک ٹولی باری باری سے اپنی اپنی نقلیں دکھاتی۔ یہ نقلیں کیا تھیں
اظہار خودی کے مواقع تھے جن میں لڑکے بے نقاب ہوکر استادوں کے سامنے آتے اور ہر
ایک کے متعلق استادوں کو سمجھنے کا موقع ملتا۔ بعض دفعہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی لڑکے
ہیں جنھیں ہم جماعت کی چار دیواری میں نادان سمجھ رہے تھے مگر آج یہ بہت اونچے

نظر آرہے تھے نقلوں کی کمی نہ تھی بلکہ پروگرام کے ایک حصے کو جسے ڈرو کنا پڑتا تھا پھر دوسرے دن پرانی نقل کو دہرانے کا کسی کو خیال بھی نہ آتا تھا کیوں کہ نئی نئی چیزیں، دماغوں میں کثرت سے چلی آرہی تھیں۔ آخری دنوں میں ثانوی اول کے اسکاؤٹ بھی کیمپ میں آگئے تھے جس کی وجہ سے کام کی دلچسپی اور مشغولیت میں بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ ہر دن اور ہر رات ایک نئی مسرت لے کر سامنے آنے لگی یہاں تک کہ ۹ دن گزر گئے۔ آخری مظاہرہ کا دن بھی نکل آیا۔

آخری دن کا مظاہرہ ان کے پچھلے دس دن کے کاموں کا نچوڑ تھا۔ جامعہ سے بھی چند اساتذہ اور شوقین طلبا آئے ہوئے تھے۔ جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، نگراں مدرسہ ثانوی، جناب ارشاد الحق صاحب، پرنسپل استادوں کا مدرسہ، جناب سعید انصاری صاحب اور چند اساتذہ صاحبان ٹھیک مغرب کے وقت تشریف لائے۔ سب سے پہلے چھوٹے بچوں نے سلامی دی اور ان نعروں کو دہرایا جو اسکاؤٹنگ کے سلسلہ میں سکھائے گئے تھے۔ پھر بڑے لڑکوں نے سلامی دی۔ مہمانوں نے تمام سجے ہوئے خیموں کا معائنہ کیا، ہر ایک ٹولی نے جنگل کو منگل بنا دیا تھا۔ یہ سجاوٹ ماحول کی رعایت سے تھی۔ آس پاس کے خودرو پودوں کو گملوں کی شکل دے دی تھی بدرپور کی ریت سے، جہاں یہ لڑکے ٹھیرے ہوئے تھے طرح طرح کے ڈیزائن بنائے گئے تھے۔ ہاتھ کے بنے ہوئے اسٹینڈ اور چوکیاں تھیں، جن پر چیزیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، ان چیزوں کا مقابلہ روزانہ ہوتا تھا اور پچھلے چوبیس گھنٹوں کے کاموں میں سبقت لے جانے والوں کو اول آنے کا جھنڈا ملتا تھا مگر آج تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اول کون آیا ہے۔ بہرحال یہ رسم بھی پوری ہوئی۔ ڈرل کے میدان میں "فوجی مارچ" ہوا۔ لڑکوں نے مہمانوں کو فوجی سلامی دی اور شیخ الجامعہ صاحب نے جھنڈا لہرایا۔ "نئے اسکاؤٹ" سے عہد لئے گئے۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا کہ اس موقع پر کسی نصیحت کی

ضرورت نہیں ہے جو عہد لئے گئے ہیں وہ ہم میں کچھ کرنے کے جذبے کو اُبھارنے کے لئے کافی ہیں بشرطیکہ ہم ان پر عمل کریں۔ جناب سعید انصاری صاحب نے ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے سرگرم کارکن جناب صدیقی صاحب اور جناب سکسینہ صاحب کا شکریہ ادا کیا جن کی نگرانی میں بچوں نے اسکاؤٹنگ کا یہ کام سیکھا تھا پھر سب مہمانوں اور لڑکوں نے رات کا کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہوکر آخری دفعہ سب لوگ کیمپ فائر کے لئے بیٹھ گئے۔ آج کی نقلیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ کیمپ فائر کا افتتاح شمال، جنوب، مشرق، مغرب کی چار مشعلوں سے ہوا۔ جناب شیخ الجامعہ صاحب درمیان میں موجود تھے۔ ہر ایک ٹولی نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ گو رات ہوگئی تھی مگر مہمان گھر جانے کا نام نہ لیتے تھے۔

اس آخری رات میں لڑکوں نے آخری پہرہ دیا اور صبح اپنے مستقر کو لوٹے۔

اس عرصہ میں ابوالکلام صاحب آرٹسٹ استادوں کے مدرسہ کے عملے میں شریک ہوگئے تھے۔ آپ کی رہنمائی میں اس مدرسہ کے طلبا نے بھی یہیں ڈیرے جمائے۔ کلام صاحب کے احساس فرض، باقاعدگی، تنظیم نے کیمپ میں جان پیدا کر دی تھی، آپ کی پھبتیاں مسرت میں اضافہ کر دیتی تھیں۔

یہ دوسرا سال تھا کہ اخلاص احمد صاحب صدیقی آرگنائزر ہندوستان سکاؤٹ ایسوسی ایشن کی وجہ سے جامعہ میں سکاؤٹنگ کو فروغ حاصل ہوا، الطاف صاحب نے بھی آپ کی مدد کی۔ جامعہ کے کارکنوں میں اچھوتے خیالات کی کمی نہیں تھی، جب صدیقی صاحب نے "کیمپ فائر" سے روشناس کرایا تو جامعہ کے لڑکوں نے اپنے استادوں کی نگرانی میں اس کام میں بڑے جوہر دکھائے۔ ہندوستان اسکاؤٹ ایسوسی ایشن کے دوسرے آرگنائزر سکسینہ صاحب نے یہاں کا رنگ دیکھ کر کہا کہ جامعہ کے بچوں اور

استادوں نے اس کام کا جو اعلیٰ معیار پیش کیا ہے، یہ دوسروں کے لئے رہنمائی کا کام دے گا اسی ماحول نے "کھلا ہوا مدرسہ" کو جنم دیا۔

صدیقی صاحب میں نظم کی غیر معمولی صلاحیت تھی، بہت محنتی اور زندہ دل آدمی تھے، جامعہ کے ماحول میں آپ کے جوہر کھلے۔

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مدرسہ ثانوی میں بھی یہ دو جکٹ کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ اس سال اس مدرسہ نے "یوم حالی" منایا۔ اس مدرسہ کی بزم کے ناظم ظہور الحق صاحب کی زبانی یہ مختصر کہانی سنیے۔

"بزم ادب کے اہتمام میں "یوم حالی" کی پہلی نشست ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو جناب حافظ فیاض احمد صاحب مہتمم جامعہ کی صدارت میں ہوئی۔ مجتبیٰ احمد صاحب متعلم ثانوی اول نے کلام مجید کی تلاوت کی۔ اس کے بعد ناظم بزم نے رپورٹ پڑھی۔ رپورٹ کے بعد ثانوی اول اور ثانوی دوم میں صرف حالی کے اشعار میں بیت بازی کا مقابلہ شروع ہوا جو ۴۵ منٹ تک رہا۔ جج صاحبان کے فیصلے تک پروگرام کے مطابق حالی کی نظمیں ہوئیں۔ اس کے بعد صدر صاحب نے جج صاحبان کا فیصلہ پڑھ کر سنایا جس میں ثانوی دوم کو ۹۶ نمبر ملے اور ثانوی اول کو ۷۰۔ انفرادی حیثیت سے مجتبیٰ احمد صاحب ثانوی اول اور عارف الزماں صاحب ثانوی دوم اول آئے اس کے بعد صدر صاحب نے پون بجے جلسے کے ختم ہونے کا اعلان کیا۔ جلسے میں جناب خواجہ سجاد حسین صاحب خلف محترم مولانا حالی مرحوم اور جناب خواجہ حسن نظامی صاحب، جناب فضل احمد صاحب فضلی تشریف لائے تھے، علاوہ ان حضرات کے جناب خواجہ غلام السبطین صاحب، جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ جامعہ کے تمام اساتذہ، شیخ الجامعہ صاحب، طلبائے کالج اور جامعہ کی پوری برادری موجود تھی۔ ۱۲ بج کر ۵ منٹ پر جناب خواجہ سجاد حسین صاحب

نے نمائش کا افتتاح کیا۔ نمائش میں طلبار کے وہ کام جو انھوں نے یوم حالی کے سلسلہ میں کیا تھا، کمرے کی دیواروں اور میزوں وغیرہ پر قرینے سے سجا دئے گئے تھے ان میں حالی کی تصویریں ان کے کلام سے متعلق نقشے، چارٹ، رباعیاں، تصاویر، عبارات اور بہت سی چیزیں تھیں۔ چاروں طرف بچوں پر لڑکوں کے مضامین نئے نئے خوبصورت ٹائٹلوں میں ملبوس رکھے تھے۔ ایک طرف دیواری اخبار کا پانی پت نمبر رکھا تھا جس میں جا بجا وہ تصویریں تھیں جو پانی پت کے سفر میں لڑکوں نے اپنے کیمروں سے کھینچی تھیں۔ نمائش کے درمیان ایک شیشے کے کیس میں وہ نوادر بھی تھے جو جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پت سے ہماری نمائش کے لئے لائے تھے۔ ان نوادر میں خود حالی کے خط اور مسودے اور ان سے متعلق سرسید، شبلی، آزاد، وغیرہ کے خطوط اور تحریریں تھیں، اس کے علاوہ اسلامی ممالک کی پرانی عمارتوں کے فوٹو تھے جن کا ذکر حالی کے کلام میں آیا ہے۔

یوم حالی کا دوسرا جلسہ رات کے آٹھ بجے جناب مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری کی صدارت میں منعقد ہوا، مجتبیٰ احمد صاحب نے تلاوت قرآن مجید فرمائی اس کے بعد جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ جلسے کے دوران میں جناب خواجہ سجاد حسین صاحب بھی تشریف لائے اور جاتے ہوئے شیخ الجامعہ صاحب کی درخواست پر انھوں نے طلبہ کو اپنی قیمتی نصیحتوں سے سرفراز فرمایا، اس جلسے میں طلبہ نے حالی کی زندگی اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر مضامین پڑھے۔ نظمیں اور نظموں کے مختلف زبانوں میں ترجمے سنائے۔

آخر میں جناب شیخ الجامعہ کی تنقیدی تقریر پر جلسہ ختم ہوا۔

یہ پروجیکٹ مشاہیر ادب کے سلسلے کی دوسری کڑی تھا۔

مدرسہ ثانوی کے استاد عبدالرزاق صاحب کے ذمے کسی تقریب پر خواہ کوئی کام سپرد نہ ہوا ہو، آپ ایسے موقعوں پر اپنے لئے رفاہ عام کا کام تلاش کر لیتے ہیں۔

یوم حالی میں آپ نے اسی قسم کی خدمت انجام دی تھی۔

کارٹ کا کام اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اسے کہانی کے انداز میں بیان کرنا مشکل ہے تاہم جامعہ کی انجمن اتحاد کالج کے کاموں کا آئینہ رہی ہے، اس میں مقالے پڑھے جاتے ہیں تقریریں بھی ہوتی ہیں۔ جامعہ کی طرف سے سپاسنامے دئے جاتے ہیں تفریحی مجالس بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً اسی سال جامعہ کے سابق طالب علم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری نے تمدن انسانی کا انتشار" کے عنوان سے اپنا فاضلانہ مقالہ پڑھا۔

۲۔ کملا دیوی چٹوپادھیانے اپنی تقریر میں تعمیری کاموں اور روحانی قوت پیدا کرنے پر زور دیا۔

۳۔ انجمن نے مولانا ابوالکلام آزاد کی آمد پر اپنا سپاسنامہ پیش کیا۔

۴۔ اس انجمن نے "بے تکی کانفرنس" کے نام سے تفریحی جلسہ بھی منایا۔

اب ہم مولانا آزاد کے جلسہ کا کچھ حال بیان کرتے ہیں جس میں جامعہ کی تمام برادری شریک تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جامعہ کے بانیوں میں سے ہیں، جامعہ سے ان کو خاص تعلق ہے جب کبھی موصوف کو موقعہ ملتا ہے جامعہ تشریف لاتے ہیں۔ اُدھر ایک عرصے سے جامعہ آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس طویل عرصے میں جامعہ کی نئی عمارتیں بھی بن گئیں۔ اور جامعہ نگر کی بستی بھی آباد ہو گئی۔ اتفاق سے اوائل فروری میں مولانا کا دلی تشریف لانا ہوا اور یہاں چند دن قیام بھی رہا۔ اہل جامعہ نے مولانا سے جامعہ تشریف لانے کی درخواست کی۔ اگرچہ مولانا کا پروگرام بہت مصروفیت کا تھا تاہم موصوف نے نہایت خوشی سے وقت نکالا۔ اور ۸ رفروری کو ٹھیک ۳ بجے تشریف لائے۔ سڑک سے مدرسہ تک لڑکے دو رویہ قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ قسم قسم کی آرائشی بیرقیں اور جھنڈے راستے کی زینت بنے ہوئے تھے۔ جامعہ کی سڑک کے وسط میں ایک بلند گول چبوترا ہے اس پر ثانوی کے بینڈ والے اسکاؤٹس کھڑے ہوئے تھے اور جامعہ کا جھنڈا بیچ میں لہرا رہا تھا۔ جوں ہی مولانا

نے موٹر سے نیچے قدم رکھا، اسکاوٹ نے سلامی دی اور بینڈ نے ترانۂ تہنیت شروع کیا۔
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نے پھاٹک پر خیر مقدم کیا۔ مولانا طلبہ کی قطاروں میں مسکراتے ہوئے اور سلاموں کا جواب دیتے ہوئے عمارت کے صدر دروازے پر پہنچے۔ مولانا کے چہرے پر غیر معمولی بشاشت تھی۔ صدر دروازے کے سامنے چند منٹوں تک اساتذہ کا تعارف اور سرسری ملاقات ہوتی رہی۔ مدرسے کی عمارت، نمائش اور طلبہ کے بنک و دکان دکھائے گئے۔ اس کے بعد محمد علی ہال میں جلسہ ہوا۔ جلسہ گاہ نہایت سادگی کے ساتھ آراستہ کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے در و دیوار پر بہار آ گئی ہے، تلاوت کلام مجید اور ترانے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ نے نہایت موزوں الفاظ میں مولانا کا خیر مقدم کیا۔ پھر نائب صدر انجمن اتحاد جناب آزاد رسول صاحب نے طلبہ کی طرف سے عقیدت و محبت سے بھرا سپاسنامہ پڑھا۔ مولانا نے اپنی مختصر جوابی تقریر میں فرمایا:۔

"یہی وہ گوشے ہیں جہاں سے آزادی کا پیغام دنیا سنتی ہے۔ جامعہ جو تعمیری کام کر رہی ہے وہ اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ملک کا اصلی کام یہی ہے جب تک قوم کی تعمیر نہ ہوگی وہ کسی میدان میں بھی ثابت قدم اور کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

جلسہ ترانہ وحدت پر ختم ہوا۔ اس کے بعد اساتذہ کی طرف سے چاء کی دعوت ہوئی۔ چاء پر دلچسپ لطیفوں اور گفتگو کے بعد قریب ۵ بجے مولانا تشریف لے گئے۔

جلسہ میں کوثر چاندپوری کی ایک حمد جس کی ٹیپ کا بند ہے "تب تیرا پتہ کچھ ملتا ہے" کورس کے طور پر پڑھی گئی تھی۔ سماں بندھ گیا تھا۔ تعلیمی مرکز نمبر ا کے طلبا بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔ انھوں نے اپنے استاد محمد اکرام خاں صاحب سے درخواست کی کہ اس ترانے کی نقل منگوا دیجئے۔ اتفاق سے یہ گم ہو گئی تھی۔ لڑکوں کا اصرار بڑھا، اکرام صاحب نے لکھا کہ بچوں کا اصرار بڑھتا جا رہا ہے اب تو پتہ چلانا ہی ہوگا۔ اکرام صاحب اپنے

شاگردوں کی خواہشات کا خیال رکھتے تھے، بہتر ڈھنگ سے پڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہی وہ جستجو تھی جو موصوف کو امریکہ لے گئی بالآخر یہ ڈاکٹر بن کر آئے، آپ کو تعلیمی مسائل سے بہت دلچسپی ہے۔

یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا، پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر گیان چند نے انجمن اتحاد کے اہتمام میں "مالیات جنگ" پر تقریر فرمائی۔ اس لکچر کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں فنی اصطلاحات زیادہ استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ طلبا، کے سامنے عام فہم انداز میں باتیں سمجھائیں۔

آپا جان (گرڈافلیس بورن صاحبہ) جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مدرسہ ابتدائی کے اقامت گاہ کی اتالیق تھیں جرمنی کی باشندہ ہونے کی وجہ سے احمد نگر کے قلعے میں نظر بند تھیں جیل سے چھوٹ کر آئیں تو خوشیاں منائی گئیں۔ آپ نے پیام تعلیم میں "پیام برادری کے نام" سے ایک حلقہ قائم کیا تھا۔ جس کا مقصد تھا۔ پیام تعلیم پڑھنے والے بچوں کو خوش و خرم زندگی بسر کرنے، ان میں دوستی، محبت، اتفاق ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ پیدا کرنے، ان کے فرصت کے وقت کو مفید کاموں میں صرف کرنے اور اس طرح انھیں عملی تعلیم دینے میں مدد کرنا، اس برادری کا کام بہت پھیل گیا تھا۔ بہت سے صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں اس کے اراکین (بچے) دوسرے ملکوں کے بچوں سے خط و کتابت کرنے لگے تھے۔ پیام تعلیم میں مضامین کے مقابلے، رنگ بھرنے کے مقابلے یہ سب چیزیں آپ ہی کی نگرانی میں ہو رہے تھے۔ آپ کی نظر بندی کے زمانے میں بھی یہ کام چلتا رہا۔

جامعہ نگر میں "انجمن خواتین" کی بنا، اسی سال پڑی۔ اس کی پہلی صدر بیگم محمد مجیب ناظمہ، صالحہ عابد حسین تھیں۔

جامعہ کی تقریبات کے موقع پر ان خواتین کی وجہ سے عورتوں کا پروگرام اندر دیگر

جلسے، اصلاحی کام ہوتے رہتے ہیں۔

مطبخ کا انتظام ایک زمانے تک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ بعد میں یہ اقامت گاہ کے ایک حصے کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس سال سے پھر اس کی حیثیت مرکزی ہوگئی۔ اس کے ناظم مدرسہ ثانوی کے استاد عبدالحیٔ صاحب مقرر ہوئے، آپ ماسٹر عبدالحی صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ ایک طرف نظم و ضبط کے لحاظ سے عبدالحی صاحب اپنی جگہ مضبوط تھے تو دوسری طرف بچوّں کی شکایات سننے، ان کی تفریحات میں کھانے پینے کی ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچانے میں کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ اشیاء کی گرانی اور کمیابی میں ماسٹر صاحب نے جس نہج سے مطبخ کو چلایا، اس سے آپ کی اعلیٰ تنظیم کا پتہ چلتا ہے۔

اس سال کے مہمانوں میں پنڈت جواہرلال نہرو، جنرل چیانگ کائی شیک، اور شیخ محمد عبداللہ اور حیدرآباد کے مدارالمہام سید عبدالعزیز خاص ہیں۔ ان کے علاوہ سندھ کے قومی کارکن میر علی احمد بھی تشریف لائے۔

جنرل چیانگ کائی شیک کے ساتھ تعلیم اور دیگر شعبوں کے چند ماہرین دلّی تشریف لائے ہوئے تھے، ان میں سے ایک پارٹی جس میں ڈاکٹر توخان چانگ، کومن ٹانگ کی مرکزی کمیٹی کے ممبر اور مرکزی ادارۂ سیاسیہ کے وائس چانسلر اور دیگر حضرات تھے۔ یہ پارٹی پنڈت جواہرلال نہرو کی رہنمائی میں شام کے وقت بلا کسی اطلاع کے جامعہ .... آئی۔ وقت تنگ تھا اس لئے جامعہ کو تفصیل سے تو نہیں دیکھ سکے مگر مطبوعہ لٹریچر وغیرہ ساتھ لے گئے۔ حسن اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ عمارت میں موجود تھے۔ مہمانوں کا شیخ الجامعہ صاحب نے خیر مقدم کیا اور مختلف تعلیمی مسائل پر گفتگو فرمائی۔

اوائل فروری میں کشمیر کے مشہور قوم پرست لیڈر جناب شیخ عبداللہ صاحب

جامعہ نگر تشریف لائے تھے، موصوف نے جامعہ کی عمارت اور مدرسے کا کام دیکھا اور بہت خوش ہوئے۔

ایک رنج کی خبر بھی ہے سر اکبر حیدری کا انتقال ہو گیا۔

سر اکبر حیدری مرحوم کے انتقال سے مسلمانوں کے اکابر کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پر ہونا بظاہر آسان نہیں، مرحوم اپنے علم و فضل کے علاوہ اخلاق و دین داری میں بھی ممتاز تھے۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے اس درجہ پابند تھے کہ کبھی سفر و حضر میں بھی قضا نہ کرتے تھے۔ اسلامی اور ملکی کاموں میں آخر دم تک دلچسپی لیتے رہے۔ مرحوم کو جامعہ اور شیخ الجامعہ سے خاص محبت تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بعد تو وہ جامعہ کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب اُن کی ذمہ داریاں کچھ بڑھ گئی ہیں۔ مرحوم اپنی زندگی میں کئی بار جامعہ آئے۔ جامعہ کے کاموں اور بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جامعہ کے اکثر بہی خواہ جانتے ہیں کہ جامعہ کی موجودہ عمارتیں ریاست حیدرآباد کی فیاضی کا نتیجہ ہیں لیکن اس کارروائی میں مرحوم کی شخصیت کو بہت دخل تھا۔ مرحوم جامعہ کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے اور ہر طرح جامعہ کی اعانت اور بہبود کی صورتیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے اپنی جیب خاص سے بھی جامعہ کے بچوں کے لئے ایک ورزش گاہ بنوائی تھی جس کا نام حیدری ورزش گاہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرحوم کی موت سے جامعہ کا ایک بہت بڑا محسن دُنیا سے اُٹھ گیا۔ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور قوم کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔

اس سال کے خاص عطیات یہ ہیں:-

۱۔ سیٹھ منظر الحسین ۵۰۰ روپے۔ ۲۔ حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد دواخانہ ۵۰۰ روپئے۔ ۳۔ ایم۔ بشیر صاحب رنگون ۵۰۰ روپئے۔ ۴۔ خان بہادر اللہ بخش

صاحب وزیر اعظم سندھ ۵۰۰ روپئے۔ ۵۔ بیگم ڈاکٹر سعید صاحب سندھ ۵۰۰ روپئے۔
۶۔ میر علی احمد خاں صاحب تالپور سندھ ۵۰۰ روپئے۔ ۷۔ میر محمود صاحب سندھ
۵۰۰ روپے۔

اب ایک بے طلب عطیے کا حال سنئے۔

ایک دن کی بات ہے کہ جامعہ نگر کے سامنے سڑک پر ایک موٹر آکر رکی، یکوئی غیر معمولی بات نہ تھی، اس لئے کسی نے توجہ نہ کی۔ موٹر میں سے چار پانچ سیلانی اترے اور ایک طرف سے جامعہ کی عمارت کو شوق سے دیکھنا شروع کیا۔ اس شوق کو دیکھ کر جامعہ کے ایک بزرگ نے اخلاقاً ان کی رہنمائی اپنے ذمہ لی اور مدرسے کی تمام چیزیں دکھائیں اور آخر میں موٹر تک رخصت کرنے سڑک تک گئے۔ سیلانیوں میں سے ایک صاحب نے فرمایا "ہم آج یوں ہی سیر کے لئے نکل آئے تھے۔ یہ میرا کارڈ رکھئے، کل اس پتے پر کسی کو دلّی بھیج دیجئے گا۔ ارشاد کی تعمیل میں ایک صاحب ان کے ہاں گئے"۔ انھوں نے ایک سو ایک کے نوٹ حوالے کئے اور فرمایا یہ میری طرف سے جامعہ کو دے دیجئے گا"۔

یہ سیلانی جناب لاڈلی پرشاد صاحب رئیس چاندنی چوک دہلی تھے۔

تیئیسواں سال

اگست ۱۹۴۲ء سے جولائی ۱۹۴۳ء

انتظامی اعتبار سے جامعہ میں ایک بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی سرکاری یونیور سٹیوں کے کالجوں میں یہ طریقہ ہے کہ جب ایک شخص کسی عہدے پر فائز ہوتا ہے تو یہ اپنی مدت ملازمت پوری ہونے تک قائم رہتا ہے۔ ذاکر صاحب نے اس خیال سے کہ اس اصول کے مطابق جامعہ کے ادارے شخصیتوں سے وابستہ ہو کر نہ رہ جائیں اور صلاحیت رکھنے والی شخصیتوں کو کام کرنے کا موقع ملے، تمام شعبوں کے عہدیدار بدل دیئے۔ اس تبدیلی کی منظوری حاصل کرنے کے لئے آپ نے مجلس منتظمہ کے جلسہ میں جو نوٹ پیش فرمایا تھا اسے ہم درج کرتے ہیں۔

"جامعہ کے تعلیمی انتظام میں کام کی توسیع کے ساتھ ساتھ مرکزیت کو کم کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ میں نے رفتہ رفتہ وہ ذمہ داریاں جو پہلے سب میرے اور پھیں کالج کے قائم مقام پرنسپل اور مدرسہ ثانوی، مدرسہ ابتدائی اور تعلیمی مرکز کے نگراں صاحبان کو منتقل کیں۔ فرائض کی اس منتقلی کے بغیر کام کا چلنا ناممکن ہو جاتا اور مجھے بہت خوشی ہے کہ یہ منتقلی اپنے نتائج کے اعتبار سے بہ حیثیت مجموعی بہت مفید ثابت ہوئی لیکن

کچھ عرصہ سے مجھے برابر خیال آ رہا ہے کہ اگر اداروں کی نگرانی کا کام مستقل طور پر بعض لوگوں کے سپرد رہا تو جامعہ کی ترقی کے امکانات محدود سے ہو جائیں گے۔ میرے ذہن میں جامعہ کا تصور ایک ایسی جمعیۃ یا برادری کا سا ہے جس کے بیشتر اراکین بعض مشترک افکار اور مشترک مقاصد کی وجہ سے یکجا ہوئے ہیں اور ان افکار اور مقاصد کے تحت مشترک کام کے ذریعہ اپنی شخصیتوں کی تشکیل و تکمیل اور قوم کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے کام میں مشغول ہیں۔ اس جمعیۃ میں افکار و مقاصد کا یہ اشتراک جس قدر واضح ہو کارکنوں کے لئے اپنی شخصیتوں کی تربیت و تکمیل کے موقعے جس قدر زیادہ ہوں، مشترک مقاصد کے لئے کام کرنے کو جس قدر اسے تربیت و تکمیل کا وسیلہ بنایا جائے ہر ایک دوسرے کے فائدے میں اپنا فائدہ اور دوسرے کے نقصان میں اپنا نقصان دیکھے جس قدر باہمی تعاون زیادہ ہو اسی قدر یہ تعلیمی جمعیۃ اپنی ماہیئت حقیقی کے معیار سے ترقی کرے گی اور تکمیل سے قریب تر ہوتی جائے گی۔ ایسی جمعیۃ میں قیادت کے معنی سب برابر والوں میں کام کی خاطر اگوا ہونے کے ہیں (First among equals) اور برابری کا یہ احساس سب سے زیادہ اس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری کے کام کرنے کا موقع ملے تاکہ دوسرے سے تعاون کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کا تعاون حاصل کرنے کی ضرورت بھی پڑے۔ میں نے اس خیال پر عرصہ تک غور کیا ہے اور اسے جتنا سوچا ہے اسی قدر مجھ پر اس کی اہمیت روشن ہوتی گئی ہے اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جامعہ کے تعلیمی انتظامات میں کچھ تبدیلیاں اس اصول کے پیش نظر کی جائیں مثلاً میری رائے ہے کہ کالج کی پرنسپلی اور مدرسہ ثانوی اور مدرسہ ابتدائی کی نگرانی کے فرائض تا حکم ثانی مندرجہ ذیل اصحاب کے سپرد کئے جائیں۔

۱۔ مدرسہ ابتدائی — عتیق احمد صاحب

۲۔ مدرسہ ثانوی — برکت علی صاحب

۳۔ کالج — پروفیسر ای۔ جے۔ کیلاٹ صاحب

۴۔ مستجل — ارشادالحق صاحب

۵۔ ناظم ہمدردان جامعہ — حافظ فیاض احمد صاحب

میں شیخ الجامعہ کے عہدہ کے لیے بھی اپنی جگہ کوئی اور نام پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے کہ ہر چند جو اصول پیش نظر ہے وہ میرے یقین میں درست ہے لیکن عملی حیثیت سے اس تبدیلی کی حیثیت بہر حال ایک تجربہ کی سی ہے، اس لیے بہ یک وقت ہر چیز میں تبدیلی نہ ہو تو بہتر ہے میں نے اس سے اور بعض اور چیزوں سے احتراز مناسب سمجھا ہے۔ ان تینوں مدارس کے کام پر میری نگرانی بہ حیثیت شیخ الجامعہ تو رہے گی اور کالج اور مدرسہ ثانوی میں غالباً اس فرض کو جیسے تیسے انجام بھی دے سکوں گا۔ لیکن مدرسہ ابتدائی میں اپنی مدد کے لیے سعید انصاری صاحب کی خدمات سے خاص طور پر فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میری تجویز ہے کہ مدرسہ ابتدائی کے کام کی نگرانی وہ فرمائیں اور اس سے متعلق مجھے ضروری مشورہ دیتے رہیں۔ اور سال میں کم سے کم تین بار مفصل معائنہ فرما کر تعلیمی حالت کے متعلق رپورٹ دیں۔ ایک ستمبر کے آخر میں ایک تعطیلات سرما سے قبل اور ایک اواخر مارچ میں ان تبدیلیوں کے متعلق آپ کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ کالج کی پرنسپلی پر مجلس منتظمہ نے ۲۸ر جنوری ۳۹ء کو میرا تقرر پانچ سال کے لیے فرمایا تھا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اس سال تعلیمی کے لیے اپنے فرائض بہ حیثیت پرنسپل پروفیسر کیلاٹ صاحب کے سپرد کرسکوں۔ نگران مدرسہ ثانوی اور نگران مدرسہ ابتدائی کے عہدوں پر مجلس تعلیمی یا مجلس منتظمہ نے کوئی تقرر نہیں کیا ہے۔ میں نے اپنے اختیارات منتقل کیے تھے ایسا ہی کرنے کی اب بھی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

اس کے علاوہ میری ایک سفارش یہ ہے کہ ارشاد الحق صاحب نگران مدرسہ ثانوی کی بجائے جامعہ کی مستجلی کا کام انجام دیں اور اگر مجلس منتظمہ جامعہ میونسپلٹی کے قیام کی اجازت دے دے تو اس کی صدارت ان کے سپرد ہو۔ حافظ فیاض احمد صاحب کے سپرد ناظم ہمدردان جامعہ کے فرائض کئے جائیں۔ مستجل کا تقرر حسب مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ کی سفارش پر انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پانچ سال کے لئے کرنا چاہیئے۔ موجودہ مستجل صاحب کا زمانہ تقرر ۱۹۳۹ء میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ نے اپنے اجلاس ہائے منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۳۹ء، ۱۴ مئی ۱۹۳۹ء بالترتیب میں حافظ فیاض احمد صاحب کا نام دوبارہ پیش کیا ہے لیکن تقرر باضابطہ اب تک انجمن میں نہیں ہو سکا ہے۔ میں مجلس منتظمہ سے آئندہ اس کے اجلاس میں یہ درخواست کروں گا کہ وہ حافظ فیاض احمد صاحب کو ایک سال کے لئے ناظم ہمدردان کی خدمات سپرد فرما دے اگر میری یہ درخواست منظور ہو گئی جیسا کہ مجھے امید ہے کہ ہو جائے گی تو حافظ فیاض احمد صاحب کی جگہ ارشاد الحق صاحب کو ایک سال کے لئے مستجلی کے کام کے لئے تجویز کرتا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ اگر مجلس تعلیمی نے میری ان تجاویز کو پسند فرمایا اور ان کی سفارش سے مجلس منتظمہ نے منظور فرمالیا تو جامعہ کے مستقبل کے لئے مفید ثابت ہو گا۔ اور ایک اچھے طرز عمل کا آغاز ہو گا جس سے اچھے نتائج مرتب ہونے کی توقع ہے؟

ان انتظامی تبدیلیوں کا متعلقہ حصہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ منعقدہ ۲۸ نومبر ۱۹۴۲ء میں پیش کیا گیا اور منظور ہوا۔ اس کے علاوہ

۱۔ جناب محمد مجیب صاحب کو تیسری بار جامعہ کا خازن منتخب کیا گیا۔

۲۔ حسب ذیل حضرات کو انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حیاتی رکن بنایا گیا۔

۱۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر فلسفہ اور اُردو، ۲۷۔ اے۔ جے، کیلاٹ
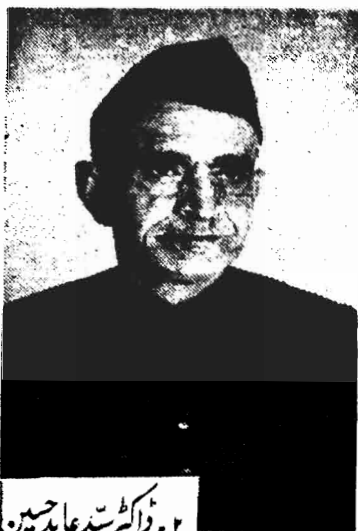
۱۔ حسن محمد حیات

۲۔ ڈاکٹر سید عابد حسین

جامعہ کے مسجل

۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک

۳۔ حافظ فیاض احمد

۴۔ ارشاد الحق

مچھروں کو مارنے والی چیزیں مٹی کا تیل، فلٹ، ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ وغیرہ۔

۴ ریاضی:۔ (۱) مچھروں کو مارنے والی چیزوں کے اخراجات۔

(۲) مچھر بچاؤ تیل کی خرید و فروخت۔

(۳) مچھر دانی کے اخراجات۔

(۴) ملیریا بخار کی دوائیں، ان کی قیمت۔

۴۔ انگریزی۔ Kerosene oil' mosquito, pupa larva, Magnetic needle dust bin

Quinine. وغیرہ نئے الفاظ سکھائے گئے۔ ملیریا اور مچھر کے بارے میں مختصر مضمون لکھوائے گئے۔ انگریزی کے باتصویر چارٹ بنوائے گئے۔

۵۔ ڈرائنگ۔ مچھر کی زندگی کے مدارج پر چارٹ بنوائے گئے۔

۶۔ ملیریا مچھر کی زندگی کے مدارج کو ایک تختہ پر مٹی سے بنایا گیا۔

آخر میں ایک نمائش کی گئی جس میں طلباء کے کام کو تصاویر، فوٹو، چارٹ اور ماڈلوں سے واضح کیا گیا تھا۔ جو سامان استعمال میں لایا گیا اس کی بھی نمائش کی گئی تھی یہ پروجکٹ عتیق احمد صاحب نگران مدرسہ نے چلایا تھا جو اس قسم کی معلومات میں وسیع تجربہ رکھتے ہیں، اس کام میں آپ کی لگن، آپ کے شوق نے اس پروجکٹ کو ایسی نمایاں حیثیت دی تھی کہ نمائش میں بہت سے لوگوں نے اس سے استفادہ کیا، آپ کے شاگرد تو اسے بھولیں گے نہیں، یہ پروجکٹ چھوٹی جماعت میں چلایا گیا تھا۔

جس طرح ابتدائی مدرسہ کے بچوں کے لئے منصوبی طریقۂ تعلیم سب سے مناسب طریقہ سمجھا گیا، اسی طرح ثانوی مدرسہ کے لئے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے انفرادی طریقۂ تعلیم رائج کرنے کی تجویز سوچی۔ چھوٹے بچوں کی ذہنی نشو و نما جس طرح ہوتی ہے ان کے لئے یہی طریقہ نفسیاتی اعتبار سے مناسب ہے کہ ان کے سامنے جو مواد تعلیم بھی رکھا

جائے وہ ملی جلی شکل میں ہو، مضمون وار نصاب کی صورت میں نہ ہو، اس لئے کہ اس طرح ان کے ذہن کی صحیح نشوونما ہوگی۔

لیکن بڑے بچوں کے معاملے میں جب کہ ان کی انفرادی حیثیت ذرا زیادہ نمایاں ہونے لگتی ہے املان میں ایک گونہ چھوٹے بچوں کے مقابلہ میں شعور آنے لگتا ہے تو پھر ان کے لئے مناسب، وہ ملا جلا طریقہ نہیں بلکہ مضمون وار تعلیم شروع کی جاسکتی ہے اور اس طرح چھوٹے بچوں کی طرح جماعت وار نہیں بلکہ انفرادی طریقہ' کار اختیار کرنا چاہیئے۔

امریکہ میں جس طرح منصوبی طریقہ تعلیم پروفیسر کلپاٹرک کی رہنمائی میں ایجاد ہوا تھا، اسی طرح یہ انفرادی طریقہ' تعلیم بھی ایک امریکی خاتون مس پارک ہرسٹ کا ایجاد کردہ ہے۔ اس طریقہ' تعلیم میں ترتیب وار جماعتیں نہیں ہوتی ہیں بلکہ ہر ہر مضمون کے علیحدہ علیحدہ کمرے ہوتے ہیں مثلاً ایک کمرہ جغرافیہ کا ہوگا تو اس میں مختلف قسم کے اٹلس، نقشے، سفرنامے جغرافیہ کی کتابیں، ملکوں کے حالات، غرض ہر چیز موجود ہوگی جس سے بچے کام لے سکیں۔ اسی طرح "تاریخ" کے مضمون کا، اُردو کا، حساب کے مضمون کا الگ الگ کمرہ اپنے ضروری سامان کے ساتھ لیس ہوگا۔

نصاب کے مطابق تعلیم کے معاملہ میں بھی مقررہ درسی کتابیں نہ ہوں گی بلکہ ایک مضمون کے نصاب کو مختلف حصّوں میں بانٹ دیا گیا ہوگا اور ہر ایک حصّہ کو تفویض، کہیں گے۔ اس لئے بعض وقت اس طریقہ کو "تفویضی طریقہ" بھی کہا جاتا ہے۔

ذاکر صاحب نے یہ دیکھ کر کہ سعید انصاری صاحب ابھی امریکہ سے واپس آئے ہیں اور ہر منزل کے طریقہ تعلیم کا انھوں نے وہاں رہ کر مطالعہ کیا ہے، ثانوی مدرسہ میں انفرادی طریقہ' تعلیم رائج کرنے کا یہ کام بھی ان کے سپرد کیا۔ علاوہ ان کے استادوں کے مدرسہ کے کام کے، سعید انصاری صاحب نے پہلے تو صرف یک مضمون، اردو، میں یہ طریقہ رائج کیا اور ثانوی اوّل سے شروع کیا۔ آپ نے ثانوی اول کے نصاب کو دس

حصوں میں بانٹا اور ہر ایک حصّہ کو بطور "تفویض" مع ضروری ہدایات اور اشاروں کے طلبا کو کرنے کے لئے دیا۔ ساتھ ہی اس کے آپ نے ضروری لغات، دوسری حوالہ کی کتابیں اور عام مطالعہ کے لئے کتابیں مہیا کر دیں، بچوں نے ان ہدایات اور اشاروں کو سامنے رکھ کر اور ان کتابوں کی مدد سے اپنا کام شروع کیا۔ شروع شروع میں تو استاد اور شاگرد دونوں کو الجھنیں رہیں، لیکن پھر بعد میں جب کام ایک دھرّے پر لگ گیا تو پھر طلبا نے بڑے ذوق شوق اور انہماک سے یہ کام کیا۔ یہاں تک کہ وہ مطالعہ کے لئے کتابیں گھر پر بھی لے جاتے اور اکثر اوقات انھی کتابوں کا مطالعہ کرتے، وہ بعض وقت دوسرے مضمونوں کا کام بھی چھوڑ دیتے، اس لئے کہ اس میں انھیں اتنی دلچسپی اور شوق پیدا نہیں ہوا۔

اردو کے مضمون میں یہ انفرادی طریقہ ثانوی کی تینوں جماعتوں میں یعنی ثانوی اول، دوم، سوم میں نہایت کامیابی کے ساتھ چلا، اُردو کا ایک کمرہ مخصوص تھا جس میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، دیواروں پر مختلف مصنفین اور شعرا کی تصویریں آویزاں تھیں کہیں کہیں ان کے خطوط کے نمونے لگے ہوئے تھے جس سے ہر ایک کی الگ شان ٹپکتی تھی۔ بعض بعض زبانوں میں طلبا کے کئے ہوئے کاموں کے نمونوں کی بھی نمائش تھی۔ مثلاً ایک جماعت نے "اردو کا نظام شمسی" کے عنوان سے سرسید اور ان سے متاثر مصنفین کو تصویر میں بھی اسی نسبت اور سائز اور فاصلہ کے اعتبار سے بنایا تھا جو نظام شمسی میں سورج اور دوسرے سیاروں کا ہے۔ یہ ایک اچھوتا خیال تھا جو ہر ایک کو اپنی طرف مائل کرتا تھا۔

غرض اس طرح کے اور بہت سے کام بھی ہر ہر جماعت کے تھے اور طلبا میں اس ابتدائی دلچسپی کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے ان میں سے بعض بعض اُردو کے بڑے اچھے اہل قلم اور ادیب بن گئے۔

سعید انصاری صاحب نے یہ کام بڑی محنت اور کامیابی سے چلایا، جو بعد میں بھی کافی عرصہ تک جاری رہا۔

ٹیچرس کالج کے استاد نور محمد صاحب گاؤں سدھار کا کام بڑی محنت اور لگن سے کر رہے تھے کہ اس کالج میں پنڈت شری لال رام صاحب آگئے آپ نے نہ صرف اد کھلا بلکہ آس پاس کے گاؤں بھی اس پروگرام میں شامل کر لئے پنڈت جی کے جذبہ خدمت اور محنت سے متاثر ہو کر ان کے شاگرد بھی اس کام میں پیش پیش رہنے لگے۔

جامعہ کالج کے تعلیمی اور تفریحی کاموں میں مدد دینے والے دو بڑے عنصر، "انجمن اتحاد" اور رسالہ "جوہر" تھے۔ اس رسالے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر طالب علم یا رکن اپنا مضمون یا تبصرہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیتا تھا، یہی اوراق جوہر میں چسپاں کر دئے جاتے تھے، یہ رسالہ اپنا سالنامہ نکال رہا تھا، مدیر نے ڈاکٹر ذاکر صاحب سے پیام کی فرمائش کی موصوف نے "آپ کی سند" کے عنوان سے حسب پابندی اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا مضمون دیا۔ ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔

"جوہر کے کارکن مجھ سے ایک پیام چاہتے ہیں، پیام بھیجنے کے لئے ایسا خیال ہوتا ہے کہ کچھ دوری کی ضرورت ہے اور میں آپ میں اور اپنے میں اس دوری کو محسوس نہیں کرتا اس لئے آپ سے باتیں کر سکتا ہوں آپ کو پیام نہیں بھیج سکتا۔ باتیں زبانی بہتر ہوتیں لیکن مجبوری ہے۔ جوہر میں تو تحریر ہی کے ذریعہ باتیں ممکن ہیں۔

جوہر کے پڑھنے والے کالج کے طلبا سب کسی نہ کسی علم میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کالج میں چند سال رہنے کا ظاہری مقصد ایک سند کا حاصل کر لینا ہے وہ سند اس بات کی تصدیق کرے گی کہ آپ علم کی کسی نہ کسی شاخ میں دستگاہ رکھتے ہیں اس کو کم سے کم اپنے ممتحن کے سامنے کم و بیش وضاحت سے پیش کر سکتے ہیں لیکن وہ سند یہ نہ بتا سکے گی کہ آپ کو اس علم سے واقعی کوئی لگاؤ بھی ہے یا نہیں اور اس سے

ذہن کی جو تربیت ممکن ہے وہ بھی آپ کے حصہ میں آتی ہے یا نہیں کوشش کیجئے کہ کم سے کم آپ خود اس سند کے بین السطور میں یہ بھی درج پاسکیں کہ "انھوں نے اس علم کے خزانے کی ایک کنجی بھی بنالی ہے جس سے اُسے کھول سکتے اور فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ انھیں اس علم کی مملکت کا نقشہ پڑھنا بھی آتا ہے۔ یہ اس میں مختلف مسائل کی جگہ بھی متعین کر سکتے ہیں۔ یہ ذہنی کاہلی کی وجہ سے سوال کی تہ تک جانے سے نہیں اکتاتے اور بہتر دماغوں کی مدد سے اپنے خیال اور علم میں وضاحت پیدا کرنے کی سعی سے کتراتے نہیں۔

ایسا نہ ہو کہ آپ کو سند کے بین السطور میں کبھی یہ لکھا دکھائی دے کہ "انھوں نے سند تو لے لی ہے۔ جہاں جہاں ہاتھ پکڑ کر انھیں پہنچاؤ، پہنچ جاتے ہیں بہ چمچوں سے منہ میں کچھ ڈال دو تو نگل لیتے ہیں، ہضم پھر بھی نہیں کر پاتے۔ کتابوں کے خلاصے اور لیکچروں کے نوٹ انھیں حفظ ہیں مگر کتب خانہ میں ٹھہا دو تو حیرت سے دم بخود ہو جاتے ہیں کوئی غیر مانوس نیا سوال سامنے آئے تو بزدلوں کی طرح راہ فرار ہی اختیار کرتے ہیں۔

چوں کہ علم ترقی پذیر زندگی کا سہارا ہے اس لئے آپ کی سند سے کوئی یہ سمجھے کہ آپ زندگی کے میدان میں بھی علم کو اپنے ساتھ رکھیں گے تو چنداں بے جا نہ ہوگا کہ علم ہی سے آپ میں سوجھ بوجھ پیدا ہوگی قوت فیصلہ میں توازن ہوگا۔ قرائن اور شہادتوں کو اچھی طرح جانچ سکیں گے۔ ہر سیاسی طلسم میں پھنس نہ جائیں گے۔ ہر مذہبی بازیگر کے پیچھے تالیاں بجاتے نہ پھریں گے۔ آدمیوں کو پرکھ سکیں گے اور سونے اور ملمع میں تمیز کرنا سیکھ جائیں گے ہتھیلی پر سرسوں جمانے والے شعبدہ بازوں کی چالیں سمجھیں گے۔ قریب پر نظر ہوگی مگر دور کو بالکل نظر انداز نہ کر دیں گے۔ عاجلہ کی خاطر آخرۃ کو نہ بھلا دیں گے۔

کہیں یہ نہ ہو کہ آپ کی سند کے حاشیہ پر ایک ایسی تحریر ہو جسے چاہے دوسرے پڑھ پائیں یا نہ پڑھ پائیں۔ آپ کبھی کبھی پڑھ سکیں اور اس میں لکھا ہو کہ "یہ پڑھے

لکھے نوجوان ضرور ہیں۔ مضمون بھی لکھتے ہیں کتابیں لکھنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ تقریر بھی
لچھے دار کر لیتے ہیں مگر خود غرضی میں کوتاہ اندیش ہیں کوئی بات ان کے موافق ہو تو اسے
جھٹ مان لیتے ہیں جو ذرا ان کے خلاف پڑتی ہو اس کی کسی نہ کسی بہانہ سے مخالفت
کرتے ہیں۔ جماعتی معاملات میں بھی ان کی رائے ان کی غرض کی پابند ہوتی ہے ہر
نئے تجربہ سے ڈرتے ہیں کہ نہ جانے ان پر اس کا کیا اثر ہو۔ بہتر دنیا کا خواب تک نہیں
دیکھتے اس کو وجود میں لانے کے لیے جن اخلاقی قوتوں کی ضرورت ہے ان کے پیدا کرنے
کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

آپ کی سند میں یہ بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی، اور اس سند کا لکھنا آپ ہی کے ہاتھ
میں ہے۔ آپ روزانہ اسے لکھتے ہیں"

انجمن اتحاد کی دعوت پر "بھارت میں انگریزی راج" کے مصنف اور ملک کے مقتدر
لیڈر پنڈت سندر لال تشریف لائے۔ تمام مذاہب کے پیروؤں میں آپ کی تقاریر
اشتیاق سے سنی جاتی ہیں۔ انجمن اتحاد کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں پنڈت
سندر لال جی نے ہندو مسلم اتحاد پر اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا۔ حاضرین میں
جامعہ برادری کے تمام حضرات شریک تھے۔ طلباء کی طرف سے آزاد رسول صاحب
نے جلسہ کی صدارت کی۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی
صدر جلسہ نے مناسب الفاظ میں پنڈت جی کا حاضرین سے تعارف کرایا اور ان کی
ان خدمات کو سراہا جو انھوں نے ہندو مسلم اتحاد اور اردو ہندی کے مسئلے میں انجام دی
ہیں اس کے بعد پنڈت جی نے اپنے خاص انداز میں، بیان کیا کہ شیخ الجامعہ ذاکر حسین
صاحب کی شخصیت کی کشش تھی، جو ان کے جامعہ آنے کا سبب ہوئی۔ وہ اگرچہ پہلے
کبھی ان سے نہ ملے تھے لیکن انھوں نے فرمایا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں ذاکر صاحب کے
بہت قریب آگئے۔

موصوف نے ہندوستان کی موجودہ حالت پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ہماری پستی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اوّل تو ہم ہندوستان کے متعلق کچھ سوچتے ہی نہیں لیکن اگر کبھی تھوڑا بہت کچھ سوچنے کی تکلیف بھی گوارا کرتے ہیں تو فقط اتنی کہ مستقبل میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہوگا۔ جرمنی کے جاپان کے۔ ہمیں کبھی اس کا تصور بھی نہیں آتا کہ انگریزوں کے بعد ہم بھی ہندوستان کے مالک بن سکتے ہیں۔ موصوف نے قوموں کے عروج و زوال کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح بچے کو نوجوانی اور بڑھاپے بیماری اور صحت سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس طرح قومیں بھی ان تمام منازل سے گزرتی ہیں ہمارے سامنے تاریخ ہے اور تاریخ سے ہم اس کا کافی ثبوت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری قوم اس میں شک نہیں کہ نہایت مہلک مرض میں گرفتار رہے اور اپنے ماحول کے تاثرات سے ہمارے بڑے بڑے لیڈر بھی نہیں بچ سکے لیکن گھبرانے کی بات نہیں ہم اگر کوشش کر کے اپنی کمزوری کی اصل وجہ دریافت کر لیں تو کوئی وجہ نہیں ہم اسے دور نہ سکیں۔ میرے خیال میں آج کل ہندو مسلم مسائل کے حل کو جن چیزوں نے مشکل بنا دیا ہے ان سب کی بنیاد مختلف مذاہب اور ان کا غلط استعمال ہے ہم "یہ مذہب اور وہ مذہب" کی ذہنیت سے اپنے مسائل کو پیچیدہ بنا رہے ہیں اگر اس سے نجات حاصل کر لیں تو ہمارے تمام امراض کا علاج ہو جائے۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم لا مذہب ہو جائیں۔ یہ خود ایک مرض ہے اور اس کی وجہ سے آج یورپ کو جو مصیبتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ یورپ اور ہم میں یہی فرق ہے کہ وہ مذہب کو اقتصادیات اور سیاست کا تابع بنا کر رکھنا چاہتا ہے اور اہل مشرق اقتصادیات اور سیاست کو مذہب اور اخلاقیات کے نیچے درجہ دینا چاہتے ہیں۔ موصوف نے سائنس کی روشنی میں مذہب کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اخلاقی قوتوں سے ہم اگر انکار کر بیٹھیں تو تمام دنیا دوزخ کا نمونہ بن جائے۔

مذہب کے نام سے دنیا کے بیزار ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ مذہب بیکار محض ہے بلکہ اس کی وجہ مختلف مذاہب کے وہ پیرو ہیں جنھوں نے اپنے مذہب کو بدنام کر رکھا ہے۔ ان کی باہمی کشمکش ہر سوچنے سمجھنے والے کو مذہب سے بیگانہ اور متنفر کردیتی ہے اگر مذہب والے مذہب کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ تمام مذاہب کے باہمی تفرقے مٹا دیں۔ موصوف نے فرمایا کہ تمام مذہبی کتابیں روحانی تکلیف میں ہمیشہ تسکین دیتی ہیں اور رواداری کا سبق سکھاتی ہیں۔ قرآن شریف تو ان میں خصوصیت سے ایک امتیازی شان کا مالک ہے لیکن افسوس کہ اس کے ماننے والے رواداری کو بھول گئے جو اس کی روح تھی۔

اس سلسلہ میں نہایت جوش، محبت اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا کہ

عرب کا پیغمبر آدمی تھا، آج ان کی میرے دل میں جتنی عزت ہے اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اگر خواب میں بھی اس کے نقش قدم چوم سکوں تو میں اسے اپنی عزت محسوس کروں گا اور سمجھوں گا کہ وہ میری زندگی کا بہترین لمحہ تھا جب مجھے یہ سعادت نصیب ہوئی۔"

اس کے بعد موصوف نے مذاہب میں رواداری پر زور دیتے ہوئے اپنی تقریر کو ختم کیا۔ صدر جلسہ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

اُستادوں کا مدرا اپنے فرائض کی بجا آوری میں آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ اور چیزوں کی طرح پڑھانے کے طریقوں میں ترقی جاری رہتی ہے۔ طے پایا کہ بلدیہ دہلی کے پرانے اساتذہ کی تربیت کے لئے ایک اعادی نصاب جاری کیا جائے۔ اس کا نصاب مرتب ہوا، پانچ ہفتہ کا یہ کورس اسی سال انجام پایا، اس کے نصاب کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ

"یہ اعادی نصاب ان مدرسین کی پچھلی ٹریننگ کا اعادہ نہیں بلکہ ان کے موجودہ علم اور کام میں تازگی اور نیاپن پیدا کرنے کی غرض سے دیا جارہا ہے۔ پانچ ہفتہ کی

اس مختصر مدت میں انھیں کچھ ہاتھ کے کام سکھائے جائیں گے تاکہ وہ بچوں کی تعلیم کو محض خشک کتابی طریقے پر منحصر نہ رکھیں۔ انھیں اردو، جغرافیہ، انشاء اور لکھنا سکھانے کے نئے طریقے بتائے جائیں گے تاکہ وہ اپنے کام کو اور بہتر طور پر انجام دے سکیں۔ انھیں تربیت جسمانی کے نئے اصول اور طریقوں سے واقف کرایا جائے گا تاکہ وہ اپنے لڑکوں کی صحت جسمانی اور ان میں زندگی اور خوشی پیدا کرنے کا خیال رکھیں انھیں مدرسہ اور جماعت کے انتظام میں نئے نقطۂ نظر سے آشنا کیا جائے گا تاکہ وہ بچے کو اپنی تمام تعلیم و تربیت کا محور اور مرکز جانیں۔ امید ہے کہ اس قلیل مدت میں وہ ان تمام باتوں سے تھوڑا تھوڑا واقف ہو جائیں گے اور اپنے آیندہ کے شوق اور عمل سے اس میں مزید اضافہ کریں گے۔"

کورس ختم ہونے پر اسناد کی تقسیم کے لئے خاص جلسہ ہوا۔ جس میں چودھری نصر اللہ خاں صاحب سکریٹری، ایس۔ ایم۔ جعفری صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیمات، چودھری دلیس راج صاحب سینیئر وائس پریسیڈنٹ اور دیگر مقتدر حضرات شریک تھے۔

جلسہ کی صدارت جناب لالہ دیس راج سینئر وائس پریذیڈنٹ بلدیہ دہلی نے فرمائی۔ جلسہ کی کارروائی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کی ایک پُر مغز اور جامع تقریر سے ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "آج اس جلسہ میں اراکین بلدیہ کا خیر مقدم کرتا ہوں، بعض سیاسی وجوہ کی بناء پر جب جامعہ کو علی گڈھ سے دہلی منتقل کرنا ضروری سمجھا گیا تھا تو یہ کہا جاتا تھا کہ مایوس العلاج مریض کو دہلی علاج کی غرض سے لے جایا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب ہم دہلی منتقل ہوئے اس وقت ہم نہایت بے سر و سامانی کی حالت میں تھے، نہ ہمارے پاس روپیہ تھا نہ کوئی عمارت تھی اور نہ کوئی خاص سامان تھا، کرایہ کی ایک عمارت میں رہنا شروع کیا تھا۔ یہاں کے لوگ ہم سے گھبراتے تھے۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ بلدیہ دہلی کے مدارس کے استاد ہمارے ہاں تعلیم کی غرض سے بھیجے جائیں گے اور اس تقریب میں شرکت کرنے پر ہم بلدیہ دہلی کے اراکین کا

بہ حیثیت اراکین بلدیہ خیر مقدم کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مایوس العلاج مریض کو جسے حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم دہلی لائے تھے، دہلی کی آب و ہوا بہت موافق آئی اور وہ یہاں آکر اچھا ہوگیا، دہلی والوں نے ہماری بہت بڑی مدد کی اور بلدیہ دہلی نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا بنیادی تعلیم کے جو تجربے جامعہ نے کئے، بلدیہ دہلی نے اس میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ بلدیہ دہلی کی تعلیمی کمیٹی اور جناب جعفری صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیمات کا خاص طور سے احسان ہے کہ انھوں نے تعلیمی تجربوں میں ہماری خاص طور سے مدد فرمائی اور اپنے ہاں کے استادوں کو تعلیم کی غرض سے بھیجا اور اعادی نصاب (ریفریشر کورس) کے لئے منتخب استادوں کو بھیجا۔ اراکین بلدیہ کے ہم شکر گذار ہیں کہ اس نے باوجود گورنمنٹ کی طرف سے قسم قسم کے اعتراضات کے آزادانہ طور سے ہماری مستقل امداد منظور فرمائی۔

"ہماری خواہش ہے کہ دہلی کی بلدیہ تعلیمی معاملات میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں اور دوسری بلدیوں کے لئے رہنمائی کا کام انجام دے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسا کرنے میں دریغ نہیں کرے گی۔ جن مدرسین کے ہاتھ میں ننھے ننھے بچّوں کی باگ ڈور ہے ان کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف خاص طور سے بلدیہ کو توجہ کرنی چاہیئے اور ان کی پریشانیوں کو کم کرنا چاہیئے تاکہ وہ یکسوئی سے کام کرسکیں اور بہتر خدمت انجام دے سکیں اور جو مدرس اپنے کام کے اہل نہ ہوں، انھیں نہیں رکھنا چاہیئے۔ جو مدرس ہمارے ہاں تعلیم کی غرض سے بھیجے گئے تھے، انھیں یہاں جو تکلیف ہوئی ہوگی اس کا ہمیں پورا احساس ہے لیکن انھوں نے بہت جلد ہمارے ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا اور ہم نے بھی ان کی ضرورت کے مطابق ان کی تکالیف پر قابو پالیا۔ ان مدرسین نے ان پانچ ہفتوں کی مدّت میں جو سیکھا اس کے نمونے آپ کو دوسرے کمروں میں جو نمائش گاہ بنائی گئی ہے، اس میں نظر آئیں گے۔ آپ کو وہاں یہ مدرسین عملی کام کرتے ہوئے بھی ملیں گے، مثلاً ابری بناتے

ہوئے، کاغذ بناتے ہوئے، مٹی کے کھلونے بناتے ہوئے، تکلی چلاتے ہوئے، وغیرہ وغیرہ۔ میں تمام حضرات کا تہہ دل سے اس جلسہ میں شرکت کی اور اراکین بلدیہ کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد جناب سعید انصاری صاحب پرنسپل استادوں کا مدرسہ نے اعادی نصاب کے متعلق اپنی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد کامیاب طلبہ کو صدر جلسہ لالہ دیس راج صاحب سینئر وائس پریذیڈنٹ بلدیہ دہلی نے سندیں تقسیم کیں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اپنی طرف سے ایک انعام سب سے اچھے رہنے والے استاد رام پت صاحب کو دینے کا اعلان کیا اور جناب خاں صاحب حبیب الرحمٰن خاں صاحب جونیئر وائس پریذیڈنٹ کی طرف سے ایک انعام دس روپے کا سب سے اول استاد کے لئے اور پانچ پانچ کے انعامات درجہ اول کے تمام کامیاب طلبہ کے لئے دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔

آخر میں جناب صدر نے نہایت موزوں الفاظ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور جامعہ ملیہ کا شکریہ ادا کیا اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی قومی اور ملکی خدمات کا اعتراف فرمایا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ بلدیہ دہلی نے جامعہ کے لئے جو امداد منظور کی ہے وہ کوئی احسان نہیں کیا ہے بلکہ ایک ادنیٰ فرض انجام دیا ہے۔ جناب جعفری صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیمات نے ان استادوں کے لئے جو اعادی نصاب سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کام پر واپس جانے والے تھے، چار روز کی چھٹی کا اعلان فرمایا ....

.... جلسہ کے بعد تمام مہمانوں نے نمائش گاہ میں جا کر اعادی نصاب کے کام کے نمونے دیکھے اور طلباء کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد چائے نوشی کی دعوت ہوئی اور کل کاروائی بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

اس عرصہ میں جامعہ اور گاؤں والوں کی مدد سے گاؤں کے مدرسہ کی چھوٹی

سی عمارت بھی بن گئی تھی۔ افریقہ کے ایک ماہر تعلیم ڈالٹن صاحب نے اس کام کو بہت سراہا جو استادوں کا مدرسہ گاؤں والوں کے سدھار کے سلسلہ میں کر رہا تھا۔

دیگر شعبوں میں اُردو اکادمی کے سلسلہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "ہندوستانی تمدن" پر اپنا مقالہ پڑھا۔ اُردو اکادمی کے کام آپ کی نظامت میں جاری تھے۔ مسائل خواہ تعلیمی ہوں یا سیاسی، قومی ہوں یا ملی، ان سب میں ڈاکٹر ذاکر صاحب ایک سلجھا ہوا دماغ رکھتے ہیں۔ ایک ایسا یقین جس سے جامعہ والوں کو رہنمائی ملتی ہے۔ پھر بھی بات جامعہ کے ایک محدود خاندان کے لحاظ سے بھی دیکھئے تو ڈاکٹر صاحب ہماری کتنی ہی گتھیاں سلجھاتے ہیں جس سے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں سے جتنی اہم تبدیلیاں جامعہ میں ہوئی ہیں، ان سب میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کے مشوروں سے بڑی مدد ملی ہے۔

انجمن ملازمین نے "سیرتؐ" سے متعلق اور انجمن خواتین نے "یاد حسینؓ" کے نام سے جلسے کئے۔

تبلیغی جماعت کے سرکردہ رہنما مولانا محمد الیاس صاحب جو قریب ہی میں یعنی حضرت نظام الدینؒ میں قیام فرما ہیں، جامعہ میں تشریف لائے اور جامعہ برادری کے سامنے اپنی تحریک کے مقاصد اور اس کے کاموں پر روشنی ڈالی۔

اسلامی دنیا میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ایڈیٹر "ترجمان القرآن" ایک خاص شہرت کے مالک ہیں اور اعلیٰ پائے کے عالم سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے جامعہ کے توسیعی لکچروں کے سلسلہ میں قرآنی علوم کے متعلق ایک بصیرت افروز مقالہ جامعہ نگر میں ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے پڑھا۔ مولانا ممدوح نے وہ نکات بیان کئے جو خاص انھی کا حصہ تھے۔ شہر سے بھی کافی لوگ آئے تھے۔

اس سال کی ایک رنج کی خبر بھی ہے۔ علی گڈھ سے اطلاع آئی کہ جامعہ کے

سابق استاد مولانا محمد سورتی کا انتقال ہو گیا۔

مولانا مرحوم اپنے دینی عقائد کی شدّت کے لئے مشہور تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ میں انھوں نے چھوٹے بڑے کی کبھی تمیز نہیں کی اور نہ کسی کی قوت و حشمت ان کے اس عقیدہ پر غالب آئی لیکن جس چیز نے مرحوم کی انتہا پسندی اور شدت کو گوارا بنا دیا تھا وہ ان کی بزرگانہ شفقت اور محبت تھی اور اسی محبت کا اثر تھا کہ وہ عرصہ ہوا جامعہ سے چلے گئے تھے لیکن جامعہ کو کبھی بھول نہیں سکے اور جب کبھی موقع اور مہلت پاتے، ایک آدھ مہینے کے لئے تشریف لے آتے اور جامعہ میں قیام فرماتے، ان کے بہت سے شاگرد اب استاد بن چکے ہیں لیکن ان کی شفقت کے لئے سب بچے تھے۔

دوسری اندوہناک خبر آپا جان (گرڈا فلپس بورن صاحبہ) کی ہے وہ آپا جان جو مریضوں کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیتی تھیں، جو بچوں کی صحت کا ہر وقت خیال رکھتی تھیں، ہم سے جدا ہو گئیں۔ کم تنخواہ پر گذارہ کرتی تھیں، جب کبھی دہلی کی ایک جرمن کمپنی میں انھیں ٹائپ کا کچھ کام ملتا تو اس کی اُجرت دفتر...... میں یہ کہہ کر جمع کر دیتیں کہ کنڈر گارٹن کلاس کے لئے اس سے سامان خرید لیا جائے۔ یہ بھی ان کے ایثار خلوص کی ایک مثال۔

اس سال کے مہمانوں میں حیدر آباد کے مہمان خاص ..... ریاست کے صدر اعظم حافظ سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری جامعہ میں تشریف لائے آپ نے جامعہ کے مختلف شعبوں کو ملاحظہ فرمایا۔ آپ کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں شہر کے عمائدین شریک تھے۔

مدرسہ ابتدائی کے چھوٹے بچوں نے ایک ایڈریس پیش کیا اور جامعہ کے اسکاوٹس نے اے۔ آر۔ پی۔ کے کاموں کا نہایت اچھا مظاہرہ کیا جسے تمام حاضرین نے بہت

پسند کیا۔ بم کا پھٹنا۔ مختلف مقامات پر آگ کا لگنا۔ اسکاؤٹس کا آگ بجھانا، مجروحین کو ہسپتال پہنچانا اور زخمیوں کی امداد کرنا وغیرہ وغیرہ بالکل اصلی سماں معلوم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے مختلف مہمانوں اور اساتذہ جامعہ کا تعارف کرایا۔ نواب صاحب نے بچوں کے لئے مبلغ پانچ سو روپے عطا فرمائے۔

دوسرے مہمان حیدرآباد کے رہنما نواب بہادر یار جنگ ہیں۔ آپ کے ہمراہ ہمارے قدیم طالب علم اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر حیدرآباد بھی تھے۔ نواب صاحب ممدوح نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کی معیت میں جامعہ کے مختلف شعبوں کا معائنہ فرمایا اور مغرب کی نماز مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے ساتھ ادا کی۔ بعد نماز مندرجہ ذیل الفاظ میں اساتذہ اور طلبہ سے خطاب فرمایا۔

"عزیز بچو!

اس وقت اپنے کو میں تم میں پاکر جس قدر خوش ہوں اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے اور میں اس بات کو محسوس کر رہا ہوں کہ جہاں میں نے اپنی زندگی میں اور بہت سی غلطیاں کی ہیں وہاں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ میں اب تک جامعہ کو نہ دیکھ سکا۔ ایسی درسگاہ کو اتنی تاخیر سے دیکھنا ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہاں اس سے پہلے آجانا چاہیئے تھا۔ تم لوگوں سے مل کر اور تمہارے کاموں کو دیکھ کر میں دلی خوشی محسوس کر رہا ہوں اور آج کا دن میری زندگی کے خوش کن ایام میں سے ایک ہے۔

عزیز بچو!

میں نے اس قلیل عرصہ میں یہاں جو کچھ دیکھا، اسے اور تم لوگوں کو دیکھ کر اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جامعہ ہی ایسی درسگاہ ہے جو وہ صحیح تعلیم دیتی ہے۔ جس سے صحیح شعور پیدا ہوتا ہے اور صحیح شعور سے صحیح احساسات پیدا

ہوتے ہیں اور پھر صحیح احساسات سے صحیح عزائم کی بنیاد پڑتی ہے صحیح شعور صحیح احساسات اور صحیح عزائم ہی وہ ارتقائی منزلیں ہیں جو کامیاب انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں پڑھنے کے لئے جامعہ جیسی درسگاہ ملی اور پڑھانے کے لئے ایسے اچھے اچھے لائق اور مہربان استاد نصیب ہوئے۔

عزیز بچو،

ہماری ساری آرزوئیں تم ہی سے وابستہ ہیں۔ تم ہی اس کو پورا کرو گے۔ تم ہی ہمارے گردشِ ایام کو بدلو گے۔ تم ہماری آس ہو، ہمارے مستقبل کے بنانے والے ہو، ہماری اُمید ہو۔ تم ابھی چھوٹے ہو، بڑے ہوگے، پروان چڑھو گے، پھلو گے پھولو گے۔ تم اپنے استادوں کے پاس قوم کی امانت ہو، قوم جب چاہے ان کی بازپرس کر سکتی ہے۔

تمہارے شیخ میرے بچپن کے ساتھی ہیں، ہم ایک عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں لیکن اب:۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

عزیزو،

ہمارے افعال کی نسبت اگر ہماری ذات تک ہی محدود رہتی تو کوئی ایسی بات نہ تھی، لیکن میں کانپ اٹھتا ہوں جب یہ دیکھتا ہوں کہ ہمارے اچھے اور برے کاموں کی نسبت اس ذات تک پہنچ جاتی ہے جو ساری دنیا کے لئے نور ہدایت بنا کر بھیجا گیا۔ اس لئے یہ نہ بھول جانا کہ تمہارا رشتہ اس سے ہے جو دائی حلیمہ کی بکریاں چراتا تھا۔ تمہارا رشتہ اس سے ہے جسے لوگوں نے صادق اور امین کے لقب سے نوازا۔ اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو جس سے

(جامعہ کی کہانی)

اس کی رسوائی ہوتی ہو۔

عزیزو!

میں جب کبھی بھی طالب علموں کی مجلس میں کچھ کہتا ہوں تو آخر میں اکبرؔ کے دو شعر تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں، چنانچہ تمہیں بھی وہی شعر آخر میں تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں، اور بس :۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں جھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو "

آپ کی تقریر میں اس قدر سوز و گداز تھا کہ تمام سامعین پر حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی بہت زیادہ اثر ہوا۔

۱۸ فروری کو نواب کمال یار جنگ اور نواب ظہیر یار جنگ امیر پائیگاہ تشریف لائے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جو تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی مقرر فرمائی تھی، اس کے صدر نواب کمال یار جنگ تھے۔ اس سلسلہ میں اس کمیٹی نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا جو دورہ کیا تھا اس کے تمام اخراجات نواب صاحب ممدوح نے اپنی جیب خاص سے ادا کئے تھے۔ نواب ظہیر یار جنگ اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ نے آپ کو استادوں کا مدرسہ، مدرسہ ثانوی، مدرسہ ابتدائی اور اس کے تمام شعبے دکھائے۔ بوائے اسکاؤٹس نے آپ کو سلامی دی۔ آپ کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا تھا جس میں عمائدین شہر مدعو کئے گئے تھے۔ مدرسہ ابتدائی کے چھوٹے بچوں کی انجمن نے ایک اڈریس پیش کیا۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے نواب کمال یار جنگ بہادر اور نواب

ظہیر یار جنگ کی طرف سے ایک ایک ہزار روپیہ بچوں کے لئے عنایت فرمانے کا اعلان کیا۔

مدرسہ ثانوی کے ایک کمرہ میں یادگار حالی کی نمائش کا سامان تھا۔ نواب کمال یار جنگ نے اس میں بہت دلچسپی لی اور مندرجہ ذیل ایک رُباعی نوٹ فرمائی۔

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے تو ہے یہ شہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

دُوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے گرانی بہت بڑھ گئی تھی، اگرچہ جامعہ کے ہمدرد بڑھتے جا رہے تھے، چھوٹی چھوٹی امداد کی میزان پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ خاص عطیے بھی ملنے لگے تھے مگر اخراجات بھی اسی نسبت سے بہت بڑھ گئے تھے۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ریاست حیدرآباد اور بھوپال کے سامنے رکھیں، دونوں جگہ امید سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ یعنی :-

ریاست حیدرآباد نے ایک ہزار رُوپے ماہوار اور پانچ سو رُوپے گرانی الاؤنس کی بجائے ڈھائی ہزار رُوپے ماہوار اور پانچ سو رُوپے ماہوار الاؤنس گرانی کر دیا۔

ریاست بھوپال نے یکمشت دس ہزار روپئے دئے۔ اور پانچ سو روپئے ماہوار مقرر کر دیئے۔

جامعہ کے استحکام کے لئے ان ریاستوں کی معرفت یہ خدائے تعالیٰ کا بڑا فضل تھا۔

دوسرے خاص عطیئے یہ ہیں :-

۱۔ فرم حاجی جیون بخش محمد جان صاحب کلکتہ، دوسو روپئے ماہوار۔
۲۔ حاجی شیخ محمد جان صاحب رئیس دہلی سوداگر کلکتہ چار ہزار یکمشت
۳۔ بنگلور کے سیٹھ سلیمان حاجی یوسف سیٹھ، پانچ سو یکمشت
اس کے علاوہ ایک قاری (استاد) کی ماہوار تنخواہ کا وعدہ فرمایا۔

۴۔ گذشتہ سال کی کہانی میں ہم نے بے طلب عطیے کا ذکر کیا تھا، اس سال دو گمنام محسنوں نے جامعہ کو جس طرح نوازا ہے اس کا حال آپ کو اگلے سال شیخ الجامعہ صاحب کی رپورٹ میں ملے گا۔ یہاں حاجی شیخ محمد جان صاحب سوداگر کلکتہ کے دو اور عطیوں کا ذکر ضروری ہے۔ آپ نے پہلی دفعہ اپنے فرزند محمد عثمان سلمہٗ کے نام سے ایک کمرہ بنانے کے لئے دو ہزار روپئے دئے تھے، اس سال دوسرے فرزند محمد سلیمان سلمہٗ کی طرف سے دوسرا کمرہ بنوانے کے لئے مزید دو ہزار روپئے دئے ہیں، ان کے علاوہ جیسا اوپر مذکور ہے "فرم حاجی جیون بخش علی جان کلکتہ" کے نام سے آپ دوسو روپے ماہوار دیا کرتے تھے۔

چوبیسواں سال

اگست ۱۹۴۳ء سے جولائی ۱۹۴۴ء

ادارہ تعلیم و ترقی کو قائم ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی تھی، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کاموں پر ایک نظر ڈال لیں۔

یہ بات ہم نے کسی جگہ بتا دی ہے "تعلیم و ترقی" کا ابتدائی کام "مدرسہ شبینہ" کے نام سے ۱۹۲۶ء میں حافظ فیاض احمد صاحب کی رہنمائی میں شروع ہوا تھا، اس کی ذمہ داری مجھ پر تھی، لیکن یہ کام صرف ان پڑھ بچوں اور بڑوں کو پڑھانے تک محدود تھا۔ ۱۹۳۳ء میں مزید تجربے کرنے کے لئے محمد حفیظ الدین صاحب کی نظامت میں ایک کمیٹی بنی جس کے صدر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب تھے۔ ان لوگوں کے تجربے جاری تھے کہ اس عرصہ میں دو باتیں سامنے آئیں۔

دلی کے قریب پنجاب کا ایک قصبہ ہے فرید آباد۔ یہاں کے ایک ادیب اور عوامی کارکن جناب سید مطلبی فرید آبادی نے شیخ الجامعہ کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے قصبے کے چند میواتی نوجوانوں کے تعلیمی اشتیاق کا ذکر کرتے ہوئے جامعہ سے ان کے لئے

ایک نصاب تعلیم مرتب کرنے کی فرمائش کی۔

اسی دوران آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری ایم۔ اے قریشی صاحب کا خط آیا جس کے ساتھ اس کے مارچ ۱۹۳۷ء کے اجلاس کا ایک ریزولیوشن منسلک تھا۔ اس ریزولیوشن میں (جو حسب ذیل ہے) جامعہ سے اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک نصاب مرتب کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ ریزولیوشن یہ تھا۔

"یہ کانفرنس جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے فرمائش کرتی ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، موجودہ ادب سے اخذ کر کے جیسا وہ مناسب سمجھے، ایک نصاب تعلیم ایسا مرتب کرے جو اڈلٹ ایجوکیشن کا کام کرنے والے اسکولوں کے لئے مناسب ہو اور کانفرنس ان اسکولوں کے لئے اس کی سفارش کر سکے۔"

اس ریزولیوشن کو جامعہ کی مجلس تعلیمی میں پیش کیا گیا جس نے اس مقصد کے لئے ایک نئی کمیٹی بنادی۔

بالآخر شفیق الرحمٰن صاحب نے ڈاکٹر ذاکر صاحب کی مدد سے ایک ایسی اسکیم تیار کی جو صرف خواندگی تک محدود نہ تھی بلکہ "ہرجہتی ترقی" کی راہیں کھولتی تھی، اس طرح ۱۹۳۸ء میں آپ کی نگرانی میں "ادارہ تعلیم و ترقی" کے نام سے یہ ادارہ قائم ہوا۔

شفیق صاحب مرحوم کے ذہن میں یہ چیز تھی کہ عوام میں تعلیم کے ذریعے ایسی سماجی صلاحیتوں کو ابھارا جائے کہ وہ مل جل کر سماجی بھلائیوں کے کام کر سکیں، ان میں اپنی ترقی کی راہیں تلاش کرنے اور اپنے اوپر اعتماد اور بھروسہ کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان میں بہتر سماجی قدروں کو سمجھنے اور انھیں قبول کرنے کی جو قدرتی صلاحیت اور اہلیت ہے، اسے پیدا کیا جائے۔

اس ادارے کے ایک رکن حسین حسان صاحب نے اپنے کتابچے "ادارہ تعلیم و ترقی"

کی کارگزاری میں جو باتیں سلسلہ وار لکھی ہیں، ان سے اس ادارے کے کام سامنے آجاتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کے قیام کے سلسلے میں ایک دستور العمل شائع کیا گیا اور اس ادارے کے مقصد اور غرض و غایت کو اس طرح بیان کیا گیا۔

(الف) (ادارہ) مناسب راہیں متعین کر کے نصاب تعلیم اور تعلیم کا طریقہ تجویز کرے، نیز ان کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرے۔

(ب) نمونے کے طور پر ضروری تعلیمی سامان تیار کرے اور اس کی اشاعت کا بندوبست کرے۔

(ج) کارکنوں کی ٹریننگ کا انتظام کرے اور ان کی رہنمائی کے لئے مناسب لٹریچر تیار کرے اور اس لٹریچر کی اشاعت کا بندوبست کرے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے اس وقت یہ طریقے تجویز کئے گئے۔

۱۔ ادارے میں ایک کتب خانے اور ایک میوزیم کا قیام۔

کتب خانے میں خاص طور پر بالغوں کی تعلیم پر مفید کتابیں رسالے اور لٹریچر جمع کیا جائے جس کی مدد سے بستی کی تعلیم خصوصاً بالغوں کی تعلیم میں مؤثر طریقے پر کام لیا جا سکے۔

۲۔ ایک نمونے کا تعلیمی مرکز قرول باغ میں قائم کیا جائے اور اسے ناخواندہ، کم خواندہ اور خواندہ طبقے کی تعلیم کے لئے تجربہ گاہ بنایا جائے۔

۳۔ ایک نمونے کا تعلیمی مرکز ہال قائم کیا جائے اور اس میں بستی کے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے تعلیم، تفریح اور ورزش کا انتظام کیا جائے اور اراکین ہال کے لئے سماجی خدمت کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

۴۔ دوسری بستیوں میں بھی اسی نمونے کے تعلیمی مرکز اور تعلیمی مرکز ہال قائم کرنے کی تحریک چلائی جائے۔

۵- بالغ مبتدیوں کے لئے کتبے، رسالے اور کتابیں تیار کی جائیں اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جائے وغیرہ،

چنانچہ قرول باغ میں ایک نمونے کا تعلیمی مرکز قائم کیا گیا۔ اس مرکز کی سرگرمیاں حسب ذیل تھیں۔

۱- ایک بڑے سائز کے "وال پیپر" کی روزانہ اشاعت اس کے خاص نمبر بھی نکلتے تھے، مثلاً دہلی نمبر، روس نمبر، حج نمبر وغیرہ۔

۲- نقشوں اور تصویروں کی روزانہ نمائش۔

۳- مرکز سے گشتی کتب خانے سے روزانہ کتابیں جاری کرنا۔

۴- معلوماتی کتابچوں کی مفت تقسیم۔

۵- ریڈیو سے خبریں اور تقریریں سننے کا انتظام۔

۶- شام کی کلاسیں۔

الف۔ پڑھنا لکھنا سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے مرکز میں شام کی کلاسوں کا انتظام۔

ب۔ ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے مقامی مسجد میں وقتاً فوقتاً تقریروں کے کورس کا انتظام۔

ج۔ جو لوگ روزانہ کی خبریں اور روزمرہ کے واقعات پر تبصرہ سننا چاہیں، ان کے لئے شام کے وقت جمع ہونے کا انتظام۔

د۔ شام کے وقت تعلیمی، سماجی تقریروں اور ڈراموں کا انتظام۔

۷- مقامی آبادی کے بچوں کے لئے کھیلوں اور اسکاؤٹنگ کا انتظام۔

اس تعلیمی مرکز کی تین سال کی سرگرمیوں اور کارکنوں کا خلاصہ نیچے دیا جاتا ہے:-

۱۔ اسلامی تاریخ اور تمدن پر جمعہ کے جمعہ پچاس تقریریں کرائی گئیں۔
۲۔ قرآن کریم کی پانچ سو آیتوں کا ترجمہ سنایا گیا۔
۳۔ تعلیمی مرکز اور مسجد کے لئے ہاتھ سے لکھے ہوئے سو پوسٹر تیار کئے گئے۔
۴۔ تازہ اور نت نئے واقعات پر ایک ہزار تقریریں کی گئیں ان میں تاریخی جغرافی اور سیاسی معلومات کی فراہمی بھی شامل ہے۔
۵۔ ریڈیو براڈکاسٹ سننے کے لئے لگ بھگ ڈھائی سو ۲۵۰ نشستیں ہوئیں۔
۶۔ گشتی کتب خانے سے پندرہ ہزار ۱۵۰۰۰ مرتبہ کتابیں جاری کی گئیں۔
۷۔ روزانہ دیواری اخبار کے لئے سات سو سے آٹھ سو تک تصویریں فراہم کی گئیں۔
۸۔ تیوہاروں کے موقعوں پر ایک ہزار ۱۰۰۰ معلوماتی کتابچے تقسیم کئے گئے۔
۹۔ مذہبی معلومات پر ڈھائی سو کتابچے تقسیم کئے گئے۔
۱۰۔ دیواری اخبار کے بچپن باتصویر ہفتہ واری نمبر نکالے گئے۔
۱۲۔ سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں کے لئے نوجوانوں کی تین انجمنیں بنائی گئیں۔
۱۳۔ مقامی آبادی کے بچوں کی طرف سے پندرہ بلیٹن نکالے گئے۔
۱۴۔ مقامی آبادی کے بچوں نے ہاتھ سے لکھے ہوئے تین رسالے نکالے۔
۱۵۔ اخلاقی نصیحتوں پر مشتمل سو پوسٹر نکالے گئے۔
۱۶۔ سو پوسٹر حفظان صحت اور بین الاقوامی حالات کے سلسلے میں نکالے گئے۔
۱۷۔ دو سو ۲۰۰ بالغوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ان کی پڑھائی لکھائی کا معیار مختلف تھا
۱۸۔ مرکز میں حصہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔
۱۹۔ گشتی لائبریری کے ممبروں کی تعداد پانچ سو تک پہنچ گئی۔ ان میں سے بعض بعض ممبروں نے دو دو سو تک کتابیں پڑھیں۔

۲۰۔ تعلیمی مرکز میں سب آنے جانے والوں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔

۲۱۔ اصلاحی قسم کے سات ڈرامے کھیلے گئے۔

۲۲۔ سنٹر میں پچیس اصلاحی فلمیں دکھائی گئیں۔

۲۳۔ مقامی دستکاریوں کی نمائش کی گئی۔

۲۴۔ بچوں کے نئے تعلیمی کھیلوں اور سکاؤٹ کھیلوں کا انتظام کیا گیا۔ دنوں کا اوسط تقریباً سو پڑتا ہے۔

بالغوں کے لئے نصاب تعلیم تیار کرنے کا سوال شروع سے جامعہ کے سامنے تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جب تعلیم بالغان کا کام شروع کیا گیا تو پہلی فرصت میں اس کی طرف توجہ کی گئی لیکن یہ محض ایک ابتدائی کوشش تھی۔

ادارے نے بالغوں کے لئے گشتی کتب خانہ قائم کیا تو بالغوں کے لئے موزوں کتابوں کی فراہمی میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔

بات یہ تھی کہ اب تک کتابیں یا تو بچوں کے لئے لکھی جاتی تھیں یا پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اس تیسرے طبقہ میں ناخواندہ یا کم خواندہ طبقہ کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا تھا حالانکہ ملک میں اکثریت اسی طبقے کی تھی۔

اس زمانے میں خاص بالغ مبتدیوں کا خیال ذہن میں رکھ کر شاید ہی دو چار کتابیں لکھی گئی ہوں۔ بچوں کی کتابیں موٹی اور کھلی کھلی لکھائی کی وجہ سے بالغوں کے لئے کار آمد ہو سکتی تھیں لیکن اندازِ بیان اور مضامین کے اعتبار سے ان میں بالغوں کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ پڑھے لکھے لوگوں کے لئے جو کتابیں تھیں وہ زبان، اندازِ تحریر، کتابت اور ضخامت غرض کسی اعتبار سے بالغوں کے لئے موزوں نہ تھیں۔ اسی لئے خود ادارے نے تعلیمی نصاب بنانے کا منصوبہ تیار کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے مختلف تدبیریں کی گئیں۔

اس نصاب تعلیم کی تیاری کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ معلوم کرنا تھی کہ ...... خود بالغوں کی ضرورتیں کیا ہیں۔ نمونے کے تعلیمی مرکزوں کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انھیں تجربہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جائے یعنی ان تعلیمی مرکزوں کے ذریعے عام لوگوں سے گھل مل کر ان کی ضرورتیں معلوم کی جائیں۔ یہ معلوم کیا جائے کہ کیا کیا عنوان ان کے لئے موزوں، مفید اور دل چسپ ہو سکتے ہیں اور ان میں ذہنی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

اور ان تعلیمی مرکزوں کے تجربات سے حقیقتاً ادارے کو بہت بڑی مدد ملی۔ اپنی کتابوں کی تیاری کی اسکیم اس نے انہیں تجربوں کی روشنی میں بنائی۔ اس اسکیم کے مطابق بالغوں کے لئے لگ بھگ پانچ سو کتابیں تیار کرنا تھیں۔ اس سلسلے میں خود ادارے نے پہل کی۔ ادارے کے بہت سے کارکنوں نے بہت سی کتابیں خود لکھیں اور آہستہ آہستہ ۱۹۴۷ء تک ۱۰۹ کتابیں تیار ہو گئیں۔

یہ کتابیں اور کتابچے اور رسالے بالغ مبتدیوں کی دشواریوں اور ان کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر لکھے گئے تھے۔ اس لئے مضمون، لکھائی، چھپائی، زبان، طرز بیان، عام خوش نمائی یا گیٹ اپ، غرض ہر چیز میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ جس طبقے کے لئے کتابیں تیار کی جا رہی ہیں وہ آسانی سے اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

یہ کتابیں ادب (نثر، نظم، مشہور کتابوں کا تعارف، مشہور مصنفوں اور شاعروں کا تعارف وغیرہ) تذکرہ، سوانح حیات، تاریخ، جغرافیہ، معدنیات، سیاست، معیشت پیشہ، حساب، عام معلومات (جنرل نالج) اور حفظان صحت وغیرہ پر مشتمل تھیں، ان بالغوں کے لئے جو معمولی نوشت دخواند یا معمولی لکھنا، لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہوں، یہ کتابیں خاص طور پر کارآمد ہیں اور اسی لئے مبتدی بالغ انھیں شوق سے پڑھتے ہیں۔

ان پڑھ بالغوں کے لئے قاعدے کی تیاری کو مشکل، بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا

رہا ہے، ادارے نے یہ مشکل کام بھی اپنے ہاتھ میں لیا، حرفوں کا ایک چھوٹا سا چارٹ شائع کیا۔ جس کی مدد سے پڑھنے والا حرفوں کو پہچان سکے، پھر پورے کلاس کو حروف سکھانے کے لئے حرفوں اور ان کے جوڑوں کو چار بڑے تختوں پر چھاپا گیا اور پھر حرفوں کو جوڑ کر پڑھنے کا قاعدہ تیار کیا گیا اور ان سب چیزوں کو پڑھانے کے لئے ہدایتیں الگ سے ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کی گئیں۔

قاعدہ ختم کرنے کے بعد، آسان عبارت پڑھنے کی مشق کے لئے، "دس سبق" کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی۔ پھر حکایتیں، خط، کتابت، چھوٹی گنتی، بڑی گنتی کے ناموں سے چند ابتدائی معیار کی کتابیں تیار کی گئیں اور ان میں تدریجی طور پر آہستہ آہستہ سہل سے مشکل زبان کی طرف قدم بڑھایا گیا۔

"سلسلہ تعلیمات و ہدایات" کے عنوان سے ادارے نے بہت سے دو ورقی کتابچے شائع کئے۔ مثلاً کلمہ (معنی اور مطلب) "قرآن پڑھنے" "حج" "زکوٰۃ" "نماز عیدین" وغیرہ۔ تعلیمی اور مذہبی کتابات ان کے علاوہ ہیں جنھوں نے عوام میں خاص مقبولیت حاصل کی۔

ان کاموں میں شفیق صاحب کا ہاتھ بٹانے والوں میں عبدالملک صاحب، مختار احمد صاحب مرحوم اور وفار الرحمٰن صاحب نمایاں نظر آتے ہیں، ملک صاحب کے افکار مختار صاحب کا ان میں رنگ بھرنا، وفار صاحب کی محنت، ان باتوں نے تعلیم و ترقی کے کاموں میں جان ڈال دی تھی۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب شفیق الرحمٰن صاحب نے ۱۹۴۳ء میں اس ادارے کا کام شروع کیا تو آپ نے حیدر آباد کے چند احباب سے درخواست کی تھی کہ وہ اس شعبہ کے مالی اخراجات چلانے کی ذمہ داری لیں، چنانچہ محمود حسین صاحب جامعی (مددگار تعمیرات) سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعی (موجودہ پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے یہ ذمہ داری خوشی سے قبول کی اپنی

بیش قدر امداد کے علاوہ اوروں سے بھی چندہ دلوایا، اکبر علی صاحب بیرسٹر سابق طالب علم جامعہ بھی دامے، درمے، سخنے، جامعہ کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

اب سے ڈیڑھ سال بعد اس کام میں ایک اور چیز کا اضافہ ہوا۔ وہ ہے کمیونٹی سنٹر یعنی تعلیمی مرکز ہال، اس کا حال اگلے سال کی کہانی میں ملے گا۔

تعلیم وترقی کا کام خاص طور پر قرول باغ میں ہو رہا تھا۔ اس کا دفتر بھی وہیں تھا، تعلیمی مرکز نمبرا اور تعلیم وترقی کے اداروں میں تال میل کی ضرورت تھی .....

.... سہولت اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا انتظام بھی تعلیم وترقی کے ناظم شفیق الرحمن کے سپرد رہے۔ آپ نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔

اس مدرسہ میں ایک ایسا جلسہ ہوا جس سے پرانی دلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اخبارات میں جلسہ کا اعلان ہوا تھا، ہال دہلی والوں سے بھر گیا تھا۔

جناب خواجہ محمد شفیع صاحب نے جو دہلی کے بہت پرانے خاندان کے نوجوان ہیں، اور اُردو کے مشہور ادیب ہیں اور چاشنی دار زبان لکھنے پر فوقیت رکھتے ہیں۔ "دہلی پر ایک نظر" کے سلسلے میں دہلی کی رسومات پر ایک لاجواب مقالہ پڑھا۔ مقالہ کے دوران میں بعض خیالات کی وضاحت جو وہ زبانی فرماتے جاتے تھے، حاضرین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے اپنی قسم کی بالکل انوکھی ہوتی تھی، آپ نے دہلی میں مسلمانوں کے ہاں شادی کی جو رسومات رائج تھیں بلکہ اب بھی ہیں ان کی معقولیت پر نہایت مدلل طور سے بحث کی اور اپنے مضمون کو بہت دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا۔

مولانا احمد سعید صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی تھی۔ مولانا نے اپنی تقریر میں بھی دہلی، شاہان مغلیہ اور جامع مسجد دہلی کے متعلق بعض دلچسپ روایات بیان فرمائیں،..... ڈیڑھ گھنٹہ کی پر لطف صحبت کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔

اس سال مدرسہ ثانوی نے "قرآن پروجکٹ" چلایا تھا نتیجے کے طور پر لیم
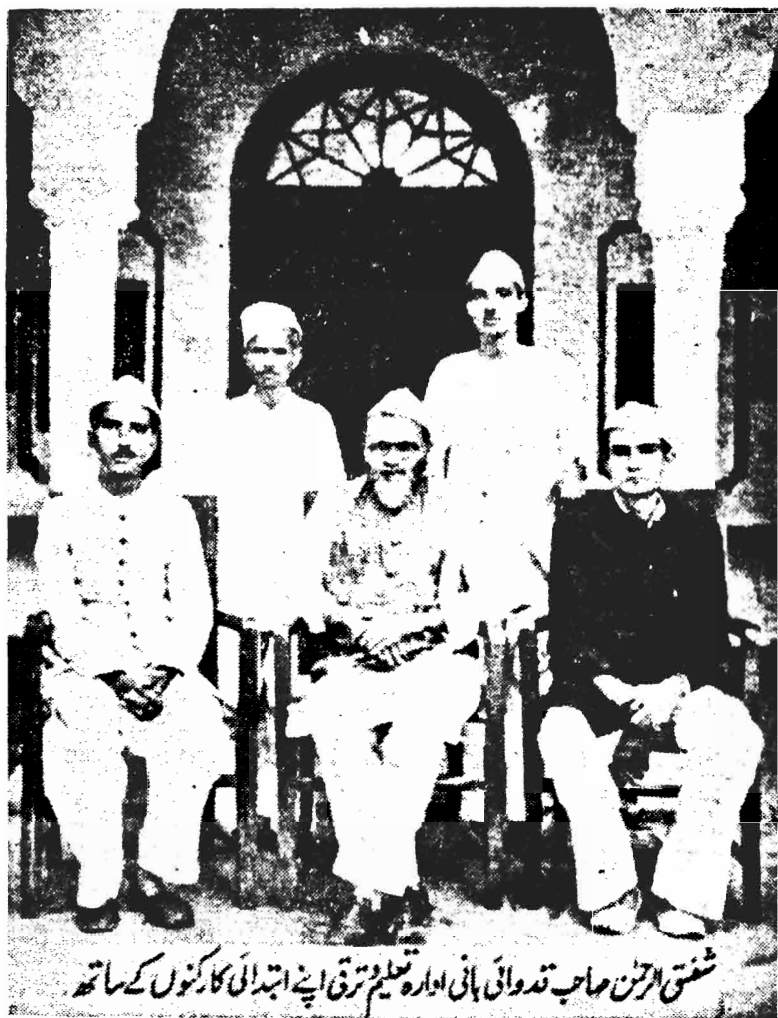
شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بانی ادارہ تعلیم و ترقی اپنے ابتدائی کارکنوں کے ساتھ

قرآن کا جلسہ ۲۹ ستمبر ۱۹۴۲ئ م ۲۸ رمضان المبارک کو، طلبائے مدرسہ کی بزم ادب کے زیر اہتمام منعقد ہوا، یہ جلسہ دو نشستوں میں ہوا۔ ایک دن میں، دوسرا شب میں۔ دونوں کی صدارت حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی نے فرمائی تھی۔ مندرجہ ذیل کارروائی انجام پائی۔

۱۔ تلاوت کلام مجید منظور عبد الرحمٰن

۲۔ مضمون لیلۃ القدر، ہارون رشید ثانوی اوّل۔

۳۔ تلاوت کے آداب۔ محمد اسمٰعیل

۴۔ نظم۔ عبد الحلیم ثانوی سوم

۵۔ قرآن کریم کی صفات۔ منظور عبد الرحمٰن

۶۔ قرآن شریف کے مشہور ترجمے۔ ظفر الہدیٰ

۷۔ قرآن مجید کے نزدیک قومیں کیسے بنتی اور بگڑتی ہیں۔

۸۔ نظم۔ ہارون رشید ثانوی اوّل۔

۹۔ سورہ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ۔ محمد شیث

۱۰۔ قرآن کی جمع و ترتیب۔ اقبال احمد ...... ثانوی چہارم

۱۱۔ قرآن کریم اور جہاد، ہارون انصاری۔ ۱۲۔ خواجہ عبید اللہ فاروقی قرآن کریم کی ایک سورۃ۔

اس کے بعد حاضرین کی درخواست پر مولانا عبید اللہ صاحب سندھی صدر جلسہ نے طلبہ کو کچھ نصیحتیں کیں اور مجموعی طور پر اس تقریب کو بہت پسند فرمایا اور منتظمین جامعہ سے خواہش کی کہ ہر سال ایک یوم قرآن ضرور منایا جایا کرے۔ اس کے بعد آپ نے لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ۔ کا مطلب اور تفسیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے طریقہ پر بیان

فرمائی اس کے بعد پہلی نشست ختم ہوئی

دوسری نشست شب میں ۹ بجے شروع ہوئی۔ ہارون انصاری ثانوی چہارم نے تلاوت کی خواجہ عبدالحئ صاحب فاروقی نے تقریر فرمائی جس میں سورۂ یوسف کا مطلب نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان فرمایا۔

اس کے بعد جامعہ کے مہمان بلجیم کے پادری فادر کورتوا نے ایک مضمون پڑھا۔ جس میں آپ نے بتایا کہ قرآن کی کون سی بات نے آپ کے دل پر سب سے زیادہ اثر کیا ہے۔ آپ کا مضمون سب نے پسند کیا اور اس کی بہت زیادہ تعریف اس وجہ سے بھی کی گئی کہ اتنا اچھا مضمون آپ نے شروع سے آخیر تک اردو میں لکھا تھا۔ جسے آپ ابھی سیکھ رہے تھے، فادر کورتوا کے بعد مولانا عبیداللہ صاحب نے لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ کی تفسیر بیان کی۔ تقریر کے خاتمے پر آپ نے یوم القرآن کی کامیابی پر مبارک باددی۔

آپ کی تقریر کے بعد جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کی طرف سے تحفہ یوم قرآن تمام حاضرین میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تحفہ دو رسالے تھے۔ ایک تو سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے دوسرا نظامی قاعدہ۔ تمام اراکین بزم خواجہ صاحب موصوف کی اس نوازش سے مسرور ہوئے۔ جملہ حاضرین کے شکریہ کے بعد جلسہ ۱۱ بجے شب میں ختم ہوا۔ اس جلسہ کا ہال بھی تعلیمی مرکز کی طرح آویزوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا جن میں قابل ذکر دہلی کے سب سے بڑے کاتب جناب محمد یوسف صاحب اور ان کی بہن فاطمۃ الکبریٰ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ کتبے اتنے خوشخط اور اتنے پاکیزہ تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے ایک کتبہ نصیر الدین احمد صاحب انصاری کا لکھا ہوا تھا۔ ان کتبوں کے نیچے سرخ کپڑے پر ایک پٹی لگی ہوئی تھی جو خانہ کعبہ کے غلاف کی تھی، بڑے بڑے نادر کتبوں کی تعداد چودہ تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کتبے تھے جو طلبہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔

فادر کولفا کی تقریر درج ہے۔

جناب صدر، اساتذہ کرام اور عزیز بچو،

آج شام مجھے بہت خوشی ہے کہ اس مبارک جلسہ میں قرآن شریف کی تعظیم و تکریم میں مجھے کچھ کہنے کا موقع ملا ہے۔ مجھے اس بات کا تو افسوس ہے کہ اُردو زبان کی کم علمی کی وجہ سے اپنے مضمون کو مناسب طور پر ادا کرنے کے نا قابل ہوں لیکن مہربانی اور ہمدردی جو جامعہ ملیہ کے مکینوں کا فخر ہیں ہمت اور دل بڑھاتی ہیں۔

گزشتہ صدی سے قرآن شریف نے لاکھوں کروڑوں مومنین کے لئے ہدایت و فرقان کو بیان کیا ہے اور صراط مستقیم پر ان کی رہبری کی ہے۔ چونکہ یہ کتاب مفید اور اعلیٰ تعلیم سے بھری ہے اس لئے اس میں غیر مسلموں کے لئے بھی تفکر اور تصور کے لائق بہتیرے موضوع ہیں۔

آج میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ قرآن شریف کے کس پہلو نے مجھ پر بحیثیت راہب سب سے گہرا نقش کیا ہے اور وہ خدا کا "حاضر و ناظر ہونا" کا احساس ہے۔ میں اپنا مطلب بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

قرآن کی سب سے پہلی سورتوں کا عام موضوع اللہ کا حاضر اور ناظر ہونا ہے واقعہ یہ ہے کہ ایام جاہلیت میں مکّے کے رہنے والے خدا کی پروا اور فکر بہت کم کرتے تھے۔ ان کو اس فانی دنیا کے عیش و آرام کی طرف رغبت تھی وہ کس قدر اس دنیا کے زوال پذیر مال و دولت کو دیوتا سمجھتے تھے، تو حضرت محمدؐ قدیم پیغمبروں کی طرح اپنے ہم وطنوں کی غلطی کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ باوجود تاجروں کی بے توجہی کے۔ باوجود اپنے دشمنوں کی عداوت کے۔ باوجود اپنے رشتہ داروں کی اذیت کے حضرت محمد مصطفےٰ نے ازلی حق کا پیغام سنا دیا اور اپنے ہم وطنوں کی

بت پرستی کی مذمت کی رسول اللہؐ نے اپنی زندگی کو وقف کیا اسی مقصد کے تحت کہ انسان
خداوند کو رب العالمین، کائنات کا خالق، بنی آدم کا مالک پہچان لیں اور اس کے
وفادار اور ایمان دار بندے بن جائیں۔ اس لئے عربوں کے پیغمبر نے شہریوں اور بدویوں
کی توجہ عجیب اور نہایت عمدہ خلقت کی طرف کرنے والی سخت کوششیں کیں۔
آپ نے بیان کیا کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے سب کچھ نیست سے ہست بنایا ہے۔ سب
مخلوقات کی دیکھ بھال کرتا ہے اور ہر جگہ اپنی الٰہی قدرت سے حاضر اور ناظر ہوتا ہے۔
• (دیکھو) یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ وہ (بیج کے) دانے اور گٹھلی کو (جو زمین
میں ڈال دی جاتی ہے یا خود بخود گر جاتی ہے) شق کر دیتا ہے (اور ایک خشک
دانے سے زندہ اور پھلنے پھولنے والا درخت پیدا ہو جاتا ہے) وہ زندہ کو مردے
سے نکالتا ہے اور وہی مردے کو زندہ سے نکالنے والا ہے۔ وہی (پروردگار حکیم)
خدا ہے۔ پھر (افسوس تمہاری سمجھ پر) تم کدھر کو بہکے چلے جا رہے ہو۔ پردۂ شب
چاک کر کے صبح نمودار کرنے والا (اور رات کی تاریکی کو دن کی روشنی میں بدل
دینے والا) اس نے رات کو (تمہارے لئے) راحت و سکون کا سامان بنا دیا۔
اور سورج اور چاند (کے طلوع اور غروب کا ایسا انتظام کر دیا کہ) حساب کا
معیار بن گئے۔ . . . . اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے ستارے
بنا دئے کہ بیابانوں اور سمندروں کی تاریکیوں میں ان کی علامتوں سے راہ
پالو . . . . (پھر دیکھو) وہی ہے جس نے تمہیں اکیلی جان سے نشو ونما دی اور
(دیکھو) وہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے ہر طرح کی روئیدگی پیدا
کر دیتا ہے پھر روئیدگی سے ہری ہری ٹہنیاں نکل آتی ہیں اور ٹہنیوں سے دانے
نمودار ہو جاتے ہیں۔ ایک دانے سے دوسرا دانہ ملا ہوا . . . . بلاشبہ
جو لوگ یقین رکھتے ہیں ان کے لئے اس بات میں (ربوبیت الٰہی) کی بڑی نشانیاں

ہیں" سورت انعام، ترجمہ از ابوالکلام آزاد) بیسیوں دوسرے انتخاب دئے جا سکتے
ہیں جن میں قرآن شریف خدا کی ہمہ جائی اور قدرت مطلقہ کا اعلان کرتا ہے ؎

اے سب سے اوّل اور آخر   جہاں تہاں حاضر اور ناظر

کس واسطے قرآن مجید نے خدا کے حاضر اور ناظر ہونے پر اتنے زور سے اصرار اور
تاکید کی حضرت محمدؐ کا ایمان تھا کہ خدا کے حضور میں چلنا کاملیت اور خلوص کا طریقہ ہے
جیسے ایک نوکر اپنے مالک کے سامنے ہوشیاری سے اپنا کام کرتا ہے ویسے ہی بس
سچے بندہ کو یقین ہے کہ اللہ اس کے سب اعمال دیکھتا ہے وہ خدا کے حکم کو انجام
دینے میں محنت کرتا ہے اور اس کی عبادت ہر موقعہ پر سچے دل سے کرتا ہے، اپنے
پڑوسی کا خیر خواہ رہتا ہے اس کو پرائے مال پر حسد و رشک نہیں ہوتا، اور سچائی پر
عمل کرتا ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ موجودہ زمانے کے دنیا دار ایسی اعلیٰ تعلیم بھول گئے ہیں
ہماری دنیا میں بہت سے لوگوں کی حالت جاہلیت کے عرب کی حالت سے ملتی جلتی
ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کے جوش سے فریب میں آکر خدا کی عبادت کو چھوڑ دیا
اور دولت کے حصول میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ مادّہ پرست کی دنیا میں خدا
خداوند کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ دہریئے۔ اللہ کو اس کی کائنات سے جلا وطن کرنا
چاہتے ہیں۔ آپ کو بے شک معلوم ہوگا کہ کس طرح بعض ملکوں میں لڑکوں اور
لڑکیوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ خدا موجود نہیں اور یہ کہ وہ صرف خیالی ہستی ہے
جو کاہنوں نے غریب لوگوں پر ظلم کرنے کے لئے ایجاد کر رکھی ہے، وہ کہتے ہیں کہ
"مذہب لوگوں کی افیون ہے" یعنی ان کو بے ہوش کرتا ہے لیکن جس دل میں
خدا کا ترس نہیں اس میں شریعت کی کیا پروا ہوگی، مادہ پرستی حال کی تکلیفوں
اور آفتوں کا اصلی سبب ہے" وہ اللہ کو اور ایمان داروں کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ

وہ خود دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔" یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ ۲/۹) اس لئے خدا کی ہمہ جائی کی منادی کرنا پھر ضروری ہے حضرت محمدؐ کے پیروؤں اور اہل کتاب کا لازمی فرض ہے کہ وہ تن من دھن سے اللہ کے حقوق کا پھر اعلان کریں۔

"جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اللہ کی بڑائی کرتا ہے اور وہ قادر اور عقلمند ہے۔ آسمان اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے۔ وہ جان دیتا ہے اور مار ڈالتا ہے اور اس کی سب چیزوں پر حکومت ہے۔ وہ اول اور آخر باہر اور اندر اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔ وہ ہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں۔ پھر بیٹھا تخت پر۔ جانتا ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور اس پر چڑھتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔ اسی کا ہے راج آسمانوں کا اور زمین کا" (سورۃ الحدید ۵۵)

سب سے مؤثر اور کارگر تبلیغ قول سے نہیں بلکہ عمل سے کی جاتی ہے۔ اچھی اور خالص اور ایمان دار زندگی کا نمونہ سب سے طاقتور اور یقین دلانے والا وعظ ہے اور چونکہ خدا کے حضور میں کام کرنا تکمیل کا مختصر راستہ ہے اس لئے حضرت محمدؐ کے صلاح پر عمل کر کے اپنی تمام زندگی خدا کے حضور میں گزارنے کی کوشش کیجئے۔ فجر کی صلوٰت کے وقت خدا کی موجودگی کا احساس دل میں داخل ہوتا ہے۔ اس مقدس موجودگی میں عزت اور محنت سے تمام دن رہنا چاہیئے عربی اور اُردو زبانوں میں "بسم اللہ" کرنے سے مراد "شروع کرنا ہے" یہ عمدہ محاورہ مسلم بزرگوں اور پیروؤں کے عملی ایمان کی یادگار ہے۔ لیکن اگر ہم بزرگوں

اور پیروں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے "بسم اللہ" کرنا محاورہ سے زیادہ ہونا چاہیئے۔ ضروری ہے کہ یہ محاورہ دل کی نیت ظاہر کرے۔ لہذا مطالعہ کے شروع میں، کھانے کے شروع میں، کھیلنے کے شروع میں، آزمائش کے وقت سچے دل سے "بسم اللہ" کہیئے، یعنی خدا کے حضور کو یاد کر کے آپ کا ہر فعل و قول خدا کی خدمت میں ہو۔ اسی طرح آپ کا ہر فعل و قول اصلی نماز بن جائے گا اور آپ کی زندگی کا ہر کام، ہر خیال، ہر لفظ اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا اعلان کرے گا۔

"وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ط" اپنے رب کا نام یاد کر اور سب کو چھوڑ کر اسی کا ہو جا۔"

اس سال عید کی نماز میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی، عبد المجید خواجہ صاحب امیر جامعہ اور ان کے عزیز نواب حلیم اللہ جنگ بہادر نے شرکت کی تھی۔ نماز خواجہ عبدالحیٔ صاحب فاروقی ناظم دینیات نے پڑھائی آپ کے خطبہ اور دعا کے بعد عبید اللہ صاحب سندھی نے بھی تقریر فرمائی تھی جس کا عنوان قرآن اور مسلمان تھا۔ عید کی خوشی کے متعلق بھی کچھ روشنی ڈالی تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ قرآن کو سمجھنے کی ہمارے علمائے آج تک کوشش ہی نہیں کی۔ وہ نہ سمجھتے ہیں نہ سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ صرف کہیں کہیں سے مختلف آیات کا ترجمہ کر لیتے ہیں۔ مختلف مقامات کی آیات کو باہم ملانا نہیں جانتے، اور نہ ہمارے مسلمان بیرسٹر قرآن سے قوانین اخذ کر سکتے ہیں، قرآن کی ہر آیت سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اللہ کی ملک ہے، وہ کسی انسان کا محکوم نہیں ہے۔ آپ سب لوگ گواہ ہیں کہ میں آپ کے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ میں سوائے اللہ کے اور کسی حکومت کو نہیں مانتا۔ خدا کا شکر ہے کہ تیس برس کے بعد میں نے قرآن کو سمجھا ہے اور اب میں ذرا سی دیر میں پوری سورۃ بقر کی تفسیر کر سکتا ہوں، اس کے بعد آیۃ الکرسی کا ترجمہ اور اللہ تعالیٰ کے وجود کی تشریح بیان فرما کر تقریر ختم فرمائی۔

نماز کے بعد اساتذہ نے باہم مل کر ایک چھوٹی سی تقریب منائی اور رات کو تمام طلبہ اور اسٹاف نے عید ڈنر میں شرکت فرمائی۔ عید کا ڈنر ہمیشہ امیر جامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس سال بھی بیگم خواجہ نے مبلغ ۲۰۰ روپئے اس تقریب کے لئے مرحمت فرمائے تھے۔ لیکن کارکنان جامعہ نے طے کیا کہ عید ڈنر بہت شاندار طریقہ سے نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ہمارے لاکھوں بھائی بنگال میں بھوکے مر رہے ہیں لہذا حسب معمول سب مل کر کھانا کھائیں اور ڈنر کی یہ رقم مبلغ دو سو روپئے کی، ختم قرآن شریف والی پچاس روپئے کی رقم میں ملاکر جملہ ڈھائی سو روپئے بنگال کے بھوکوں کی امداد کے لئے بھیج دئے جائیں۔ اس موقعہ پر جناب امیر جامعہ نے تقریر فرمائی جس میں اپنے سرکار پرست ماحول میں پرورش پانے کے باوجود قومی خیالات میں زندگی بسر کرنے کی وجوہات کا دلچسپ بیان تھا۔

مدرسہ ثانوی کے انتظام میں یوم تاسیس بھی اہتمام سے منایا گیا تھا۔ جلسہ کے علاوہ نمائش لگائی گئی تھی۔ اس نمائش کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں پرانے اساتذہ اور طلباء کی تصاویر، جامعہ کی تقریبات اور مہمانوں کی آمد کی تصاویر رکھی گئی تھیں۔ یہ تصویریں اختر حسن صاحب فاروقی (آرٹسٹ مدرسہ ثانوی) نے بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔

دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے گذشتہ دو سالوں میں "بچوں کا میلا" نہ ہوسکا تھا۔ اس سال نسبتاً سہولت تھی اس لئے دوسرا میلا منایا گیا، یہ بھی ایک دن کا تھا، نمائش، جلسوں کے علاوہ صدیقی صاحب کی نگرانی میں "جامعہ سکاؤٹس" نے طرح طرح کے کرتب دکھلائے۔ مسمیریزم اور بازیگروں کے تماشوں کے علاوہ رات میں دو ڈرامے ہوئے ایک کا نام تھا "ایران کے دربار میں عرب کے سفیر" دوسرا ڈرامہ تھا "نکاح بالجبر"

"فلسفی" کا پارٹ عبدالعلیم صاحب احراری کی طرح عبیدالحق صاحب نے انجام دیا۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب (نائب شیخ الجامعہ) نے ملازم کا پارٹ ادا کیا تھا۔

دونوں ڈرامے بہت کامیاب رہے۔ یہ سب کام مجیب صاحب کی نگرانی میں بڑے سلیقہ اور خوبی سے ہوا۔ حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

اس میلے میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ برادری کو مخاطب کیا۔ ویسے تو آپ کی تقاریر موقع محل کے لحاظ سے خوب ہوتی ہیں لیکن اس سال کی تقریر جس نے بھی دسنی تھی اس سے یہی کہا گیا کہ آپ نے خاص چیز کھوئی۔ رسالہ ہمدرد جامعہ سے ہم آپ کی یہ تقریر یہاں نقل کرتے ہیں۔

"آپ سب کو عید مبارک ہو، عید کا یہ میلا مبارک ہو، اس کے چھوٹے چھوٹے اور بظاہر بے حقیقت سے کاموں میں، ان کی دکانوں، ان کے کھیل تماشوں، اس کے دوسرے انتظاموں میں جو محبت آپ سب نے خزانہ کے طور پر چھپا رکھی ہے وہ مبارک ہو، اس کے ہر کام کے پیچھے جو محبت ہے، کہیں بے سروسامانی کی وجہ سے بہت زیادہ محنت، کہیں ناتجربہ کاری کی وجہ سے دوہری مشقت، وہ سب محنت آپ کو مبارک ہو۔

اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں جو دشواریاں پیش آئی ہیں، جو ابتدائی ناکامیاں ہوئی ہوں وہ بھی آج کی تیاری کی خوشی میں مبارک ہوں، ہر ناکامی آپ کے لئے آیندہ کامیابی کا پیش خیمہ اور ہر شکست آنے والی فتح کی بشارت دینے والی ہو، ان چھوٹے کاموں میں ناکامی اور کامیابی پر ہم سب کو بڑے کاموں میں ناکامی پر گھبرانے اور کامیابی پر پھول جانے سے بچائے اور ہمیں اس سے بڑے کام سنبھالنے کا اہل بنادے، (آمین)

دوستو اور عزیزو، ہماری چھوٹی سی تعلیم گاہ کے کام ابھی چھوٹے چھوٹے ہی ہیں۔ تم میں خود بہت سے ابھی بہت چھوٹے ہیں لیکن جیسے تم روز بروز بڑے ہوتے جاتے ہو ہم سب کی کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ تعلیم گاہ بھی بڑھے جیسے تم بڑ

روز بروز نئی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں خدا کرے اس تعلیم گاہ کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں اور یہ ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کی اہل بھی ثابت ہو۔

یہ بے شک ابھی ایک چھوٹی سی اور کمزور سی تعلیم گاہ ہے لیکن اس کے حوصلے کو پست نہ ہونے دو، یہ ہماری قومی زندگی کی تاریکی میں امید کی ایک کرن ہے۔ کمزور سی کانپتی ہوئی کرن، اپنی محنت اور محبت، اپنے استقلال اور ہمت سے اسے آفتاب بنا دو، جو زندگی کی سب شعبوں میں ہمیں روشنی بھی دے سکے اور گرمی بھی۔ اسے اس ملک میں مسلمانوں کی حیثیت کا ترجمان بنا دو یعنی اپنی باعزت زندگی اور سربلندی کا ترجمان بنا دو،

اس دھوکے میں نہ رہو کہ یہ سربلندی باتیں بنانے سے مل جائے گی یا سیاسی شطرنج کی کسی چال سے تمہاری ہو جائے گی۔ یہ نہ خیالی پلاؤ پکانے سے ملے گی نہ گالیاں دینے سے! اور یہ اگر ایسی ہی چیز ہے کہ یوں حاصل ہوتی ہے یا اگر اس کے حاصل ہونے کی شرط یہ ہے کہ اور سب ذلیل وخوار رہیں ہمارے دست نگر ہوں اور ہم سب پر جبر وظلم کر سکیں تو خدا ہمیں یہ سربلندی عطا نہ فرمائے۔

ہمیں تو اپنی جماعت کے لئے وہ سربلندی مانگنی اور حاصل کرنی چاہیئے جو اوروں سے بہتر خیال اور اوروں سے بہتر کاموں سے حاصل ہوتی ہے جو سچے یقین سے ملتی ہے جو پیہم سعی وعمل سے ملتی ہے۔ جو محبت اور خدمت سے ملتی ہے۔ ہم اس ملک میں اپنے لئے سربلندی چاہتے ہیں۔ سرداری چاہتے ہیں، لیکن یہی خدمت کی سربلندی، ظلم وجبر کی سربلندی نہیں، ہم وہ سرداری چاہتے ہیں جو اس ملک کے سب باشندوں کے لئے رحمت بن کر ہمیں ملے جو اس کے توہمات باطل، اس کے افکار فاسد، اس کی خود غرضیاں، اس کے ظلم، اس کے مفلسوں کی بپتا مٹانے میں سب سے آگے ہونے پر ہماری ہو۔

تمہارا یہ چھوٹا سا میدہ تمہیں اس راہ پر چلنے اور اس منزل تک پہنچانے کے بہت سے سبق سکھائے گا وہ تمہیں مبارک ہوں، جاؤ اسے دیکھو اور جس سلیقے سے تم نے اس کا انتظام کیا ہے اسی سلیقہ سے آج اس کے سب کاموں کو چلاؤ۔"

اس دفعہ محمد علی ٹرافی کے مقابلوں میں ایک خاص بات نظر آتی تھی وہ یہ کہ مدرسوں کی "کیمپ لائف" کو مقابلوں میں شریک کیا گیا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ مدرسہ میں حصہ لینے والے طلباء مقررہ دنوں (اس سال دو دن رکھے تھے) میں جامعہ نگر کے میدان میں کیمپ لگائیں اس طرح تحریری، تقریری، مقابلوں کے علاوہ "کیمپنگ" "کیمپ فائر" اور کھیل کود کے مقابلے بھی ہونے لگے۔ اس تقریب پر کیمپ کی یہ بستی اپنی سجاوٹ کے ساتھ بڑی بھلی معلوم دیتی تھی۔

جب کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینے والے کیمپ کے طلباء جھنڈے لئے دو دو کی قطار میں جا رہے تھے، ثانوی کا بینڈ آگے آگے تھا۔ جامعہ برادری ہمراہ تھی۔ یہ منظر دیکھنے کا تھا۔ اس میں علی گڑھ یونیورسٹی اور فیض عام کالج کے مدرسہ ابتدائی کے علاوہ دہلی کے ۲۲ مدرسوں نے حصہ لیا تھا۔

اس تقریب کی نظامت اگرچہ میرے ذمہ تھی لیکن میرے شاگرد سید حسن صاحب نے جو جامعہ سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد اس مدرسے کے اسٹاف میں نئے نئے داخل ہوئے تھے میری بہت مدد کی۔ جب میں تھکا ماندہ بیٹھ جاتا تو سید کہتے ماسٹر صاحب جب ہم لوگ موجود ہیں تو پھر آپ اتنی دوڑ دھوپ کیوں کرتے ہیں۔ کھیلوں کا نظم قائم رکھنے میں.......... اور شبیر احمد صاحب ندوی نے (یہ بھی نئے نئے آئے تھے) بڑا کام کیا۔ شبیر صاحب کی محنت، جفاکشی کا اب تک وہی رنگ ہے۔ صغیر احمد صاحب مرحوم اور محمد حسین صاحب، مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے۔ دونوں حضرات کی فیاضی ویسے بھی مشہور ہے۔ صدیقی صاحب کیمپ لائف کے

روحِ رواں تھے۔ عتیق احمد صاحب نگران مدرسہ محنت کے کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ ہم نے چند ساتھیوں کا یہاں ذکر کیا ہے۔ مدرسہ ابتدائی کا ہر ایک استاد کسی نہ کسی ذمہ داری کے کاموں پہ مامور تھا۔

دہلی میونسپلٹی کے محکمۂ تعلیمات کے ذمہ دار لوگ خصوصاً سید محمد جعفری صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیمات ہماری ان کوششوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جامعہ کے مدارس جس نہج پر چل رہے ہیں، میونسپلٹی کے مدارس بھی رفتہ رفتہ یہ رنگ اختیار کرتے جائیں۔ چنانچہ میونسپل مدارس کے منتخب اساتذہ کا ایک کیمپ تین دن کے لئے یہاں لگایا گیا تھا کہ وہ ان تقریبات میں شرکت کرکے تجربہ حاصل کریں، یوں جامعہ کے تعلیمی کام دوسروں کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

آل انڈیا ہندوستان اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے دہلی میں ایک کانفرنس فروری کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی جس میں تمام صوبوں اور ریاستوں سے ڈیلی گیٹس نے شرکت کی تھی۔ اس سلسلہ میں ۱۱ فروری کو دہلی صوبہ کے اسکاؤٹس کی ریلی ہوئی جس میں جامعہ ملیہ کا مظاہرہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ ڈاکٹر ہردے ناتھ کنزرو نیشنل کمشنر نے جامعہ ملیہ کے اسکاؤٹس ٹروپ (Scouts troop) کو روورز (Rovers) اور کبس (cubs) دونوں کے شیلڈ جیتنے پر مبارک باد دی، اور دوسری اسکاؤٹس جماعتوں کی توجہ اس طرف دلائی کہ انھیں جامعہ ملیہ کا نمونہ اپنے سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیئے۔ جامعہ اسکاؤٹ کا یہ کام جناب اخلاص احمد صاحب صدیقی کی رہنمائی میں کامیابی سے چل رہا تھا۔

کانفرنس میں شرکت کے لئے ہندوستان اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کے جو نمایندے تمام ہندوستان سے دہلی میں جمع ہوئے تھے وہ ۱۳ فروری کو جامعہ دیکھنے تشریف لائے ہمارے اسکاؤٹس نے اور بینڈ سے شاندار خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد ہمارے

اسکاؤٹس بچوں نے تمام مہمانوں کو جن میں گرلز اسکاؤٹس بھی شامل تھیں جامعہ اور مدرسہ کی سیر کرائی اور بعض قابلِ ذکر چیزیں خاص طور سے دکھائیں۔ جامعہ کے اسکاؤٹس کی طرف سے ان مہمانوں کو عصرانہ کی دعوت دی گئی تھی جس میں جامعہ کے اساتذہ بھی مدعو تھے۔ چائے نوشی کے بعد ایک اسکاؤٹ بچہ نے مہمانوں کے خیر مقدم میں ایڈریس پیش کیا جس کے جواب میں جناب پنڈت سری رام صاحب بیجائی نیشنل آرگنائزر نگ کمشنر نے نہایت محبت بھرے الفاظ میں جامعہ کے اسکاؤٹس کا جامعہ کے کاموں اور ان کی نوعیت کا اور جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا اس کا ذکر فرمایا اور بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔ انھوں نے فرمایا کہ جب میں روس گیا تھا تو وہاں ایک مدرسہ دیکھنے گیا۔ وہاں کے ہیڈ ماسٹر نے ایک طالب علم سے کہا کہ انھیں اپنا مدرسہ دکھاؤ، اس نے مجھے ایسی سیر کرائی اور اس قدر مسرت اور خوشی سے مدرسہ کی کل چیزیں دکھائیں کہ مجھ پر بہت اثر ہوا۔ اور مجھے اب تک وہ سماں خوب یاد ہے وہ پہلا موقع تھا کہ کسی مدرسہ کی سب چیزیں اس کے ہیڈ ماسٹر یا کسی مدرس کی بجائے وہاں کے طالب علم نے دکھائی تھیں جس کی وجہ بھی مجھے بتائی گئی کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ اس کے بعد آج دوسرا موقع مجھے جامعہ میں نصیب ہوا کہ جامعہ کے بچے نے مجھے اپنا مدرسہ دکھایا اور نہایت شوق سے سیر کرائی۔

دہلی کلاتھ ملز کے مالک لالہ سری رام نے آٹھ اور میسرز ملک اینڈ قریشی دہلی نے چھ خیمے بطور عطیہ جامعہ کو دئے تھے جس سے "کیمپ لائف" کی تقریبات میں سہولت ہوگئی۔

انجمن اساتذہ کے اجتماع میں بیت الحکمت کے رکن مولانا محمد فاروق صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کی تعلیمات پر مقالہ پڑھا۔ اسی انجمن میں ایک اور موقع پر ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے "ہماری تعلیم کا مقصد" کے عنوان سے ایک مقالہ سنایا۔

آپ کا مطالعہ وسیع ہے تعلیمی مسائل پر گہری نظر ہے آپ نے امریکہ سے تعلیم کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے۔

انجمن اتحاد کے جلسے میں لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر سر رضا علی نے "جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی حالت" پر تقریر فرمائی۔

اسی سال جامعہ کی سندوں کو تسلیم کئے جانے کی کارروائی کے سلسلہ میں حکومت ہند کے ایک تعلیمی کمیشن نے جو (۱) جے۔ ایم۔ کولٹم لے (۲) پروفیسر مسعود حسین صاحب (۳) ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب (۴) ڈاکٹر کے بی۔ مہتہ۔ (۵) سید اشفاق حسین صاحب پہ مشتمل تھا، جامعہ کا تفصیلی معائنہ کر کے اپنی رپورٹ حکومت کے پاس بھجوادی۔

رنج کی خبر بھی ہے۔ اطلاع ملی کہ جامعہ کے سابق طالب علم، مدرسہ ابتدائی کے سابق نگراں چودھری اکبر علی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اکبر صاحب کو کون نہیں جانتا۔ علی گڈھ کے زمانے میں طالب علموں کے زندہ دل یار۔ مدرسہ ابتدائی میں بچوں کے ساتھ بچے۔ ریاست رامپور میں محکمہ تعلیمات کے باوقار تعلیمی افسر، کام کرنے والوں کے قدر دان۔ جامعہ کا ابتدائی مدرسہ جب جامعہ نگر میں منتقل ہوا تو آپ نے اس جنگل میں، سیر و تفریح، تیراکی، کھیلوں کے مقابلے کرا کر یہاں کے رہنے والوں کے لئے پر رونق آبادیوں سے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ وہ آس پاس کے دیہات کے چودھری بھی تھے۔

سندھ کے ایک سابق طالب علم حکیم محمد قاسم صاحب سندھی کی وفات بھی ہمارے لئے رنج دہ ہے۔ جامعہ میں قلمی رسالہ "گلشن" نکالا کرتے تھے۔ مدرسہ کی انجمن میں غیر معمولی زندگی اور جوش پیدا کرنا ان کا کام تھا، مرحوم نے اپنی چھوٹی سی آمدنی میں جامعہ کا ایک مستقل حصّہ مخصوص کر دیا تھا۔ وصیت کی کہ فلاں رقم جامعہ کے لئے وقف کی ہے اس کو ادا کی جائے۔

اس سال کے مہمانوں میں اندور کے ڈائرکٹر تعلیمات اتا کولم، کمال یار جنگ کمیٹی

کے ارکان، ڈاکٹر ضیاء الدین، سجاد مرزا، صوبہ سرحد کے وزیر تعلیم خان نشیمن جان خان صاحب، ڈائرکٹر تعلیمات جناب شاہ عالم خاں صاحب قابل ذکر ہیں۔

سجاد مرزا صاحب جب جامعہ تشریف لائے تو آپ نے اپنے اس رسم خط کا مظاہرہ کیا جس میں بالعموم صرف دو جوڑ ہوتے ہیں۔ ایک تو حرف کا سر اور دوسرا پورا حرف مثلاً جلینا گاؤں۔ لکھنا ہو تو یوں لکھیں گے "جُلیـنـا گانـو" اس سے پہلی جماعت کے بچوں کو پڑھانے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ ہندی داں جو اُردو سیکھنا چاہتے ہیں بہت جلدی اُردو سیکھ لیتے ہیں۔

جامعہ نگر میں اس سال بھی ملیریا کا زور رہا اس لئے طے پایا کہ اس صورت حال پر قابو پانے تک تعلیمی اداروں میں موسم گرما کی تعطیل اگست ستمبر میں ہوا کرے چونکہ دوسرے ادارے اور اُستادوں کے مدرسہ کا سیشن نہ بدلا اس لئے ہم نے کہانی کا سال سابق کی طرح اگست سے جولائی تک رہنے دیا ہے۔

اس سال کے خاص عطیے یہ ہیں :۔

۱۔ دہلی کلاتھ مل کے اسلام احمد خاں صاحب، سو روپئے ماہوار۔ کے علاوہ پانچ ہزار روپئے جامعہ کیمیکل انڈسٹریز کے لئے۔

۲۔ محمد احمد صاحب شیلہ۔ آٹا پیسنے کی مشین کے لئے ایک ہزار ایک سو روپے

۳۔ صوبہ سرحد کے خان محمد اللہ صاحب نے اُردو کا بہترین قیمتی ٹائپ رائٹر مرحمت فرمایا۔

۴۔ شیخ خضر محمد صاحب کراچی ۱۰۰ روپے ماہوار جامعہ کیمیکل انڈسٹریز کے لئے۔

ہم نے عطیوں کے سلسلے میں "بے طلب عطیہ" "گمنام محسن" کا ذکر کیا ہے۔ اب ایک ایسی امداد کا ذکر کرتے ہیں جو ہمیں ہر طرف نظر آتی ہے وہ ہے خواجہ عبدالحمید صاحب اور کاسا والے کی امداد۔

(۱) جب تعلیمی مرکز بن رہا تھا آپ نے ایک کمرہ کی لاگت سے زیادہ کا خرچ

عنایت فرمایا۔

(۲) جامعہ کا سنگ بنیاد رکھتے وقت ایک گراں قدر عطیہ کا اعلان فرمایا۔

(۳) جامعہ نگر میں ٹیوب ویل لگانے کی ذمہ داری لی۔

(۴) تنخواہوں یا بلوں کی ادائیگی کے لئے روپئے کی ضرورت ہوئی بلا تامل مدد کی۔

خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جامعہ کے ہمدردوں کی ماہانہ امداد، ان کے عطیوں اور والیان ریاست کی امداد کی وجہ سے جامعہ کی زندگی میں پہلی بار ایسا میزانیہ تیار ہوا جس میں آمدنی اور خرچ برابر ہو سکے ہیں۔ ایک فارمولے کے مطابق جامعہ کے کارکنوں کی تنخواہ کا ایک حصہ کھاتے میں جمع ہو جاتا تھا۔ باقی کی ادائیگی ہوتی تھی۔ گذشتہ ایک سال سے کارکنوں کی جمع شدہ رقم ادا ہونے لگی تھی، اگر کچھ لوگ باقی تھے تو اس میزانئے میں ان کے لئے گنجائش نکل آئی تھی۔ ہم ذیل میں اس میزانئے کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، یہ میزانیہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ منعقدہ یکم مارچ ۱۹۴۴ء میں پیش ہو کر منظور ہوا تھا۔ اس جلسہ میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے سال بھر کے کاموں کی رپورٹ سناتے ہوئے اس میزانیہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی ہم آخر میں درج کرتے ہیں جس سے جامعہ کی مالی حالت کا ایک نقشہ سامنے آتا ہے، واضح رہے کہ اس میزانئے میں مطبخ کو چھوڑ کر طلبا کی باقی فیسیں شامل ہیں اور ان کے مقابل میں "اداروں کے لئے امداد از جامعہ" میں کرائے کے مکانات وغیرہ کا خرچ بھی شامل ہے۔ گویا کھانے کے اخراجات (مطبخ کا میزانیہ) کے علاوہ ہر طرح کی آمدنی اور خرچ اس میں شامل ہے۔

خلاصہ میزانیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی بابت سال اگست ۴۳ء تا جولائی ۴۴ء

آمدنی		خرچ	
۱۔ ریاستوں کی مستقل امداد	۴۷,۴۰۰	۱۔ اداروں کا خرچ ان کی اپنی آمدنی کی رقم سے	
۲۔ ریاستوں کی مستقل امداد یک مشت	۱۵,۰۰۰		۳۲,۸۸۳
۳۔ متفرق گرانٹ	۱۰,۵۸۲	۲۔ اداروں کا خرچ (از امداد جامعہ)	۸۸,۳۴۸
۴۔ اوقاف	۱,۲۰۰	۳۔ مرکزی مصارف	۱۶,۴۲۳
۵۔ چندے (ہمدردان)	۵,۲۰۰	۴۔ سرمایہ کاروبار میں لگانے کے لئے	۷,۰۰۰
۶۔ مکتبہ و پریس	۱,۸۰۰	۵۔ بچت برائے ادائیگی قرضہ جات سابق۔	
۷۔ کرایہ عمارات	۱۳,۴۰۰		۳,۹۲۲
۸۔ فیس طلبہ علاوہ طعام	۲۵,۶۳۳		
۹۔ امتحانات	۵۰۰		
۱۰۔ متفرق	۷,۱۴۰		
میزان کل	۱,۴۸,۵۶۶	میزان کل	۱,۴۸,۵۶۶

جناب شیخ الجامعہ صاحب کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔

جامعہ کے یہ سب کام جیسے تیسے چل تو رہے تھے لیکن قرض کے روز افزوں بار اور ہر ضروری خرچ کے لئے روپے کی کمی، تنخواہوں کا وقت پر تقسیم نہ ہو سکنا کسی بل کا وقت پر ادا نہ ہونا، پھر ماہ بماہ سال بہ سال ان دشواریوں کا جاری رہنا، ان سب نے کارکنان جامعہ کو کچھ تھکا سا دیا تھا۔ سب اس کا نہایت ہمت اور قابل تعریف ضبط سے مقابلہ کر رہے تھے اور ایسا نہ ہوتا تو ان حالات میں کام چلتا ہی کیسا رہتا۔ ادھر گرانی نے ہر کارکن اور ہر ادارہ کی مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا تھا قرض کا دروازہ بند تھا اور نقد ناپید۔ بظاہر کوئی صورت

نظر نہ آتی تھی، لیکن خدا کا بڑا شکر ہے کہ سال ختم ہونے سے پہلے ہماری مشکلات کے رفع ہونے کی بہت کچھ سبیل اس کے کرم سے ہو گئی۔

سب سے پہلے تو ہمدردانِ جامعہ کے ذریعے باوجود ملیریا اور سفر کی دشواری اور متوسط طبقہ کی پریشانی کے اس سال روپئے کی فراہمی میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ شعبہ نے اس سال کے دوران میں سینتالیس ہزار آٹھ روپئے چار آنے جمع کئے۔ اس میں سے پینتیس ہزار پانچ سو جامعہ کو ادا کئے۔ سوا سترہ سو بنک میں (محفوظ) جمع کئے اور بارہ سو روپے میں منشی مختار احمد صاحب کا مکان شعبہ نے رہن رکھا۔ اس سال اس شعبہ کے کل مصارف جس میں کاغذ کی گرانی کے باعث رسالہ ہمدرد جامعہ کا زائد خرچ بھی شامل ہے آٹھ ہزار پانسو تراسی روپے چار آنے ہوئے۔

دہلی کی امداد میں دو مخلص ہمدردوں کی طرف سے دس ہزار کی رقم شامل ہے۔ انھوں نے اپنے نام کے اظہار کی اجازت بھی نہیں دی اور اس خلوص و محبت سے یہ مدد پہنچائی کہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ مدد پہنچی اس وقت سے جامعہ کی مالی آزمائش کا دَور ختم ہو گیا، یہ رقم ناظم انجمن کو اس وقت دی گئی جب کہ وہ مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کی کوئی سبیل نہ پاکر احباب کے مشورے اور اصرار سے حیدرآباد کے سفر پر جا رہا تھا۔ روانگی سے تھوڑی دیر قبل ان مخلص ہمدردوں میں سے ایک نے آکر ناظم انجمن کو دس ہزار کے نوٹ دئے اور فرمایا کہ تم جس بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ سے سفر کا قصد کر رہے ہو شاید یہ رقم اس میں کچھ کمی کر سکے۔ اور تم جہاں جا رہے ہو وہاں اطمینان سے جامعہ کے لئے کوشش کر سکو۔

حیدرآباد کے راستے میں بھوپال پڑتا ہے۔ ناظم انجمن نے دو روز وہاں

قیام کیا۔ ہز ہائی نیس والی بھوپال کو ہمیشہ ۔ ...... جامعہ کے کام سے گہری دلچسپی ہے لیکن عرصہ سے جامعہ کو کوئی مدد بھوپال سے نہ ملی تھی، حالات کا علم ہوتے ہی ہز ہائی نیس نے دس ہزار نقد مرحمت فرمائے اور پانسو روپے ماہوار کی امداد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

حیدر آباد میں یوں تو تمام وزراء حکومت جامعہ کی امداد کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تیار بیٹھے ہیں مگر وزیر اعظم نواب صاحب چھتاری کی توجہ خاص اور وزیر تعلیمات نواب مہدی یار جنگ بہادر کی علم دوستی نے جامعہ کے کام کو بہت آسان بنا دیا۔ لیکن جامعہ کی مالی پریشانیوں کا صحیح نقشہ غلام محمد صاحب وزیر مالیات کے ذہن ہی میں تھا کہ اگر مدد دی جائے تو اتنی تو ہو کہ یہ دشواریاں کم و بیش رفع ہو جائیں۔ چنانچہ ریاست کی طرف سے جو مستقل امداد جامعہ کو ملتی تھی اُسے ڈھائی گنا کر دیا گیا۔ یعنی ایک ہزار ماہوار کی جگہ ڈھائی ہزار ماہوار کر دئے گئے۔ جنگ کے باعث جو خاص مشکلات انجمن کو درپیش تھیں ان کو رفع کرنے کے لئے پانسو روپے ماہوار مزید منظور فرمائے گئے اور قرض کا بار ہلکا کرنے کے لئے مبلغ تیس ہزار یکمشت عطیہ منظور فرمایا گیا۔ اس عطیہ میں سے پندرہ ہزار زیر رپورٹ سال میں وصول ہو چکے ہیں، سال ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ جون میں حاجی محمد شفیق خاں صاحب رئیس شاہجہاں پور نے مبلغ چار ہزار روپے تعمیر مسجد کے لئے مرحمت فرمائے اور مزید رقم کا وعدہ فرمایا ۔

الغرض پچھلے سال کے میزانیہ میں بیس ہزار کے قریب خسارہ کا تخمینہ کیا گیا تھا۔ وہ خسارہ پورا ہو گیا اور بارہ ہزار سے اُوپر قرض میں بھی ادا کیا گیا۔ الحمد للہ۔ سال بھر کا گوشوارہ آمد و خرچ منسلک ہے۔ جناب شیخ الجامعہ

صاحب نے تفصیل سے میزانیہ پیش کیا تھا لیکن ہم نے طوالت سے بچنے کے لئے روپیہ کے حساب میں صرف خلاصہ دیا ہے)

جامعہ کی مالی حالت میں جو خوشگوار تبدیلی ہوئی ہے وہ اگر گرانی نہ ہوتی تو ہماری دشواریوں کو بہت کچھ ختم کر دیتی لیکن نئی دشواریوں نے نئے مسائل پیدا کر دئے ہیں پھر بھی کام کرنے والے اب زیادہ اطمینان سے کام کر سکتے ہیں اور انہیں اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ قوم نے ان کے خلوص اور ایثار کے اعتماد پر جو مدد کی ہے وہ اس کے مستحق ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اپنی کارگزاریوں کا جائزہ جامعہ کی زندگی کے پچیس سال ختم ہونے پر دینا چاہیئے اور اگر اس موقعہ پر جامعہ کی جوبلی منائی جائے اور اس کے لئے اس وقت سے مناسب تیاری شروع کر دی جائے تو مناسب ہوگا۔"

اس کامیابی سے متاثر ہو کر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی ناظم ہمدردان جامعہ نے عید کے موقعہ پر ذیل کے اشعار چھپوا کر جامعہ کے ہمدردوں میں تقسیم کئے:

تشنگاں گر آب جویند از جہاں — آب ہم جوید بعالم تشنگاں

آب کم جو تشنگی آور بدست — تا بجوشد آبت از بالا و پست

ہر کجا دردے دوا آنجا رود — ہر کجا فقرے نوا آنجا رود

ہر کجا تشنہ ست آب آنجا رود — ہر کجا مشکل، جواب آنجا رود

اس طرح خدائے تعالیٰ کے فضل سے جامعہ کا مالی مشکلات کا دور ختم ہوتا ہے

پچیسواں سال

اگست سنہ ۱۹۴۴ء سے جولائی سنہ ۱۹۴۵ء

مدرسہ ابتدائی کی ایک خصوصیت ہے "دیگر تعلیمی مشاغل"... ان میں سے بیشتر کا ذکر ہم نے ان کے قیام کے وقت کر دیا ہے، ہم یہاں مختصراً تنظیم کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

بچے کی شخصیت صرف بندھے ٹکے تعلیمی کام کے ذریعے بھرپور طریقے پر نہیں اُبھر سکتی۔ اُسے اپنی مختلف صلاحیتوں کو اُبھارنے کے لئے مختلف ذرائع درکار ہوتے ہیں۔ دیگر تعلیمی مشاغل (جسے ہم تفریحی مشاغل بھی کہہ سکتے ہیں) کی اہمیت کسی طور پہ کتاب پڑھانے سے کم نہیں ہے۔ ان کے سہارے سے بچّہ اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرنے کے لائق بنتا ہے اور اس کے اندر ذہنی کشادگی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی بھی آتی ہے۔ اُسے صرف اپنے آپ کو اُبھارنے اور سنوارنے کا ہی موقع نصیب نہیں ہوتا بلکہ وہ مل جل کر کام کرنے کا سلیقہ بھی سیکھ جاتا ہے۔ اس طرح احساسِ ذمّہ داری پیدا کرنے کا بھی موثر ذریعہ ہاتھ آتا ہے اور بچوں میں پیش قدمی کرنے کی جرأت بھی پیدا ہوتی ہے۔ آج اس ترقی یافتہ زمانے میں تعلیمی مشاغل کی اہمیت جتانے کی چنداں

ضرورت نہیں ہے لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب کہ ایسے تمام مشاغل تضیع اوقات میں داخل تھے اور بادلِ ناخواستہ انھیں "غیر درسی مشاغل" کہہ کر بس برداشت کرلیا جاتا تھا۔ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی نے ایسے ہی زمانے میں ان "دیگر تعلیمی مشاغل" کی افادیت و اہمیت کا احساس کر کے انھیں اپنے تعلیمی پروگرام کا ایک اہم جزو قرار دیا اور درس و تدریس کے مروّجہ کام کے ساتھ متعدد مشاغل کو اپنے یہاں رائج کیا۔ ان تمام مشاغل کی تنظیم میں حسب ذیل چار عام اصول مدِّ نظر رکھے گئے۔

(۱) حتی الامکان تمام مشاغل کا انتظام مدرسے کے اوقات میں ہو سکے۔
(۲) تمام طلباء کی شرکت کے مواقع نکل سکیں۔
(۳) تمام مشاغل کی باقاعدہ نگرانی کی جائے۔
(۴) مشاغل کی نگرانی بھی اساتذہ کے فرائض منصبی کا جزو سمجھی جائے۔

مدرسہ ابتدائی میں فروغ پانے والے مختلف تعلیمی مشاغل صرف مروّجہ غیر درسی مشاغل کی فہرست سے منتخب نہیں کر لیے گئے تھے بلکہ ان میں سے اکثر یہاں کے اساتذہ کی جودتِ طبع کے بھی شاہد ہیں۔ مثلاً بچوں کا بنک، جہاں بچے ایک باضابطہ بنک کے قواعد وضوابط کے ساتھ لین دین کرنے کے ساتھ ساتھ منافع کے بھی حقدار ہوتے ہیں۔ اسی طرح بچوں کی دکان اور بچوں کا خوانچہ، بھی اپنی وضع کی نئی دلچسپیاں ہیں۔ خبروں کے جمع کرنے کا مشغلہ، بہت پرانا ہے۔ یہاں اُس نے مختلف روپ دھارے بچے اپنی اپنی دلچسپی اور پرواز فکر کے مطابق خبریں جمع کرنے کا چسکا لیتے۔ تعلیمی سیر کے پروگرام کو جگہ دی گئی۔ پَر اور پتھر، جیسی خبریں جمع کرنے والے طلباء کو تعلیمی سیر کا پروگرام کچھ اور دلچسپی کا باعث ہونے لگا۔ ایک چھوٹا سا چڑیا گھر اور مُرغی خانہ بھی کھولا گیا۔ ان کا انتظام بھی بچوں کے سپرد ہوا۔ وہ بہر طور اپنے آپ کو پرندوں کا "اچھا دوست" کہلانے کا مستحق قرار دینے کی کوشش کرنے لگے اور ان کی زندگی

کے بارے میں ہر طرح کی معلومات حاصل کرنے لگے۔ تیراکی، اسکاؤٹنگ، کیمپ فائر اور کھیل ہوا کا مدرسہ " تو کچھ اس طرح معمولات میں داخل ہوئے کہ ان کے بارے میں " ناغۂ شغل " کا خیال ہی جاتا رہا۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ان میں سے بعض مشاغل مخصوص جماعتوں کی ذمہ داری قرار دے دئے گئے جیسے بنک، دکان، خونچہ، مرغی خانہ، چڑیا گھر اور ہر ایک کا ایک استاد یا اتالیق نگراں قرار پایا۔ اور کچھ ایسے عام مشاغل قرار پائے جن میں سب ہی بچے حسب مقدور دلچسپی لے سکیں لیکن ہر شغل، بچوں کی تعلیمی رپورٹ کا حصہ قرار پایا اور ان کا ذوق و شوق ابھارنے کی ذمہ داری کو ہر استاد نے اپنا خوشگوار فرض سمجھ کر قبول کیا۔

یہ مدرسہ اس بات کا بھی خیال رکھتا ہے کہ وہ ہر سال ہونے والی تقریبات کو جدت کے ساتھ اس انداز میں پیش کرے کہ بچوں کے لئے ان میں تعلیمی افادیت اور مسرت کے سامان ہوں تو بڑوں کے لئے ان کے مظاہروں میں حصہ لینا کشش کا باعث ہو، مثال کے لئے " میلاد النبیؐ پروجکٹ " کو لیجئے، اس سال کی جدت نے سب لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا یعنی،

۱. ایک دن پہلے رات میں " میلا د النبیؐ سے متعلق کیمپ فائر "
۲. صبح کے وقت ترانہ بیداری (گشت لگاتے ہوئے)
۳. میلادی نمائش۔
۴. کھیل اور ورزشوں کے مقابلے۔
۵. سہ پہر اتعدات میں خاص جلسے۔

ان میں سے ۲ سے ۵ تک کی چیزیں معروف ہیں نمبر ۱ جدت کی چیز تھی۔ اس کی مختصر تشریح یہ ہے۔

میلادالنبیؐ سے متعلق کیمپ فائر کی تمام نقلیں عربوں سے متعلق تھیں، مثلاً "عربوں کا وعدہ" "عرب چرواہا" "اونٹوں کا قافلہ" نخلستان کے کنارے بدوؤں کا قیام، ایک شخص ؟ کا کاہنوں کے پاس جانا اور ان سے بچے کی زندگی اور قسمت کا حال معلوم کرنا خسرو اور پرویز کے دربار میں عرب ایلچی وغیرہ اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ عربوں کی زندگی کا ایک نقشہ سامنے آجائے۔

دوسری جدت یہ دیکھنے میں آئی کہ میلادالنبیؐ کی تیاریوں کے زمانے میں دو دن بیچ کر کے صبح کی حاضری میں ایک استاد بچوں کو مخاطب کرتا تھا۔ ایک دن پروفیسر محمد مجیب صاحب بچوں سے مخاطب ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔

"آپ کے لئے تندرست اور ہوشیار ہونا بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ آپ کو اچھے مسلمان بھی ہونا چاہیئے کہ آپ اسلام کے سچے پیرو بن سکیں اور ہمارے نبیؐ کی زندگی آپ کے لئے مثال بن سکے۔ میلادالنبیؐ منصوبہ دراصل آپ کو اچھا مسلمان بنانے کا منصوبہ ہے۔ جس کا کام آپ نے مدرسہ ابتدائی سے شروع کیا ہے یہ ساری عمر جاری رکھیں گے۔

دوسرے مقررین میں سعید انصاری صاحب، ڈاکٹر سعید احمد صاحب، شفیع الدین صاحب نیرؔ۔ عبدالاحد صاحب، رشید نعمانی صاحب، اصغر حسن اسلامی صاحب، اور شبیر احمد صاحب انصاری تھے۔

ان دنوں مدرسہ ابتدائی میں کھیلوں کے ناظم محمد حسین صاحب تھے۔ جامعہ میں طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال اور ہاکی کے کھیلوں میں آپ کے جوہر دیکھنے میں آئے تھے، اب جب کہ مدرسہ ابتدائی میں آپ کا تقرر ہوا تو کھیلوں کی تنظیم آپ کے سپرد ہوئی۔ بچوں میں آپ "ابّو" کے نام سے مشہور ہو گئے، اس ملنساری اور کھیلوں کی مہارت سے بچوں کو فائدہ ہوا، ہاں تو جلسوں کا ذکر ہو رہا تھا۔

"جامعہ کا یوم تاسیس" منانے میں، جامعہ نے جس تعلیمی افادیت کو پیش نظر رکھا ہے یہ بھی جامعہ کی خصوصیات میں سے ایک ہے، یہ "یوم تاسیس" کبھی تو ایک ادارے نے پروجکٹ کی حیثیت سے چلایا، تو کبھی تمام اداروں کی طرف سے مشترکہ پروجکٹ کی حیثیت سے کبھی دفتر شیخ الجامعہ نے اپنے اہتمام میں منایا جس میں شعبوں کے نگرانوں نے اپنی اپنی رپورٹ سُنائی تو کبھی طالب علموں کے نمایندوں نے کسی جلسہ کے اہتمام میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس دفعہ یہ دن بچّوں کی مجلس کے اہتمام میں منایا گیا جس میں پوری جامعہ برادری شریک تھی، ثانوی اور کالج کے نمایندوں نے مضامین اور نظمیں سنائیں مدرسہ ابتدائی کے بچّوں نے "جامعہ کی ابتدائی زندگی" کے نام سے ایک ڈرامہ دکھایا۔ جن مشکلات سے جامعہ کے کارکنوں نے اس نازک دور سے جامعہ کو نکالا اس کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری کے کردار اس ڈرامے میں تھے۔

اِس ڈرامے میں محمد اقبال احمد سرمنڈا کرادر ہو بہو گاندھی جی کی ہیئت اختیار کرکے نمودار ہوئے، ان میں اور گاندھی جی میں ذرا فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ عینک، دھوتی۔ لکڑی۔ بات چیت سب کچھ گاندھی جی کی تھی۔

یہ ڈرامہ آزاد رسولی صاحب نے لکھا تھا آپ اس مدرسہ کے تعلیمی اسٹاف میں شامل ہو گئے تھے۔ آزاد صاحب تعلیمی مسائل میں آزاد خیالی کے حامی ہیں، ان مسائل کو اس کے اصلی رُوپ میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، نام ونمود سے کتراتے ہیں۔ ان دنوں مدرسہ کی نگرانی عتیق احمد صاحب کے ذمّہ تھی جن کی محنت، فکر تدبّر نے مدرسہ کے معیار کو قائم رکھنے میں مدد دی۔

بچّوں کا میلہ اور محمد علی لڑائی کی خاص بات یہ تھی کہ یہ دونوں تقریبیں ایک

ساتھ ہوئیں، پہلے دن بچوں کا میلہ ہوا، اس سے متصل محمد علی ٹرانی کا کیمپ اور جلسے دو دن ہوئے۔

• جامعہ کا ترانہ" جو آجکل بھی رائج ہے۔ اسے پہلی دفعہ میلے کے افتتاح کے موقعے پر جامعہ کا جھنڈا لہراتے وقت بچوں نے گایا۔ نیر صاحب نے اس ترانے کو میلے سے ایک دن پہلے "آمد" کے عالم میں لکھا تھا۔ آپ بچوں کے شاعر اور ادیب ہیں۔ اسی سال آپ نے ماڈرن اسکول چھوڑ کر جامعہ کے مدرسہ ثانوی میں کام شروع کر دیا تھا خاص خاص تقریبوں کے موقع پر اس ترانے کو مؤثر طریقے سے گایا جائے تو حاضرین پر اس کا اثر ہوتا ہے۔

ترانہ یہ ہے۔

تعلیم و تربیت کا نقشہ جما رہا ہے — علم و عمل کا سیدھا رستہ دکھا رہا ہے
کچھ اس طرح فضا میں لہلہا رہا ہے — خدمت کی سمت گویا ہم کو بلا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم یہ جامعہ کا پرچم

ہم کو بتا رہا ہے رازِ عروجِ ملّت — ہم کو جتا رہا ہے انساں کی ضرورت
لازم ہے یہ کہ سیکھیں ہم فرضِ آدمیت — قدرت کی یاوری کا مژدہ سنا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم یہ جامعہ کا پرچم

اس کی بلندیوں سے ظاہر ہے یہ اشارا — شاید یہی ہے اپنی تقدیر کا ستارہ
ٹوٹے ہوئے دلوں کا اس دیس میں سہارا — آنکھوں میں بس رہا ہے دل میں بسا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم یہ جامعہ کا پرچم

ڈاکٹر ذاکر صاحب شیخ الجامعہ نے اس دفعہ اس پرچم کی وساطت سے جامعہ والوں کو ان کے عزائم کی طرف کس خوبی، قوت، یقین کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ
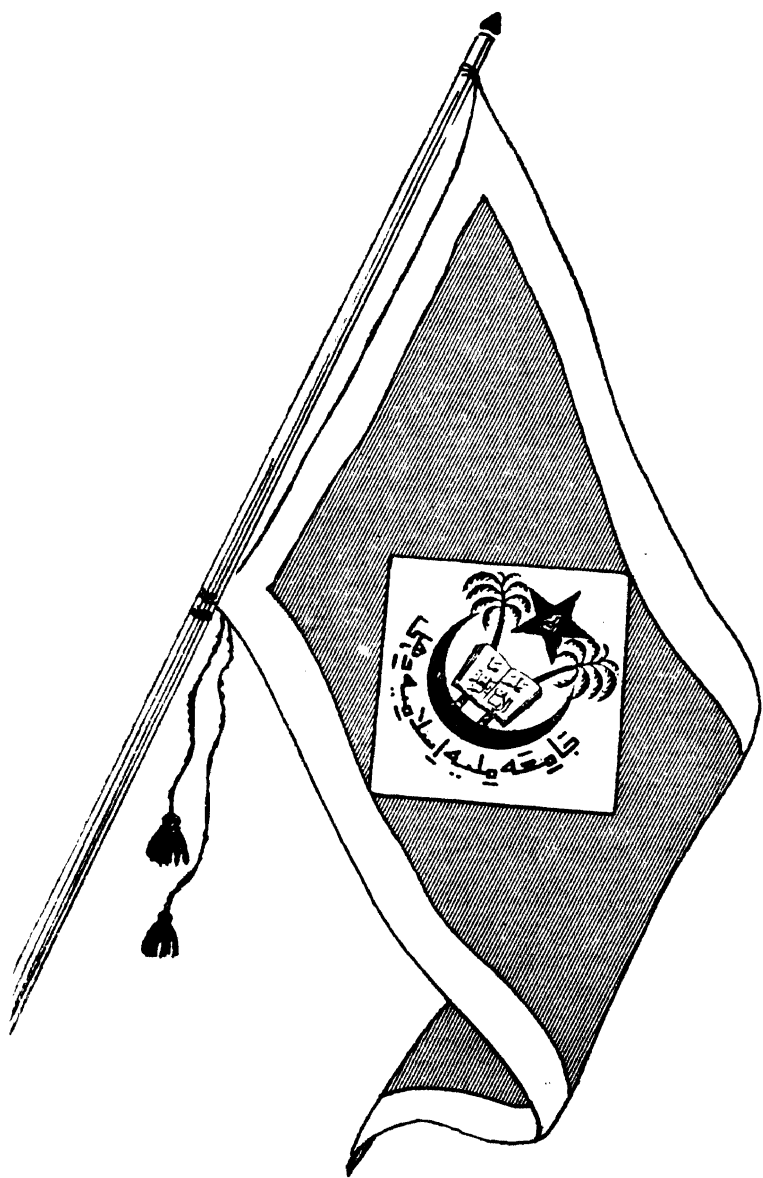
بھائیو اور عزیزو، آپ سب کو عید مبارک ہو۔ آپ کو عید کا یہ میلہ بھی
مبارک ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال جب میں نے بچوں کے میلے کا افتتاح
کیا تھا تو میرے پاس مولانا عبید اللہ (سندھی) مرحوم کھڑے تھے۔ اپنی تمناؤں
اور دعاؤں کے ساتھ۔ وہ اس وقت بہت بیمار تھے لیکن آپ کی سڑکوں
آپ کی دکانوں، آپ کے کھیلوں کو دیکھ دیکھ کر کیسے خوش تھے۔ ایسے خوش
جیسے یا تو ایک معصوم بچہ خوش ہو سکتا ہے یا وہ جس کی نظر حاضر کے پردوں میں
سے مستقبل کی جھلک دیکھ سکتی ہے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں اور اب
کبھی اپنی اس جسمانی شکل میں ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتے لیکن ان کی دعائیں
ہمارے ہاتھوں پوری ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ شاید اس ملک کی کسی
دوسری تعلیم گاہ کو اس قدر کے اتنے بڑے بڑے مسلمانوں سے وابستگی کا
شرف حاصل نہیں ہوگا جتنا کہ جامعہ کو ہے۔ یہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ،
مولانا محمد علیؒ، حکیم اجمل خان صاحبؒ، ڈاکٹر انصاریؒ، مولانا عبید اللہ
سندھیؒ کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہے۔ انھیں پورا کرنے کا فرض ہمارے
آپ کے ذمے ہے۔ ذمہ داری بڑی ہے اور ہم بہت کمزور ہیں لیکن اُسے
اپنے سر لیا ہے تو پورا بھی کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی کوشش سے جامعہ کو مسلمانوں کا
ایسا مرکز بنانا ہے جہاں سب اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر یقین رکھتے
ہوں اور اس یقین کے لئے ہر ممکن جد و جہد میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ پرچم جس کے
لہرانے کا شرف آج مجھے ملا ہے اسی جامعہ کا پرچم ہے۔ کپڑے کا ایک کم قیمت
ٹکڑا لیکن ان آرزوؤں اور تمناؤں کا علم جن کا ذکر ابھی کیا۔ یہ کپڑے کا ٹکڑا
ان خیالات، ان افکار، ان مقاصد، ان حوصلوں کی وجہ سے بے بہا ہے۔
جن کا یہ ترجمان ہے۔ یہ ترجمان ہے اس حقیقت کا کہ زندگی ہلکے پھلکے میٹھے میٹھے

نفعلوں کو نہیں ملتی بلکہ پرخلوص عمل سے ملتی ہے۔ زندگی نفع نقصان کا بھی کھاتہ نہیں بلکہ چند عوائم کے لئے جان کھپانے کا ایک موقع ہے۔ وہ دُھرا جس پر زندگی گھومتی ہے، رنج و راحت کا دُھرا نہیں بلکہ ترقی و تنزل، ارتقا و انحطاط کا دُھرا ہے۔ یہ پرچم باتوں کے مقابلے میں کام کا، تساہل کی جگہ سعیٔ پیہم کا، آرام طلبی کی جگہ جفاکشی کا پرچم ہے۔ بیماری کے مقابلے میں تندرستی کا، کمزوری کے مقابلہ میں مضبوطی کا، گندگی کے مقابلہ میں صفائی کا، بدنمائی کی جگہ حسن کا پرچم ہے۔ جسم کی تندرستی کا بھی اور روح اور ذہن کی درستی کا بھی جسم کی مضبوطی کا بھی اور عزم و یقین کے ثبات کا بھی، جسم کی صفائی کا بھی، اور روح کی ہم آہنگی کا بھی۔ یہ ان چیزوں پر یقین کا پرچم ہے اور ان کی پیہم کوشش کا پرچم، اور اگر ہم تم اپنے ارادوں سے، اپنے کام سے، اپنی ثابت قدمی سے ملے ان سب کا علم بنا سکیں تو کپڑے کا حقیر سا ٹکڑا دنیا کی سب دولتوں سے زیادہ قیمتی ہو جائے گا اور اس ملک میں ہمارے لئے باعزت زندگی کا پرچم بن جائے گا۔"

اس تقریر کے بعد آپ نے میلہ کے افتتاح کا اعلان فرمایا جس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر ہم شروع میں کر چکے ہیں۔

محمد علی ٹرافی کا افتتاح حکومت ہند کے محکمۂ صحت و تعلیم کے رکن انچارج سردار جوگندر سنگھ نے کیا۔

آپ نے فرمایا:-

"میں صحت و تعلیم کا وزیر ہوں مجھے خوشی ہے کہ جو کام جامعہ ملیہ کر رہی ہے اس سے ملک کی نجات ہوگی۔ ہندوستان کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اچھے جسم میں اچھے دماغ کے لوگ ہوں۔ یہ خدمت جامعہ بخوبی انجام دے رہی ہے۔"

اس سال استادوں کے مدرسہ میں صوبہ سرحد کے اساتذہ کے لئے دوسرا اعادی
ز۔ ماب ہوا۔ اساتذہ کے رہنے کے لئے جگہ کی کمی تھی اس لئے خیموں سے اقامت گاہ
کا کام لیا گیا۔ اس کا پروگرام اسی طرح تھا جس طرح پہلے اعادی نصاب کا۔ البتہ اس دفعہ
بیرونی لکچر کافی ہوئے جن کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ جنگ کے بعد تعلیم کی توسیع — اشفاق حسین صاحب

۲۔ بنیادی تعلیم، اس کا حال اور مستقبل — خواجہ غلام السیدین صاحب

۳۔ استادوں کی تعلیم کا مسئلہ — حبیب الرحمن خاں صاحب، پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڈھ

۴۔ تعلیم میں ضبط اور اس کا جدید نظریہ۔ — عبدالغفور صاحب ایم۔ اے۔ لکچرر ٹریننگ کالج، علی گڈھ۔

۵۔ شہری تعلیم اور اس کے مسائل — خاں صاحب علی احمد خاں صاحب جعفری سپرنٹنڈنٹ میونسپل ایجوکیشن دہلی۔

۶۔ ہیلتھ ایجوکیشن کیا ہے — لالہ پدم چند صاحب ڈائرکٹر ہیلتھ اسکول دہلی

۷۔ آرٹ کی تعلیم اور بچے — چودھری نہار رنجن صاحب پالی ٹکنک دہلی

۸۔ شریر بچے — ڈاکٹر گھیبا صاحب، ڈائرکٹر چائلڈ گائیڈنس کلینک نئی دہلی۔

۹۔ بچوں سے کام کیسے لینا چاہیئے؟ — مسز ایلزبتھ گوبا صاحبہ، نرسری اسکول نئی دہلی۔

۱۰۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم — مسز شیورائڈ صاحبہ، نئی دہلی۔

۱۱۔ گذشتہ سو سال کی سیاسی تحریکیں اور ان کا اثر تعلیم پر، پروفیسر محمد مجیب صاحب۔

۱۲۔ ہندوستان میں انگریزی تہذیب و تعلیم کا تسلط۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب،

مختلف موقعوں پر جامعہ اسکاؤٹس کے اجتماع اور مظاہروں میں جناب پروفیسر

محمد مجیب صاحب نے جو تقریریں کیں ان کے عنوان یہ ہیں۔

۱. اسلام کی باتیں۔

۲. زندگی کی تعلیم۔

ادارہ تعلیم و ترقی میں ایک نئی چیز نظر آتی ہے وہ ہے تعلیمی مرکز ہال (کمیونٹی سنٹر) کا آغاز۔

منصوبے کے مطابق پڑھے لکھے لوگوں کے لئے مارچ ۱۹۴۵ء میں تعلیمی مرکز ہال کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس کا مقصد بھی تعلیمی و تفریحی تھا۔ یہ اجمل روڈ قرول باغ میں قائم کیا گیا۔ جہاں اس وقت تعلیمی مرکز نمبر ا کے نام سے جامعہ کا ابتدائی مدرسہ تھا۔

منصوبے میں ایک دار المطالعہ، ایک لائبریری، لائبریری کے ساتھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے حلقہ، علم و ادب کا قیام، علمی، ادبی اور تہواروں کی جلسوں کا انعقاد، فرصت کے اوقات میں آرائشی حرفوں کے مختصر مدت کے کورسوں کا انتظام اور کھیلوں کا شوق پیدا کرنے کے لئے ٹورنامنٹ کا انتظام شامل تھا۔

۴ مارچ ۱۹۴۵ء کو اس ہال کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا۔

"جو لوگ کالجوں اور اسکولوں کے نکلنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ ان کی تعلیم مکمل ہو گئی اور اب انھیں کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے وہ دھوکہ میں ہیں تعلیم کا مقصد نہیں ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا جائے یا کالجوں اور یونیورسٹیوں میں انھیں کچھ گنی چنی کتابیں پڑھا دی جائیں تعلیم کے صرف یہی دو تین محاذ نہیں ہیں بلکہ پڑھے لکھوں کی تعلیم کے لئے انتظام کرنا اور انھیں اپنے علم کو تازہ رکھنے کے مواقع فراہم کرنا بھی کسی تعلیمی نظام کا ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ آپ کی برادری میں بہت سے لوگ ہوں گے جن کو آپ کے برابر اپنی تعلیم کی تکمیل

کا موقع نہیں ملتا ہوگا۔ اگر آپ اس حصّہ سے بے خبر ہو جاتے ہیں تو یاد رکھیے کہ آپ بھی ختم ہو جائیں گے۔ اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں کہ آپ کے ذریعہ آپ کے پس ماندہ بھائی لکھ پڑھ لیں کچھ سیکھ لیں اور کچھ ترقی کر لیں تو آپ بہت بڑا کام انجام دیں گے۔ یہ نیا ادارہ اسی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش ہے جو مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں کی ہمت اور حوصلہ کی بدولت کامیاب ہوگی۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ہال کے افتتاح کا اعلان فرمایا۔ اور حاضرین ریڈنگ روم میں گئے جہاں انگریزی، اُردو اخبارات ورسائل کے علاوہ حالات حاضرہ کے متعلق چھوٹی چھوٹی کتابوں کا انتظام کیا گیا تھا اور فرشی کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔

چند مشغلوں کے علاوہ جن کا بند و بست سرمائے کی کمی کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ ہال کے اور کام خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ اس ہال کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ قرول باغ کے سبھی فرقوں کے لوگ بلا امتیاز مذہب وملّت ہال کی سرگرمیوں میں بڑے جوش وخروش اور خلوص سے حصّہ لیتے تھے اور اس کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے دل وجان سے کوشش کرتے تھے۔ اسی خلوص اور جوش عمل کا نتیجہ تھا کہ بستی کے پڑھے لکھے طبقے میں خاصی چہل پہل اور بیداری ہوگئی۔

بالغوں کے لئے نصاب تعلیم تیار کرنے کا سوال شروع سے جامعہ کے سامنے تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں جب تعلیم بالغان کا کام شروع کیا گیا تو پہلی فرصت میں اس کی طرف توجہ کی گئی .... میں نے ایک نصاب بنایا تھا یہ محض ایک ابتدائی کوشش تھی ادارے نے بالغوں کے لئے گشتی کتب خانہ قائم کیا تو بالغوں کے لئے موزوں کتابوں کی فراہمی میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔

بات یہ تھی کہ اب تک کتابیں یا تو بچّوں کے لئے لکھی جاتی تھیں یا پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اس تیسرے طبقہ یعنی ناخواندہ یا سوشل ایجوکیشن یا تعلیم بالغان کا کام

کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے بھی چند کتابیں شائع کی گئیں مثلاً بالغوں کی نفسیات" میکسیکو کا ایک تجربہ" فلپائن میں خواندگی کی مہم" سوئیڈن کے عوامی کالج وغیرہ۔

والدین کی رہنمائی کے لئے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کئی مفید اور کارآمد کتابیں لکھی گئیں "بچوں کی تربیت ذہین بچے، ننھا مدرسہ چلا" میرا ننھا" ننھے کے سوالات" "بچہ اور گھر" "ذہنی کش مکش اور اس کا علاج" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

یہ تعلیمی مرکز ہال شفیق صاحب مرحوم کی نگرانی اور برکت علی صاحب فراق کے اہتمام میں بہت کامیابی سے چلتا رہا۔

برکت، صاحب جامعہ کے سابق طالب علم ہیں، کام سوچ سمجھ کر کرتے ہیں نتیجے پر نگاہ رہتی ہے۔ تنقیدی نظر اچھی ہے۔ شفیق صاحب نے مختلف صلاحیتوں کے لوگوں سے کام لینے کی کوشش کی۔

اس سال ایک اور شعبے کا قیام عمل میں آیا وہ تھا "شعبۂ امورِ عامہ" جامعہ کی بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ شعبہ قائم کیا گیا، اس کے ذمے یہ کام تجویز ہوئے۔

۱۔ بستی کی عام صفائی، خوب صورتی، راستوں کی درستی اور روشنی وغیرہ کا انتظام۔

۲۔ جامعہ کے باغات اور نرسری کا انتظام۔

۳۔ جامعہ کے عام سامان کی حفاظت۔

۴۔ جامعہ کی غیر مسکونہ آراضیات اور کاشت کا انتظام۔

اس شعبے کے ناظم ارشاد الحق صاحب مقرر ہوئے، آپ کی نگرانی میں مندرجہ بالا کاموں کے لئے علیحدہ علیحدہ مہتمم مقرر ہوئے۔ ارشاد صاحب کو بستی کی عام آرائش، خوب صورتی سے جو قدرتی لگاؤ تھا، اس کے پیشِ نظر یہ انتخاب بہت موزوں تھا۔

مکتبہ جامعہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ جب اس ادارے نے کافی ترقی کر لی تو اس کا کام چلانے کے لئے حامد علی خاں صاحب کی نظامت میں جامعہ نے ایک "مجلس مکتبہ" بنا دی کہ اس کی نگرانی میں سب کام انجام پائیں۔ جامعہ کی جوبلی میں جب پانچ برس رہ گئے تو اس مجلس نے اپنا پنج سالہ پروگرام بنایا جس کے خرچ کا اندازہ تین لاکھ روپے رکھا تاکہ جوبلی کے موقع پر نئی کتابیں پیش کی جا سکیں۔ اس اسکیم میں کہا گیا ہے کہ

"اس کے ماتحت علمی، سیاسی، اسلامی، تاریخی، صنعتی، ادبی، اخلاقی لٹریچر کو دیدہ زیب شکل میں پیش کیا جائے گا۔ بزرگان کرام، اولیائے عظام اور قائدین ملت کی سوانح حیات شائع کی جائیں گی۔ بچوں اور لڑکیوں کے مذاق کے چھوٹے چھوٹے رسالے طبع ہوں گے۔ چودہ مشہور انگریزی کتابوں کے ترجمے ہوں گے۔ پہلے درجہ سے دسویں درجہ تک اس قسم کی اُردو ریڈریں لکھی جائیں گی جو رسم الخط اور زبان کے لحاظ سے مبتدیوں کے لئے آسان ہوں گی اور وہ جلد ان کے ذریعہ تعلیم حاصل کر سکیں گے"۔

اس پروگرام کے تحت منجملہ اور کتابوں کے ایسی ریڈریں تیار کی گئیں جو متعلقہ صوبوں میں قابل قبول ہوں، چنانچہ دہلی، بمبئی، حیدرآباد، کشمیر کی حکومتوں نے ان ریڈروں کے پڑھائے جانے کی منظوری دے دی۔ اس نفع کی وجہ سے مکتبہ کو علمی خدمت کا بہت موقع ملا یعنی وہ ایسی کتابیں بھی شائع کرنے لگا جو فروخت کے اعتبار سے صبر آزما تھیں لیکن ہمارے ادب کا قیمتی سرمایہ تھیں۔ تعلیمی کتابیں شائع کرنے پر بھی خاص توجہ دی۔ اس پنج سالہ پروگرام کے چلانے میں حامد علی خاں صاحب کے علاوہ ان کے ساتھی مشتاق احمد صاحب، سید محمد ادیا ما صاحب آرٹسٹ، منظور احمد صاحب، ذوالفقار علی صاحب رشید احمد صاحب نے بہت کام کیا تھا

حامد صاحب کی طرح مشتاق صاحب کی نفاست اور تنقیدی نگاہ سے طباعت کو معیاری بنانے میں بہت مدد ملی۔

رسالہ ہمدرد جامعہ کی ادارت کا کام کچھ عرصہ کے لئے جناب ابوالکاظم قیصر۔ زیدی صاحب نے سنبھالا تھا، آپ نے جدت سے کام لیتے ہوئے کوائف جامعہ کی بجائے "صبح چہ صبح" "شامے چہ شامے" کی سرخیاں قائم کی تھیں، اوّل الذکر کے تحت صبح اور دوپہر کے درمیان ہونے والے واقعات اور موخرالذکر سرخی میں دوپہر اور رات کے درمیان ہونے والے واقعات آپ قلم بند فرماتے تھے، موصوف جامعہ کالج میں اُردو کے لکچرار ہیں اور جامعہ کے مخلص کارکن ہیں۔

آیئے اَب جامعہ کے کتب خانہ پر ایک نظر ڈالیں، اس زمانے کے ناظم پروفیسر محمد عاقل صاحب نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے۔

"جامعہ ملیہ کی علی گڈھ میں جب بنیاد رکھی گئی تھی اس وقت بجز ان کتابوں کے جو مولانا محمد علی مرحوم کی خاص ملکیت تھیں اور کوئی ذخیرہ کتابوں کا جامعہ میں نہیں تھا اور اس درس گاہ کا تمام سرمایۂ علمی ایک چھوٹی سی الماری میں محدود تھا۔ طلباء جامعہ نے جس طرح قیام جامعہ میں حد درجہ ایثار سے کام لیا تھا اسی طرح جامعہ کے اس اہم شعبہ کی نشو و ترقی میں بھی انھوں نے شروع ہی سے بہت مدد دی۔ اپنی کتابیں کتب خانہ کو دیدیں اور اپنے احباب سے کتابیں دلوانے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود ان اصحاب کی مدد کے ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔

دوسرے سال چند مربیان اور کارکنان جامعہ کی طرف سے ایک اپیل قوم اور ملک کے نام شائع کی گئی جن میں کتب خانہ کو مدد دینے کی مختلف صورتیں پیش کی گئی تھیں اور لوگوں سے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ چند بڑے بڑے ذخیرے دستیاب ہو گئے جن سے کتب خانہ کی حیثیت

واقع ہوگئی۔

چنانچہ ستمبر ۱۹۲۲ء تک جو بڑے بڑے ذخیرے دستیاب ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) عطیہ مفتی انوار الحق صاحب۔

(۲) عطیہ جناب سیف اللہ صاحب بھٹی رئیس گوجرانوالہ۔

(۳) عطیہ مولانا محمد علی مرحوم۔

(۴) عطیہ عبدالمجید خواجہ صاحب سابق شیخ الجامعہ اور موجودہ امیر جامعہ

لیکن اصحاب مندرجہ صدر کی فیاضی کے باوجود جامعہ کی ضرورتیں، پوری نہ ہو سکیں اور فوری ضروریات کے لحاظ سے بہت سی کتابیں قیمتاً خریدنا پڑیں اور اس سلسلہ میں فروری ۱۹۲۳ء تک تقریباً آٹھ ہزار روپیہ صرف کیا گیا۔ دینی کتب کی خریداری میں ایک ہزار روپیہ جو ایک مرد خدا کا عطیہ تھا، ان کے علاوہ صرف ہوا۔

اس کے بعد عطیات اور خریداری کتب کا سلسلہ برابر جاری رہا عطیات میں خاص طور پر قابلِ ذکر حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عطیہ صاحبزادہ ساجد علی صاحب علی گڈھ

۲۔ عبدالقیوم صاحب نقوی سہسوان (بدایوں)

۳۔ بیگم صاحبہ ڈاکٹر انصاری مرحوم

۴۔ عطیہ جناب نصرت میر خاں صاحب فرخ آباد

۵۔ امانت سید جالب مرحوم ایڈیٹر ہمدم

کتب خانہ میں قیمتی مخطوطات کا بھی ایک مختصر ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے جن میں سے بعض نسخے نادر ہیں۔

۱۹۳۵ء میں کتب خانہ کو پبلک لائبریری بنا دیا گیا ہے جس سے جامعہ کے علاوہ باہر کے لوگوں کو بھی رکن بننے کا موقع مل گیا ہے۔ علی گڈھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد کتابوں کے رکھنے کے لئے ایک عرصہ تک کوئی معقول مکان نہ مل سکا اور وہ بے ترتیبی کے ساتھ بند پڑی رہیں۔ جب کتب خانہ کی موجودہ عمارت کو کرایہ پر لیا گیا تو میرے پیشرو مہتمم... محمد یونس نیازی صاحب نے کتب خانہ کو از سر نو ترتیب دیا۔ ان کی بنوائی ہوئی فہرستوں کا ریکارڈ موجود ہے لیکن کتابوں کی ترتیب میں ڈیوئی کی تقسیم اعشاری میں اپنی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ترمیمیں کی تھیں اور کتب خانہ کی موجودہ ترتیب ان ہی کی ترمیم شدہ تقسیم کے مطابق ہے۔

کتابوں کی الماریوں کے پاس ہر کمرہ میں مضامین کے انڈکس کی تختیاں لٹکا دی گئی ہیں جنھیں دیکھ کر کتابوں کو سہولت کے ساتھ ڈھونڈا جا سکتا ہے پھر کتب خانہ کی کتابوں کی ترتیب اور قواعد و ضوابط کے بارے میں یکجائی طور پر معلومات فراہم کرنے کے لئے ایک رسالہ رہنمائے کتب خانہ کے نام سے چھپوایا گیا ہے جس کی قیمت ایک آنہ اس لئے رکھ دی گئی ہے تاکہ اس کی طباعت کا خرچ نکل آئے۔

ہمارے کتب خانہ کو جو چیز دہلی کے دوسرے کتب خانوں سے ممتاز کرتی ہے وہ اعلیٰ معیار کے غیر ملکی رسالوں کی کثرت ہے۔ غیر ملکوں کی تاریخ حاضرہ اور واقعات موجودہ پر اچھا مواد ہمارے کتب خانہ میں ان رسالوں کے ذریعہ سے جن کے ہم باقاعدہ فائل رکھتے ہیں مل سکتا ہے۔

چونکہ ہماری جامعہ میں اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے اور ہم علوم و فنون کی اشاعت اُردو کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات ہمارے لئے سہولت کے ساتھ ممکن ہے کہ ہم اپنے اُردو کے شعبہ کو آہستہ آہستہ ایک ہمہ گیر اور مکمل شکل دے سکیں۔ اس سال کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ اس وقت کتب خانہ میں بیس ہزار کتابیں موجود ہیں۔ ان کتابوں

میں سید جالب صاحب مرحوم ایڈیٹر ہمدم کا کتب خانہ بھی شامل ہے جس کو موصوف کے صاحبزادے سید عشرت حسین صاحب نے امانتاً جامعہ کے سپرد کر دیا تھا اور استفادہ کی اجازت دے دی ہے۔ شعبہ وار تقسیم ابھی صرف ۷ ہزار کتابوں کی کی جا سکی ہے۔ مذہبی کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ تقریباً تین ہزار کتابیں، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام تصوف، مناظرہ اور مختلف مذاہب پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ فلسفہ اجتماعیات، لسانیات، سائنس، فنون لطیفہ، اور فنون مفیدہ، ادب (اُردو، عربی، فارسی، انگریزی جرمن، فرانسیسی، اطالوی اور روسی) اور دُنیا کے مختلف ممالک کی تاریخ پر بھی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

کتب خانہ میں قیمتی مخطوطات کا بھی ایک مختصر ذخیرہ ہے جن میں سے بعض نسخے نادر ہیں۔ مثلاً

۱۔ احکام الادویۃ القلبیہ، مصنفہ بو علی سینا مکتوبہ علی محمد ۵۸۲ھ

۲۔ شرح قصیدہ بانت سعاد مصنفہ عبد اللہ ابن ہشام مکتوبہ محمد قطب قاہرہ ۷۶۶ھ۔

محمد علی میوزیم بھی کتب خانہ ہی سے متعلق ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کے مکتوبات روزنامچے (ڈائریاں) اور قلمی نظمیں اور مولانا کی معرکہ آرا تصنیف Islam the Kingdom of God کا ناتمام مسودہ، مولانا کا ایک البم اور متفرق کاغذات محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے تبرکات بھی اسی میوزیم میں رکھ دئے گئے ہیں جن میں بعض کاغذات بہت اہم ہیں۔

اس کے علاوہ اکابرین کی مختلف تحریروں کا ایک اور ذخیرہ ہے جو محمد امین صاحب زبیری سابق مہتمم تاریخ بھوپال نے عنایت فرمایا ہے۔

علی گڈھ کے زمانے میں اس کتب خانہ کے مہتمم سید محمد صاحب تھے۔ جامعہ

جب دہلی آئی تو اس کی نگرانی شفیق الرحمن صاحب قدوائی کے سپرد ہوئی۔ جو اس وقت پوسٹ گریجویٹ تھے۔ آپ نے کتب خانے کو از سر نو ترتیب دیا۔ آپ کے بعد سید نذیر نیازی صاحب استاد جامعہ نے مہینوں کی مسلسل محنت کے بعد کتب خانہ کی باضابطہ فہرست ڈیوی کی تقسیم اعشاری کے مطابق کسی قدر ترمیم کے ساتھ تیار کی، نیازی صاحب کی معلومات بہت وسیع ہیں، قدیم اور جدید کتابیں آپ کی نگاہ میں رہتی ہیں، آپ کے بعد پروفیسر محمد عاقل صاحب ناظم ہوئے اور بڑے استقلال سے کام کیا۔ آپ جامعہ میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ کتاب ہی آپ کی دُنیا تھی۔

۱۹۳۶ء میں جامعہ کے سابق طالب علم حافظ نبی احمد صاحب نے محمد عاقل صاحب کی نظامت کے زمانے میں مہتممی کا کام سنبھالا معلومات کے ساتھ ساتھ آپ کی یادداشت حیرت انگیز ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی چیز آپ کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتی ہے۔ اس صنعت سے کتب خانے سے استفادہ کرنے والوں کو بہت سہولت ہے۔ محنتی ہونے کے علاوہ آپ کتب خانے کے صحیح معنوں میں محافظ ہیں۔ زائد مہتمم کتب خانہ کی حیثیت سے عبداللطیف اعظمی صاحب نے آپ کا ہاتھ بٹایا، اعظمی صاحب کو شروع ہی سے لکھنے پڑھنے سے دلچسپی رہی ہے۔

انجمن اتحاد کے اہتمام میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے "اسلامی تہذیب" پر ایک مقالہ پڑھا۔ مجیب صاحب تصوفانہ خیالات کو جدید انداز میں پیش کرتے ہیں، کوئی اور موضوع ہو اس میں بھی آپ کا یہ رنگ نظر آتا ہے۔ آپ کا اپنا خاص انداز ہے جو حاضرین کو سوچنے کی طرف مائل کرتا ہے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر اشرف صاحب مشہور لیڈر اور جامعہ کے سابق طالب علم جامعہ میں آئے ہوئے تھے۔ انجمن اتحاد والوں نے "سیاسیات" پر آپ سے کئی تقریریں

کرائیں۔ اشرف صاحب کی معلومات سے حاضرین کو بہت کچھ مل جاتا تھا۔ آپ کی پُر زور اور مُدلّل تقریر سے حاضرین متاثر ہوتے تھے۔

۱۹۴۰ء تک ہم نے دو قسطوں میں انجمن اتحاد کے نائب صدر کی فہرست درج کی ہے۔ اس کے بعد کے نائب صدر بالترتیب محمد نسیم خاں صاحب، آزاد رسول صاحب، شمس الرحمٰن صاحب، رحیم الدین خاں صاحب، محمد عرفان بیگ صاحب نوری ہیں۔ جوبلی کے زمانے میں تقی احمد سید صاحب نائب صدر تھے۔

گذشتہ سال حکومت ہند نے جامعہ میں ایک کمیٹی بھیجی تھی کہ وہ جامعہ کے کاموں کو دیکھ کر یہ بتائے کہ آیا یہاں کی سندات تسلیم کی جاسکتی ہیں؟ کمیٹی کی رپورٹ ہر طرح پر قابلِ اطمینان تھی، حکومت نے اپنے مراسلہ نمبر ایف ۵۷-۱۶/۴۳/۴۳-ای۔ گورنمنٹ آف انڈیا، محکمہ تعلیم، حفظانِ صحت و آراضیات شملہ، مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۵ء کے ذریعہ جامعہ کی سندوں کو تسلیم کرلیا۔

اس سال جامعہ والوں کو ایک صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ مولانا عبید اللہ سندھی جنھوں نے جامعہ کو اپنا مسکن بنایا تھا مختصر علالت کے بعد اپنے آبائی وطن سندھ میں انتقال فرما گئے۔

جامعہ کا ایک اور سرپرست جس سے جامعہ والوں کو ڈھارس تھی چل بسا۔ مولانا نے جامعہ میں بیت الحکمت کے نام سے ایک ادارے کی ابتدا کی تھی، کام ابتدائی حالت میں تھا، چند طالب علم اور اساتذہ آپ سے استفادہ کر رہے تھے، اتنے میں مولانا اپنے وطن سندھ تشریف لے گئے، وہیں یہ سانحہ پیش آیا۔ ایک جامعہ ہی کیا مسلمانوں کا، ہندوستان کا ایک مجاہد چل بسا۔ آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لئے انقلاب لانا چاہا۔ حکومت نے آپ کو جلا وطن کر دیا۔ ایک مدت کے بعد پھر آپ ہندوستان آئے تھے اور جامعہ والوں کو فیض پہنچا رہے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفے کی

تفسیران کا خاص حصّہ تھا۔

اس سال کے مہمانوں میں نواب دین یار جنگ بہادر، مسز نائیڈو، سردار اورنگ زیب خاں وزیر اعظم صوبہ سرحد، سیٹھ حسین بھائی لال جی، غلام محمد صاحب وزیر مالیات ریاست حیدر آباد، حسن محمد حیات سابق مسجّل جامعہ خاص ہیں۔

غلام محمد صاحب وزیر مالیات حیدر آباد کے ۱۹۴۰ء میں عصرانہ دیا گیا تھا۔ آپ نے بچّوں کے لئے ۵۰۰ روپئے مرحمت فرمائے۔ آپ ہی کی کوششوں سے ریاست نے بڑھتی ہوئی گرانی کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ماہوار امداد میں اضافہ کر دیا تھا۔

اس سال کے خاص عطیوں کا ذکر کیا کریں۔ جامعہ کے ہمدردوں نے اپنے ماہوار گراں قدر عطیوں سے اتنا نوازا کہ گذشتہ سال کے ریکارڈ پیچھے رہ گئے۔ صوبے وار تفصیل اس طرح ہے۔ (اگست ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۴ء)

۱۔ یو۔ پی (صوبجات متحدہ)	۱۷,۷۵۸ — ۱۳ — ۰
۲۔ پنجاب و کشمیر	۱۱,۸۴۰ — ۱۰ — ۰
۳۔ حیدر آباد (دکن)	۱۱,۲۶۵ — ۵ — ۳
۴۔ دہلی	۱۰,۷۳۹ — ۶ — ۰
۵۔ راجپوتانہ و سنٹرل انڈیا	۵,۰۹۲ — ۰ — ۰
۶۔ بنگال	۳,۲۵۷ — ۰ — ۰
۷۔ بمبئی	۳,۲۳۷ — ۲ — ۰
۸۔ سندھ	۱,۳۴۱ — ۸ — ۰
۹۔ سرحد (علاوہ ایک مشین اردو ٹائپ مالیتی ۵۰۰ روپے)	۸۲۹ — ۰ — ۰
۱۰۔ مدراس	۶۱۳ — ۸ — ۰

۱۱- سی۔ پی۔ و برار	۵۴۷-۱۴-۰
۱۲- بیرون ہند	۴۹۲-۸-۰
۱۳- بہار	۱۷۸-۰-۰
۱۴- بلوچستان	۶۶-۰-۰

میزان کل۔ ۶۷،۰۲۸-۱۰-۳

اس رقم میں سے دفتر ہمدردان جامعہ نے اپنے اخراجات نکال کر جامعہ کو ۹۱۶ ۸۴ روپے، ۷ آنے، ۳ پائی دئے۔ ۲۳۲۵ روپیوں کا مکان خریدا۔ باقی رقم بنک میں جمع رکھی۔

نوٹ :- جامعہ نے اپنے میزانیئے میں ہمدردان جامعہ سے ملنے والی جتنی متوقع رقم رکھی تھی اُس سے کہیں زیادہ رقم ملی۔ حسابی نقطۂ نظر سے یہ بات بھی صاف کردیں کہ گذشتہ سال کی کہانی میں جو میزانیہ ہم نے درج کیا ہے وہ تخمینہ تھا اور اُسی سال ہمدردان جامعہ کو جو رقم ملی وہ سال ختم ہونے کے بعد وصول شدہ رقموں کو ظاہر کرتی ہے۔

اب جب کہ جوبلی کا سال شروع ہونے والا ہے۔ ہم یہاں گذشتہ سالوں کی مجموعی رقم درج کرتے ہیں کہ جامعہ کے ہمدردوں نے ہمیں سال بہ سال کس طرح نوازا۔

سنہ ۳۷-۳۸ء		۲۳،۳۲-۵-۱۰
سنہ ۳۸-۳۹ء	اگست تا جولائی	۲۱۶۴۹-۱-۶
سنہ ۳۹-۴۰ء	〃	۳۶۹۴۱-۱۴-۴
سنہ ۴۱-۴۲ء	〃 (دوسری جنگ کا آغاز)	۱۸۹۷۶-۱۰-۵
	〃	۳۲۶۰۸-۱۲-۶

سنہ ۴۲-۴۳ء " ٣٧٠٠٨ - ۴ - ٠

سنہ ۴۳-۴۴ء " ٦٧٠٢٨ - ١ - ٣

سنہ ۴۴-۴۵ء. اگست تا مارچ صرف ۸ ماہ کی آمدنی ۴١٠٢٢ - ١٠ - ٩

اس کے بعد سے مالی سال اپریل سے شروع ہونے لگا۔

مارچ تا اپریل سنہ ۴۵-۴٦ء ٦٧٢٨١٠ - ١٠ - ٣

نوٹ:۔ جوبلی کے سلسلے میں جو رقمیں آنے لگی تھیں وہ الگ ہیں جس کا ذکر جوبلی کے سلسلہ میں آئے گا۔

یوں "اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا" کے مطابق جامعہ کی زندگی کے پچیس سال پورے ہوئے۔ خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

اب یہاں سے جوبلی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

جشن سیمیں

(سلور جوبلی)

۲۶، اور ۲۷، واں سال

اگست ۱۹۴۵ء سے جولائی ۱۹۴۷ء

جب کسی ادارے کو قائم ہوئے ۲۵، ۵۰ یا ۶۰، برس ہو جائیں تو اس کی سالگرہ کا جشن علی الترتیب سلور جوبلی، گولڈن جوبلی، ڈائمنڈ جوبلی کے نام سے خاص اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ جامعہ کو قائم ہوئے پچیس سال ہو گئے تھے۔

جامعہ والوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ بھی جامعہ کی سلور جوبلی منائیں۔ اپنے ہمدردوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں جامعہ نگر میں جمع کریں اور انھیں یہ موقع دیں کہ جس پودے کو قوم کے بزرگوں نے بڑی آرزوؤں کے ساتھ سنہ ۱۹۲۰ء میں لگایا تھا اُسے پروان چڑھتے ہوئے دیکھیں۔

انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس سلسلہ میں، اپنے جلسہ منعقدہ یکم مارچ ۱۹۴۴ء میں حسب ذیل قرارداد منظور کی تھی۔

"انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رائے میں جامعہ کی ۲۵ سالہ جوبلی ضرور منانی چاہیئے اس کی تاریخ کے تعین اور پروگرام کے تیار کرنے کے لئے حسب ذیل اصحاب کی ایک کمیٹی

بنائی جاتی ہے جو اپنی رپورٹ آخر اپریل تک مجلس منتظمہ کو دے دے۔ اور مجلس منتظمہ کو ہدایت کرتی ہے کہ رپورٹ آنے کے بعد جلد از جلد پروگرام کے متعلق فیصلہ کرے اور اس کے انتظامات فوراً شروع کر دے اور مصارف کے لئے سال آئندہ کے بجٹ میں گنجائش رکھے۔

کمیٹی :-

شیخ الجامعہ	ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب
خازن جامعہ	پروفیسر محمد مجیب صاحب
مسجّل جامعہ	ارشاد الحق صاحب

عبدالغفّار صاحب مدہولی (داعی)

جوبلی کمیٹی نے اپنے جلسوں میں کچھ تجاویز مرتب کر کے، مجلس منتظمہ کے پاس منظوری کے لئے بھیجیں۔

مجلس منتظمہ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں ان تجویزوں کو منظور کیا ....

اور "مستقل مجلس جوبلی" کی تشکیل کر کے اسے ہدایت کی کہ وہ ضمنی کمیٹیاں بنائے اور مختلف کام ان کے سپرد کر دے۔ نیز جوبلی کا مکمل میزانیہ بنا کر منظوری کے لئے پیش کرے۔

"مستقل مجلس جوبلی" کے اراکین یہ تھے۔

۱۔ شیخ الجامعہ (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب) ۲ مسجّل (ارشاد الحق صاحب)
۳۔ ناظم ہمدردان جامعہ (حافظ فیاض احمد صاحب) ۴۔ عبدالغفّار مدہولی (داعی)

اسی جلسہ میں روپے کی فراہمی کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے اراکین شیخ الجامعہ ناظم ہمدردان جامعہ اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی تھے۔

اب ہمارے سامنے یہ کام تھے۔

۱۔ پرانے اور نئے تعلیمی منصوبوں، اور جامعہ کے مختلف شعبوں کی کارگزاری کے نقشے اور چارٹ وغیرہ تیار کرانا۔
۲۔ نشر واشاعت کی مہم۔
۳۔ جوبلی کے اخراجات اور آئندہ کے منصوبوں کے لئے روپئے کی فراہمی۔
۴۔ جامعہ اور آس پاس کے علاقے کو سنوارنے کا کام
۵۔ جوبلی کا پروگرام مرتب کرنا۔

"مستقل مجلس جوبلی" نے اپنا پہلا جلسہ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۴ء کو منعقد کر کے ابتدائی کمیٹی کی تجویزوں پر غور کیا اور انھیں مناسب ترمیم، اضافہ، اور تشریح کے ساتھ متعلقہ نگراں صاحبان کے پاس بھیجا کہ وہ ان پر عمل کریں۔

تمام شعبوں کی سرگرمیوں میں ربط قائم رکھنے اور نشر واشاعت کا کام انجام دینے کی غرض سے دفتر جوبلی کا قیام عمل میں آیا مجلس جوبلی کے داعی کو اس تنظیم کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ دفتر میں دو کارکن عبدالحفیظ صاحب ندوی اور مرزا احمد صاحب رکھے گئے۔

دفتر نے مارچ ۱۹۴۵ء سے "صحیفہ جوبلی" کے نام سے ماہوار قلمی رسالہ نکالا۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اس صحیفہ کے ذریعہ پہلی دفعہ جشن مسرت کا اعلان اس طرح فرمایا۔

"خدا کا بڑا احسان ہے کہ جامعہ کی عمر چند ماہ میں ۲۵ سال ہو جائے گی۔ دس پندرہ سال پہلے کسے امید تھی کہ ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا۔ اپنے کاموں کا جائزہ لینے اور انھیں آگے بڑھانے کے لئے انشاء اللہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ کی جوبلی منائی جائے گی۔

مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے سب کارکن اور طالب علم اسی وقت سے اس جشن کی تیاری میں لگ جائیں گے۔ جو کام تکمیل کے منتظر ہیں انھیں محنت سے مکمل کرلیں گے اور نئے کام جو شروع کرنے ہیں ان کو اچھی طرح سوچ کر شروع

کرنے کے منصوبے تیار کریں گے۔ خدا کرے یہ جشن جامعہ کے لئے ایک نئی زندگی کا پیام لائے۔"

جامعہ کے بہی خواہوں کے نام شیخ الجامعہ صاحب نے ایک خط بھجوایا جس میں آئندہ کے منصوبوں اور حوصلوں کا ذکر تھا اس کے ساتھ ایک فارم بھی منسلک تھا اس فارم میں چھوٹے بڑے کے لئے اپنی استعداد کے مطابق جامعہ کے کاموں میں مدد دینے کی مختلف صورتیں بتائی گئی تھیں۔

دفتر جوبلی (جامعہ)
جامعہ نگر دہلی
نمبر تاریخ

برادرم السلام علیکم۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کا وہ منظر آپ کی چشم تصور کے سامنے ہوگا جب خدا کے ایک برگزیدہ بندے نے خانۂ خدا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تھا اس واقعہ کو چوتھائی صدی گذر گئی، مسلمانوں کی قومی تحریک نے بڑے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت سے سیاسی اور تعلیمی ادارے بنے اور بگڑے، لیکن جامعہ ملیہ سخت مشکلوں اور آزمائشوں کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی زندگی میں آہستہ آہستہ جڑ پکڑتی رہی، اب اس نے اتنی قوت حاصل کر لی ہے کہ اس کی شاخیں دور دور تک پھیلیں اور سارے ملک پر چھا جائیں مگر اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جامعہ ملت اسلامی کے سامنے جائزہ دے کہ اس نے اب تک کیا کیا ہے اور اس سے ہدایت لے کہ آئندہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔

چنانچہ مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ آئندہ سال مارچ ۱۹۴۶ء میں جامعہ سلور جوبلی کے نام سے ایک جشن کیا جائے جس میں جامعہ کے قدیم طلبار

ہمدردان جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں
جمع ہوکر جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں، ان کی اصلاح
اور ترقی کی تدبیریں بتائیں اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع
کے لئے پیش کی جا رہی ہیں، غور فرمائیں کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا
جائے اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے ۔ اس سلسلہ میں خیال ہے
کہ علوم اسلامی کا ایک تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمت کے نام سے قائم کیا
جائے ۔ ایک کتب خانہ کے قیام کا انتظام ہو جس میں اسلام اور ہندوستان
سے متعلق تمام ضروری کتب کا ذخیرہ ہو، اعلیٰ پیمانہ پر ایک صنعتی مدرسہ کا
کام شروع کیا جائے اور ایک لڑکیوں کے مدرسہ کی بناء ڈالی جائے۔ ان
نئے اداروں کی عمارت کے علاوہ جامعہ کی نوآبادی کے لئے ایک جامع مسجد
کی تعمیر، نیز ایک شفاخانہ کا قیام، از بس ضروری ہے ۔ کاش یہ سب کام
جوبلی کے سلسلہ میں کم سے کم شروع تو ہو جائیں ۔ آپ کی توجہ سے کیا عجب
ہے کہ ہم سال بھر کے اندر اتنا سرمایہ فراہم کر لیں کہ ان کاموں کا آغاز ہو سکے ۔
آپ کو جو قلبی تعلق جامعہ ملیہ سے ہے اس کی بنیاد پر ہمیں یقین ہے کہ آپ
جشن جوبلی کو کامیاب بنانے میں ہر امکانی مدد دیں گے ۔ ملفوفہ فارم میں
کاموں کی فہرست درج ہے جن میں آپ کے اتحاد عمل کی ضرورت ہے
براہِ کرم اس کو غور سے پڑھ کر ان کاموں پر نشان کر دیجیے جن سے آپ کو
خاص دلچسپی ہے اور جن میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں اور اپنا اسم گرامی
اور آج کل کا صحیح مفصل پتہ درج فرما کر دفتر جوبلی میں بھیج دیجیے ۔ کسی چیز کے
متعلق مزید معلومات اور تفصیلات کی ضرورت ہو تو مطلع فرمائیے ۔ نیازمند

(ڈاکٹر) ذاکر حسین خاں ۔

بسم اللہ

جناب ناظم صاحب جوبلی (جامعہ)

وعلیکم السلام

یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ جامعہ کی جوبلی مارچ سنہ ۱۹۴۶ء میں منائی جائے گی۔ ذیل کے کاموں میں جن پر میں نے سا نشان لگا دیا ہے مدد دینے کی کوشش کروں گا۔ براہ کرم ان کے متعلق ضروری کاغذات میرے پاس بھجوا دیجئے اور میرے فائل نمبر سے مطلع فرمایئے تاکہ وقت ضرورت اس کا حوالہ دے سکوں۔

۱۔ جن نئے کاموں کا ذکر منسلکہ خط میں ہے ان میں سے کسی کام میں مدد دینا۔

۲۔ اس سلسلہ میں چندہ جمع کرنے میں مدد دینا۔

۳۔ پیام برادری کی توسیع کے لئے کوشش کرنا۔

۴۔ پیام تعلیم کے خریدار بنانا

۵۔ رسالہ جامعہ کے خریدار بنانا۔

۶۔ اُردو اکادمی کے رکن بنانا۔

۷۔ جوبلی سے ایک مہینے پہلے جامعہ میں حاضر ہو کر اس کے انتظامی کاموں میں مدد دینا

۸۔ جامعہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو جوبلی میں شرکت کے لئے آمادہ کرنا

۱۱۔ دیگر کاموں میں مدد دینا جن کی اطلاع آپ مجھے دیں گے۔

۹۔ ہمدردان جامعہ کے رکن بنانا۔

جوبلی کے سلسلہ میں میرا مشورہ پشت پر درج ہے۔

میرا آج کل پتہ یہ ہے، میرے فائل میں اسے درج کر لیجئے۔

پتہ کی جگہ ____________________

____

____

جامعہ کا خیر خواہ

اس طرح جامعہ کے بہی خواہوں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔
صحیفۂ جوبلی میں جوبلی سے متعلق جامعہ کی اندرونی تنظیم میں مدد دینے اور کارکنوں کو سرگرم عمل رکھنے کے لئے کئی مستقل سرخیاں قائم کی گئی تھیں مثلاً

۱۔ جامعہ والوں سے — اس کے تحت مشہور رہنما اور بزرگوں کے پیغامات درج کئے جاتے تھے۔
۲۔ میں جامعہ کیوں آیا — اس میں طالب علموں کے تاثرات درج ہوتے تھے۔
۳۔ جامعہ دوسروں کی نظر میں — یہاں اخبارات اور اشخاص کی رائیں درج ہوتی تھیں۔
۴۔ طلباء قدیم کی ڈائرکٹری
۵۔ چندہ جمع کرنے والے وفد
۶۔ جوبلی کے پروجکٹ
۷۔ جوبلی کی تیاریاں
۸۔ وقت سے تعلق رکھنے والے مضامین وغیرہ

عنوان نمبر ۱ کی ابتدا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے پیغام سے شروع کی گئی تھی۔ یہ یہاں درج ہے۔

" جامعہ کے ساتھیو اور عزیزو
میں پچھلے دنوں کچھ دوسرے کاموں میں مصروف رہا، کچھ بیمار سا رہا۔

اس لئے جامعہ کے کام میں اس طرح نہ لگا جیسا کہ اس کا حق تھے۔ اب جامعہ کی جوبلی کے سلسلے میں باہر جاتا ہوں سوچتا ہوں کہ جوبلی کے منصوبوں کے سلسلے میں لوگوں سے ملوں یا ان سے مدد چاہوں۔ اس مہم میں سب سے بڑی مدد آپ مجھے دے سکتے ہیں۔ جب مجھے اطمینان ہوتا ہے کہ جامعہ میں سب کام ٹھیک چل رہے ہیں، سب لوگ اپنی اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں مشکل وقت کو سب مل جل کر ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں اور کبھی خدانخواستہ روپیہ پیسہ کی کمی کے باعث کچھ ترشی پیدا بھی ہو جائے تو جلد ہی رفع ہو جاتی ہے تو میرا دل بہت مضبوط ہوتا ہے اور میں دوسروں کے ساتھ اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتا ہوں اور جامعہ کے کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ یہ نہیں ہوتا تو میں خود اعتماد سے کسی کو ادھر متوجہ نہیں کر سکتا۔ میں آپ سے یہ اعتماد مانگتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری مدد میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ جوبلی کے اس سال سب کے سب اپنے اپنے کام میں دل و جان سے لگ جایئے۔ اور قوم کو دکھا دیجئے کہ کام کیسے عبادت بن جاتا ہے۔"

پیغامات کا یہ سلسلہ جو بزرگان جامعہ اور رہبران قوم کے پیاموں پر مشتمل تھا جشن جوبلی تک برابر جاری رہا۔ باہر کے حضرات کے پیغامات ہم آگے کہیں نقل کریں گے یہاں پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، مولانا اسلم صاحب کے پیام درج ہیں۔

"پہاڑوں پر چڑھنے والا دور سے کسی چوٹی کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں نیا شوق، بدن میں ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ دشواریوں اور خطروں کے خیال سے اپنی ہمت کو بڑھاتا ہے، نظر کو بلندی پر جما کر اپنے آپ کو اوپر پہنچانے کی کوشش کرتا ہے جیسے لوگ رسی کو پکڑ کر اوپر چڑھتے ہیں، جامعہ کی

جوبلی کے منصوبے کو وہ پیمانی کے ارادے میں اور ہماری جماعت میں ان ارادوں کو پورا کرنے کا حوصلہ عام ہو گیا ہے۔ اپنے تعلیمی منصوبوں پر عمل کرنے میں ہم کو جتنی کامیابی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا بے جا نہیں ہے کہ ہم اس منزل پر پہنچ کر دم لیں گے جو ہم نے مقرر کی ہے۔ کسی بیچ کی منزل پر تھک کر نہ بیٹھ جائیں گے خدا ہمیں صحیح طریقے پر کام کرنے کی توفیق دے اور تندرست و مستعد رکھے۔

(محمد مجیب) "

"اس موقع پر جب جامعہ کی زندگی کے پچیس سال ختم ہیں ہمارے دلوں میں قدرتی پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے اتنے دلوں میں کیا کیا ہے اور اب ہمیں کیا کرنا ہے۔؟

انسان کے لئے خود اپنے کاموں کا صحیح محاسبہ کرنا سب سے مشکل کام ہے ایک طرف افتخار کا جوش، اس کی سعی و عمل کے نتائج کو بڑھا کر پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف انکسار کا جذبہ انھیں گھٹا کر دکھانا چاہتا ہے۔ اس مد و جزر کے درمیان کی حقیقت کی سطح پانے کے لئے اپنے کو غیر بنا کر معروضی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کی کوشش کی تو مجھے جامعہ کی چوتھائی صدی کی زندگی کا ماحصل یہ نظر آیا۔

(۱) مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت کا بنایا ہوا تعلیمی نظام ان کی حیات ملی کی تشکیل میں مدد نہیں دیتا بلکہ رکاوٹ ڈالتا ہے۔ انھیں اپنی تعلیمی عمارت خود بنانی ہے اور کم و بیش اسی نقشہ کے مطابق جو جامعہ ملیہ نے پیش کیا ہے۔

(۲) حکومت یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے کہ مسلمانوں کو بغیر اس کی مداخلت کے اپنے بچوں کو اپنی اجتماعی مصلحتوں کے مطابق تعلیم دینے کا حق حاصل ہے۔

(۳) دنیا پر ثابت ہو گیا ہے کہ مسلمان بھی قومی خدمت کے لئے ایثار کر سکتے ہیں اور صبر و استقلال کے ساتھ تعمیری کام انجام دے سکتے ہیں کتنا بڑا کام ہے جو جامعہ نے کر دکھایا۔

مگر جو کچھ جامعہ کو کرنا ہے اس کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو اس نے صرف زمین تیار کی ہے اور ایک چھوٹی سی کیاری میں پود لگائی ہے۔ اب اس کو اس پودے تعلیم ملی کا عظیم الشان باغ لگانا ہے۔ اگر سوچئے کہ اس کے لئے کتنا وقت، کتنے وسائل، کتنی محنت چاہیئے تو جی ڈوبنے لگتا ہے لیکن اگر اس کا خیال کیجئے کہ اچھے آغاز کو انجام تک نیک سعی کو تمام تک پہنچانے کا وعدہ اس خدا نے کیا ہے جس کی قوت و قدرت کی کوئی انتہا نہیں تو دل کے سوتوں سے اُمید کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔

(ڈاکٹر) سید عابد حسین۔

جامعہ ملیہ نے جب سے جنم لیا اس وقت سے یہ ابتلا اور آزمائش میں گرفتار ہوگئی، پھر زیادہ زمانہ نہ گذرنے پایا کہ افلاس اور غربت سے اس کو دوچار ہونا پڑا۔ علی گڈھ سے دہلی میں منتقل ہونے کے بعد ہی حکیم اجمل خاں مرحوم مسیح الملک کی وفات سے جنھوں نے اس کی سرپرستی اپنے ذمہ لی تھی یہ بالکل یتیم ہوگئی لیکن باوجود ان سب مصائب کے اس کے کارکنوں نے صبر اور ہمت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا بلکہ ان مصائب کے دور نے ان کے حوصلوں اور امنگوں میں بجائے کمی کرنے کے اور زیادتی کی انھوں نے سختیاں اور مصیبتیں جھیلیں لیکن جو مقصد ان کے سامنے تھا اس کی طرف پورے عزم اور ارادے کے ساتھ بڑھتے ہی رہے جس کا ایک بہت بڑا انعام ان کو یہ ملا کہ پوری جماعت کی جماعت ہم خیال اور ہم آہنگ ہوگئی اور یہ وہ چیز ہے جس کے سامنے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

اب اللہ کے فضل سے جامعہ کے قیام کو پچیس سال ہو گئے۔ ہماری مشکلیں بھی رفتہ رفتہ آسان ہونے لگیں ہمارے سامنے جو مقصد، ہمارا مطمح نظر زیادہ صاف اور واضح نظر آنے لگا اور ہم اپنی اس پچیس سالہ کارگذاری کا جائزہ لینے اور آئندہ کے واسطے ایک بڑا لائحہ عمل بنانے کے لئے اس کی جوبلی منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس وقت ہمیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ ہماری گذشتہ یا آئندہ کوششوں کی کامیابیوں کا بہت کچھ دارومدار ہم خیالی، ہم آہنگی اور وحدت عمل پر ہے اور یہ چیز اس وقت تک ہم میں رہے گی جب تک ہم اپنے عزائم اور مقاصد میں مخلص رہیں گے۔

اس لئے میں جامعہ کے کارکنوں، بزرگوں اور عزیزوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اللہ کی اس عظیم الشان نعمت یعنی اخلاص کی قدر کریں۔ باہمی

رواداری اور ہمدردی سے جس طرح آج تک ہم نے اپنے اجتماعی مقصد کو سامنے رکھا ہے اور متفق ہو کر اس کی طرف قدم بڑھاتے رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی اتفاق اور اتحاد ہی کے ساتھ کام کریں۔ کیونکہ آسمانی امداد اور انسانی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔

اسلم جیراج پوری

جوبلی کی تیاریاں جاری تھیں کہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کی تاریخ قریب آئی۔ بعض وجوہ سے یہ جشن منانے کے لئے مارچ ۱۹۴۶ء کی کچھ تاریخیں مقرر ہوئی تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ اس زمانے میں انتخابات کا ہنگامہ ہوگا۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ یہ جشن ۱۹۴۶ء کے آخر میں ۱۵ر سے ۱۸ر نومبر تک منایا جائے۔

۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب یونسکو کی کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہوئے تھے۔ آپ نے ۲۴ر اکتوبر کو جہاز سے ایک خط میرے نام بھیجا جس میں ۲۹ر اکتوبر کے اس خاص موقع کے لئے جامعہ والوں کے نام ایک پیام تھا۔ خط اور پیام کی نقل درج ہے۔

"غفار صاحب السلام علیکم۔

میں چاہتا تھا کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے صحیفہ جوبلی کے لئے آپ کو ایک تحریر بھیجوں جو آپ جامعہ کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر صحیفہ میں شائع فرما سکیں لیکن آپ کو معلوم ہے چلتے وقت کس طرح اللہ کاموں میں پھنسا رہا اور یہ تحریر نہ بھیج سکا۔ راستے سے یہ خط لکھ رہا ہوں خدا کرے ۲۹ر اکتوبر سے پہلے آپ کو مل جائے۔

پچیس برس گزر گئے۔ (یہ سرخی صحیفے نے قائم کی تھی)

" جامعہ کی پچیسویں سالگرہ! کیا کیا خیال، کس کس کی یاد، کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں اور کیسی کیسی ہمت افزا حمایتیں، بے وفائیوں اور روفاداریوں کم ہمتی اور استقامت خاصی کٹھن راہ پر تھک کر تھم تھم جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے دے کر اس راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے گزر جاتی ہیں۔ جامعہ کی پچیسویں سالگرہ اس کے ذکر سے آپ سب کے ذہن میں بھی ایسی ہی تصویریں آئیں گی۔ اگر ہم انھیں خیالات پر معاملہ کو ختم کر دیں تو سب کچھ یوں ہی ہوتا رہے گا جیسا ہو رہا ہے۔ ہمارے ارادہ کا اس میں دخل روز بروز کم ہوتا جائے گا۔ بہت سے دوسرے اداروں کی طرح جامعہ بھی اس لئے چلتی رہے گی کہ کسی کو بند کرنے کا خیال نہ آئے گا اور چلتی ہوئی چیز کا قاعدہ ہے کہ کوئی مانع حالات یا ارادہ راہ میں نہ آئے تو چلتی ہی رہتی ہے جامعہ والوں کو جامعہ کے ایسے ہی چلتے رہنے پر راضی نہ ہونا چاہیئے! ہمیں چاہیئے کہ ہم اس پچیسویں سالگرہ کو تعمیری تنقید اور محکم عزم کے ساتھ ایک موقع بنا دیں۔

پچیس برس۔ لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ۲۵ سال کیا ہوتے ہیں۔ ہاں سوتی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی بغیر کسی قابل ذکر تغیر کے ساتھ گزر جاتی ہیں۔ جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے ان کے لئے پچیس سال بھی بہت ہوتے ہیں۔ پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رُخ بدل لیتی ہیں، قومیں اپنی اعتباری حیثیت کو بدل لیتی ہیں، رحمت بن جاتی ہیں، عذاب بن جاتی ہیں۔ ہم نے اپنے کام سے مزاج قومی کو متاثر کیا! زندگی کے کسی شعبے میں اس کی فکر یا سعی کو بدلا! اپنے وجود ملی کو استحکام بخشا۔ دوسری قوموں میں حیثیت کو بلند کرنے، رحمت

بننے، عذاب بننے کا ذکر ہی کیا ہے۔ اسے سوچنا چاہئے مایوس ہونے کے لئے نہیں بلکہ مشکلوں کو اور مجبوریوں کو سمجھنے، ان پہ غالب آنے کے وسائل سوچنے، اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنے اور ہمت سے آگے قدم بڑھانے کے لئے۔ پچیس برس اور اتنا سا کام۔ ہاں بہت کم کام ہے، بہت معمولی کام ہے، بظاہر بہت بے اثر سا کام ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے کاموں کا بیج ہے جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا یکجا ہونا۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو سہارا دے کر اسے طے بھی کر لیتے ہیں، کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

من از طریق نہ گویم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق،

جہاں پچیس مہینے مل کر کام کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف اور بے سروسامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں ہے، اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بے شک نہیں اور نہ یہ خیال دل میں لانا چاہئے کہ اوروں سے بھی تو کچھ بہت بن نہیں پڑا، دوسرے کی کم معیاری کو اپنے لئے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی اور پست نظری کی بات ہے۔ لیکن مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ رفیقان راہ سے اس پچیسویں سالگرہ پر یہ درخواست ہے کہ اب طریق کے تعین میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اپنی سعی کو زیادہ موثر بنانے میں لگ جائیں۔ یکسوئی اور دیانت سے کام میں جمے رہئے اور اس پر رنج نہ کیجئے کہ بہت وقت گذر گیا آدمی اپنا فرض ادا کرتا رہے اور دامن امید کو ہاتھ سے نہ جانے

دے۔

طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گا ہے۔

ذاکر حسین ؔ

آئندہ کے منصوبے مختلف کتابچوں کی صورت میں چھپوا کر ہمدردان جامعہ کے نام بھیجے گئے چندہ وصول کرنے والوں نے لوگوں کی خدمت میں پیش کیے جن سے جامعہ کے کاموں اور ضرورتوں کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ان کے نام یہ ہیں:-

۱۔ جامعہ ملیہ کیا ہے ۲۔ بیت الحکمتہ
۳۔ صنعتی مدرسہ ۴۔ کنڈر گارٹن
۵۔ مسجد جامعہ نگر ۶۔ انصاری شفاخانہ

جامعہ کی اشاعت کے سلسلے میں اس کے مقاصد کو واضح کرنے کی ضرورت تھی۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے "جامعہ ملیہ کیا ہے" کے عنوان سے جو کتابچہ خود ہی تحریر کیا تھا اس میں ان مقاصد کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

"جامعہ ملیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کرے جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ مذہب کی سچی تعلیم، ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی، اور ہندوستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال معلوم ہوتا ہے مگر دنیا کی تاریخ میں بہت سے شیخ چلی ایسے ہی خواب

دیکھتے آئے ہیں اور ہمت و خلوص، محنت اور استقلال کی برکت سے ان کے خواب حقیقت کا جامہ پہنتے رہے ہیں۔ اگر ہم میں یہ صفات تھوڑی بہت بھی موجود ہیں تو ہمارا یہ خواب بھی سچا ہو کر رہے گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ جامعہ کے کارکنوں کے ذہن میں یہ نقشہ ابھی دھندلا ہے اور اسے واضح اور معین کرنے کے لئے وہ دوسروں کے مشورے اور اپنے مشاہدے اور تجربے سے مدد لے رہے ہیں۔ راہ طلب میں بھٹکنا، ٹھوکریں کھانا اور سنبھلنا، غلطی کرنا اور سیکھنا یہی انسانی ترقی کا راز ہے۔

جامعہ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ زندگی کے اس نقشے کو سامنے رکھ کر ان کی تعلیم کا ایک مکمل نصاب بنائے اور اس کے مطابق ان کے بچوں کو جو مستقبل کے مالک ہیں تعلیم دے۔ علم محض روزی کمانے کے خاطر جو ہمارے ملک کی جدید تعلیم کا اصول ہے اور علم محض علم کی خاطر جو قدیم تعلیم کا اصول تھا دونوں کو بہت تنگ اور محدود سمجھتی ہے وہ علم زندگی کی خاطر سکھانا چاہتی ہے جس کے وسیع دائرے میں مذہب حکمت اور صنعت سیاست اور معیشت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ وہ اپنے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہتی ہے کہ قومی تہذیب اور عام انسانی تہذیب کی ہر شاخ کی قدر و قیمت کو سمجھ سکیں اور اپنی قابلیت کے مطابق اس کی کسی ایک شاخ میں اس طرح سے کام کریں کہ ان کا کام کسی نہ کسی حد تک مجموعی زندگی کے لئے مفید ہو۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہندوستان میں اس وقت روزی کمانے کا سوال سب سے زیادہ ضروری ہے۔ جامعہ ملیہ اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اپنے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کرنا چاہتی ہے کہ ہر جائز طریقہ سے روزی کما سکیں مگر اس کا اصول یہ ہے کہ انسان روزی کو زندگی کا، اجرت کو

خدمت کا تابع سمجھے اور اپنا اصل مقصد یہ جانے کہ قومی تہذیب اور انسانی تہذیب کا مفید رکن بنے یعنی سوسائٹی میں اپنے لئے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈ لے جہاں وہ اپنی قوتوں سے پورا کام لے سکتا ہو اور مفید خدمت کر سکتا ہو۔ اور اسی کے ساتھ اتنا کما سکتا ہو کہ اس کی اور اس کے خاندان کی سب ضرورتیں پوری ہو جائیں خدا ہمیں ان ارادوں پر قائم رکھے آمین۔"

ارشاد الحق صاحب مستجل کی نگرانی میں شمس الرحمٰن صاحب نے مختصر تاریخ اور دستور العمل جامعہ کے نام سے ایک کتاب تیار کی جسے دفتر مسجل نے جوبلی سے پہلے شائع کیا، اس میں جامعہ کے قیام کا پس منظر، اس کی مختصر تاریخ اور جامعہ کے تعلیمی اور انتظامی اداروں کا حال درج ہے۔ جامعہ کے آئندہ کے منصوبے بھی ہیں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۶ء جوبلی تک جامعہ کے گریجویٹس (فارغ التحصیل) کی فہرست ہے۔ بیسک ٹرینڈ .... طلباء کے نام بھی ہیں۔ اس بات کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ جامعہ کے سابق طلبہ کا ذکر آجائے جو یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کام کر رہے ہیں۔

جو کمیٹی چندوں کی فراہمی کے لئے بنائی گئی تھی اس نے پورے ہندوستان میں دفود بھیجنے کا ایک پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ مختلف مقامات پر جامعہ کے کاموں کی نمائش کی جائے اور لٹریچر تقسیم کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ جامعہ کے مقاصد اور عزائم سے واقف ہو جائیں۔ اس کی ابتدا بمبئی سے کی گئی جہاں شیخ الجامعہ صاحب چند کارکنوں کے ساتھ خود ہی تشریف لے گئے تھے۔ اختصار کی خاطر ہم صرف بمبئی کے ایک جلسہ کا ذکر کرتے ہیں، جہاں جامعہ کی طرف سے نمائش ہوئی تھی، بمبئی کے اخباروں نے جامعہ پر مضامین لکھے تھے، بمبئی اور شہر کے لوگوں نے جامعہ والوں کے لئے خیر مقدم کا جلسہ کیا تھا اور جلسہ کے انعقاد تک

جتنی رقم وصول ہوئی تھی وہ شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تھی، بمبئی کے روزنامہ اخبار "اجمل" مورخہ ۱۰ ۔ اپریل ۱۹۴۵ء کی اشاعت سے یہ کارروائی ہم یہاں درج کرتے ہیں :-

• جلسے کا افتتاح تلاوت کلام مجید سے ہوا۔ سیف طیب جی صاحب نے مسٹر ابو بھائی جسدن والا کی صدارت کی تحریک پیش کی۔ مسٹر جسدن والا نے اپنی تقریر میں جامعہ کے تعلیمی کارناموں کو سراہا اور کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقاء مسلمانوں کی جو تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں وہ تعریف و توصیف سے بالاتر ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان خدمات کی قدر کریں اور اس کا اعتراف جامعہ کی مالی امداد سے کریں۔ بمبئی سے ہمیشہ ہر نیک کام کے لئے روپیہ ملتا ہے۔ یہ بمبئی کی عزت افزائی ہے کہ شیخ الجامعہ صاحب نے اس کام کو ہمارے شہر سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میری رائے میں جامعہ جوبلی کے چندے کی کسی رقم کا تعین نہ کرنا چاہیئے، ہمیں چاہیئے اس کام میں زیادہ سے زیادہ روپیہ دیں۔ ہم جتنا روپیہ بھی اس کام کے لئے جمع کرسکیں کم ہوگا۔ جو کام جامعہ ملیہ مسلمانوں کے لئے کررہی ہے اس کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی اور ایسے اچھے کام کو جاری رکھنا اور آگے بڑھانا ہر مسلمان کا فرض ہے مسلمانوں کے اور اس ملک کے مستقبل کے لئے سب سے اہم چیز تعلیم اور وہ بھی صحیح قسم کی تعلیم ہے اور یہ مقصد جامعہ جیسے اداروں ہی سے پورا ہوسکتا ہے مجھے یقین ہے کہ اہل بمبئی اس کام میں پوری فراخ دلی سے حصہ لیں گے۔

صدر کی تقریر کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ایک بہت موثر اور درد بھری تقریر کی۔ آپ نے کہا "اگر ہماری قوم میں جان ہے تو اسے ضرور میرے ساتھیوں کے کام کی قدر کرنی چاہیئے۔ جامعہ پر اس سے قبل بڑے نازک وقت گزر چکے ہیں خاص کر وہ وقت جب ہمارے سرپرست حکیم اجمل خاں مرحوم کا انتقال ہوا میں نے اس وقت اپنی قوم کے تمام اکابر سے دریافت کیا تھا کہ وہ مجھے مشورہ دیں کہ وہ جامعہ کو چلانے کی ذمہ داری اٹھانا

چاہتے ہیں یا نہیں اور یہ بڑے ہی شرم و ندامت کی بات ہے کہ مجھے ان سب نے یہی جواب دیا کہ یہ کام نہیں چل سکتا۔ اسے بند کر دیا جائے مگر اسی کے ساتھ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی دریافت کیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان سب نے یہ کہا کہ جامعہ کو چلایا جائے اور ضرور چلایا جائے چنانچہ اسی جماعت نے جس کے ممبر یہ عہد کرتے ہیں کہ کم از کم بیس سال جامعہ کی خدمت کریں گے اور کبھی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ لیں گے۔ اس کام کو چلایا اور اتنا بڑھایا کہ اب جامعہ کے پاس لاکھوں روپیہ کی عمارتیں ہیں چار سو بیگھہ کے قریب زمین ہے اور دوسرا ساز و سامان ہے جس کی مالیت کا اندازہ پندرہ لاکھ تک کا ہے۔

مسلمانوں نے اپنی قوم کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی ہے۔ سر سید مرحوم نے جو بڑا کام شروع کیا تھا اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ قوم کے ایک بہت ہی محدود طبقے کو تعلیم دی جائے اور وہ بھی ایسی تعلیم جس سے اس طبقے کو نوکریاں مل جائیں۔ یہ بڑے ہی افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ پوری قوم کی ستر سال کی تعلیمی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہو۔"

جامعہ کے کاموں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "جامعہ پوری آزادی کے ساتھ تعلیمی تجربات میں مصروف ہے اور اس کا مقصد ایک ایسی تعلیمی تحریک ملک میں پھیلانا ہے جو مسلمانوں کے سواد اعظم کو جہالت سے نکال کر علم کی روشنی میں لا سکے ہماری بدقسمتی سے ہم نے تعلیم کے کسی شعبے میں کبھی کسی اچھے کام کا نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ جامعہ ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم ہر ایک میدان میں تجربات کر رہی ہے اور اس کے کارکن پورے پچیس سال سے انتہائی خلوص اور یکسوئی سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ جوبلی کے موقعہ پر اپنے کاموں کو اور پھیلائیں اور چند نئے کام بھی شروع کریں۔ یہ کام اسی طرح ممکن ہیں کہ مسلمان ان کاموں میں امداد کریں۔

جامعہ کے کارکنوں نے اپنے کام سے اس بات کا استحقاق پیدا کر لیا ہے کہ وہ قوم سے مطالبہ کریں کہ وہ ان کے کام کی قدر کرے اگر قوم نے اس کا جواب خاطر خواہ نہ دیا تو پھر مسلمانوں میں ایسے نوجوان پُر خلوص طریقے سے قومی کاموں میں لگ جائیں کیسے پیدا ہوں گے؟

ڈاکٹر صاحب نے حاضرین سے جامعہ کی امداد کی پرزور اپیل کی۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد سید نجیب اشرف صاحب ندوی، حاجی نور محمد صاحب اور مسٹر محمد علی سکلائی نے تقریریں کیں جن میں جامعہ کے کام کا حاضرین سے تعارف کرایا اور امداد کی اپیل کی۔

ان تقریروں کے بعد ان چندوں کا اعلان کیا گیا جو اب تک پیش کئے جا چکے ہیں اور جن میں ابھی مزید اضافہ کی قوی توقع ہے۔

ڈاکٹر اشرف صاحب نے صدر اور حاضرین کے شکریہ کی تجویز پیش کی جس کی تائید ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب نے کی اور پھر جلسہ ختم ہوا۔ چندے کی کل رقم ساٹھ ہزار سے اوپر ہوئی ہے۔ ان اعلانات کو سن کر حاضرین میں سے اوروں نے چندہ لکھوانا شروع کیا اور تھوڑی دیر میں اس چندے کی رقم دس ہزار تک جا پہنچی۔ اس طرح اب تک جامعہ کے لئے کل چندہ بمبئی میں ۷۰ ہزار تک ہو گیا ہے۔

جب سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ جوبلی کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لے گئے تھے اس وقت سے ان کی سرگرمیوں کے متعلق دوسرے تیسرے روز خبریں آتی رہتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ جامعہ کے کاموں کو دیکھنے کی غرض سے ڈاکٹر صاحب ہفتہ عشرہ کے لئے، دہلی کو تشریف لا رہے ہیں۔ اس سے جامعہ کے تمام طلبہ اور کارکنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ ان کی تشریف آوری کے بعد ان سے بمبئی کے حالات سننے اور انھیں ان کی کامیابی پر مبارکباد دینے کے لئے جوبلی کمیٹی کے اہتمام میں تمام جامعہ

والوں کا ایک عام جلسہ ہوا۔

تلاوت قرآن شریف کے بعد ایک ننھے بچے نے ڈاکٹر صاحب کے گلے میں ہار ڈالے پھر ایک نے اس طرح خطاب کیا۔

"اچھے شیخ الجامعہ صاحب

آپ بمبئی میں جوبلی کا چندہ جمع کرنے کے لئے تشریف لے گئے اور ہم جامعہ میں جوبلی کا کام کرتے رہے۔ اس عرصہ میں ہم نے جو کچھ کیا اُس کی تفصیل "صحیفۂ جوبلی" سے معلوم ہو جائے گی جو ہم آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ آپ نے بمبئی میں بہت اچھا کام کیا ہے۔ اگر ہمیں بمبئی کے کچھ حالات بتائیں تو بڑی خوشی ہو گی۔"

اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ساتھیو اور عزیزو! چونکہ میں پہلی بار جوبلی کا چندہ جمع کرنے کے لئے بمبئی گیا تھا اس لئے غالباً آپ نے یہ جلسہ کیا ہے۔ بمبئی میں اس وقت تک ساڑھے ۷۷ ہزار روپے وصول ہو چکے ہیں۔ یہ رقم صرف دو سو آدمیوں کی ہے۔ ابھی بمبئی میں کام کی بہت گنجائش ہے۔ مجھے نواب صاحب رام پور نے یاد فرمایا ہے اس لئے دو روز کے لئے جا رہا ہوں وہاں سے واپس آ کر پھر بمبئی جاؤں گا اور مئی کے آخر تک وہاں رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ایک لاکھ سے زائد رقم بمبئی سے وصول ہو جائے گی۔

بمبئی میں اخبارات نے ہماری بہت مدد کی جس کے لئے حارث صاحب نے بہت کاوش کی، جامعہ کے طلباء قدیم نے بھی بڑی تندہی سے کام کیا اور جامعہ سے دائمی لگاؤ اور انسیت کا ثبوت دیا۔ حارث صاحب کانگریس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف صاحب کمیونسٹ پارٹی سے اور ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب

لیگی جماعت ہے۔

ہمارے ان تینوں جامعی حضرات کا اپنی اپنی پارٹیوں پر کافی اثر ہے جس کی وجہ سے کام کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی۔

جامعہ کے ایک اولڈ بوائے طالب علم غلام محمد صاحب جسدن والا کے ہاں ملازم ہیں۔ جسدن والا مالدار آدمی ہیں ان پر ہمارے اس ہونہار طالب علم کا بہت اچھا اثر ہے۔ انہی کی بدولت جسدن والا تک رسائی ہو سکی جو جامعہ کے کاموں سے بہت متاثر ہوئے۔ خود پانچ ہزار روپیہ چندہ دیا اور اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ اپنے حلقۂ احباب سے زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے کی کوشش کریں گے آپ کو کھیلوں سے بھی بہت دلچسپی ہے چنانچہ آپ کے انتظام میں کرکٹ کلب لاکھوں کی آمد و خرچ سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے جسدن والا نے فرمایا کہ "جامعہ والے بھی اپنے کاموں میں اتنی کشش پیدا کر سکتے ہیں کہ وہاں ریل گاڑیاں، بسیں، موٹریں سب کچھ چلنے لگیں اور جامعہ ہزاروں لاکھوں کی توجہ کا مرکز بن جائے" بمبئی کا ماحول جامعہ کے لئے، ناساز گار رہا ہے۔ مخالفت اور غلط فہمی کا ایک سلسلہ تھا جو چلا جا رہا تھا میں زیادہ سے زیادہ پچیس ہزار روپیہ کی توقع لے کر گیا تھا۔ لیکن وہاں جا کر ملنے ملانے اور صحیح حالات سے آگاہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ بمبئی کے مسلمان جامعہ کے ہمدرد ہو گئے اور ایک لاکھ روپیہ فراہم ہو جانے کی توقع ہوگئی۔

آپ لوگوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ تقریباً یہ ساری رقم مسلمانوں نے دی ہے اس میں صرف پانچ ہزار کی رقم ایسی ہے جو دو ہندوؤں نے دی ہے۔ اگرچہ بعض پارسیوں اور دوسری قوموں کے افراد نے جامعہ کی امداد کی جانب میلان ظاہر کیا لیکن ان سے نہیں لیا گیا اس لئے کہ جامعہ ملیہ ایک اسلامی ادارہ ہے اور اس کی امداد بھی مسلمانوں ہی کی جانب سے ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے لئے یہ امر باعث ننگ و ملامت ہوگا کہ ایک

اسلامی ادارہ دوسری قوم کے افراد کے سرمایہ سے چلایا جائے۔ اگرچہ بمبئی کے مسلمانوں میں دارالعلوم اسکیم کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں لیکن ان پر مسلمانوں کی تعلیم کی اہمیت واضح ہونے کے بعد وہ رفع ہوگئیں۔ ہم نے جامعہ کے کاموں کی ایک نمائش کی اور ان سے بہت صاف صاف کہہ دیا کہ اگر آپ لوگ ہمارے کاموں کو اچھا سمجھیں اور ان سے خوش ہوں تو ہماری امداد کیجئے اس وقت ہم بخوشی ایسی امداد قبول کریں گے اور اگر آپ نے محض مروت میں ہماری امداد کی تو یقین کیجئے کہ آپ ہمارا کام بنانے کی بجائے اور بگاڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں آپ ہرگز ہماری امداد نہ کیجئے اور اس وقت تک نہ کیجئے جب تک کہ آپ ہمارے کاموں سے مطمئن نہ ہو جائیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ انھوں نے ہمارے کام کو سمجھ لیا اسے پسند کیا اور اس پر فخر کیا بعض حضرات نے ایک بار رقم دینے کے بعد دوبارہ دو دو چار چار سو کی رقموں کا اضافہ کیا۔

جامعہ کے طلباء سے میں کہتا ہوں کہ وہ بمبئی کے طلبائے قدیم کی مثالوں کو سامنے رکھیں۔ جامعہ کی نیک نامی اور بدنامی کا دارومدار آپ ہی لوگوں پر ہے۔ آپ لوگوں کی حیثیت ایک فرد کی ضرور ہے لیکن آپ کسی سے ملتے ہیں تو یاد رکھئے کہ آپ اس وقت جامعہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ کی ہر بات اور ہر حرکت کا تعلق جامعہ کی بھلائی اور برائی سے ہوگا۔"

ڈاکٹر صاحب دوسری بار بمبئی تشریف لے گئے تو سر دوراب جی ٹاٹا ٹرسٹ نے جامعہ کے پالی ٹیکنک کے لئے پچاس ہزار روپے دئے۔ سر سہراب سکلتوالا صدر ٹاٹا ٹرسٹ بمبئی نے ۱۲ جون ۱۹۴۵ء کو تاج محل ہوٹل بمبئی میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کے اعزاز میں ایک لنچ دیا جس میں بمبئی کے بہت سے ممتاز اصحاب مدعو تھے جن میں مندرجہ ذیل بھی شریک تھے۔

سر رحمت اللہ چنائے۔ سر وکٹر ساسون۔ سر رستم مسانی۔ سر پوسن جی واڈیا۔ سر چنتامن دیشمکھ۔ سر چونی لال بی مہتا۔ ڈاکٹر جان متھائی۔ میسرز بہری داس مادھوداس جے، پی بسیتلواد۔ ایم۔ اے ماسٹر مدن موہن رونیا کمل نین بجاج تلسی داس کلاچند۔ محمد ہاشم پریم جی۔ اے۔ اے جسدن والا۔ ڈاکٹر خواجہ۔ مسٹر یو۔ ایم، سر چندانی، میونسپل کمشنر وغیرہ وغیرہ۔

اس موقعہ پر مسٹر سہراب نے جو تقریر فرمائی اس میں انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس عظیم الشان تعمیری کارنامہ پر مبارک باد دی جو انھوں نے اور ان کے رفقائے کار نے مسلمانان ہند کے لئے اس قومی یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں انجام دیا ہے۔ مسٹر سہراب نے بتایا کہ اس شان دار ادارے کی جس میں اب ایک اقامتی کالج، ایک اقامتی ٹیچرس ٹریننگ انسٹیٹیوٹ ایک اقامتی ثانوی مدرسہ اور دو پرائمری اسکول ایک اقامتی دوسرا غیر اقامتی۔ ایک آرٹ اکاڈمی۔ ایک مکتبہ اور ایک تعلیم بالغان کا مرکز شامل ہیں ابتدا کس طرح ۱۹۲۰ء میں ہوئی جب کہ کرایہ کے خیموں میں کام شروع کیا گیا تھا۔

سر سہراب نے اپیل کی کہ بمبئی کے متمول اصحاب جامعہ کے جوبلی فنڈ میں فراخدلی کے ساتھ چندہ دیں تاکہ جامعہ ملیہ اپنے کام کا دائرہ اور زیادہ وسیع کر سکے۔ آپ نے اعلان کیا کہ سر دوراب جی ٹاٹا ٹرسٹ کی طرف سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مجوزہ پالی ٹیکنک (صنعتی مدرسہ) کے قیام کے لئے پچاس ہزار روپیہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سر سہراب نے فرمایا کہ ٹاٹا کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جو بھی روپیہ دیتا ہے اس کے متعلق پوری تحقیقات کرتا ہے۔ ہم خواہ کسی کو پانچ روپے دیں چاہے پچاس ہزار، ہم روپیہ حقیقت میں اس وقت دیتے ہیں جب اس بات کے متعلق ہمیں اطمینان ہو جائے کہ یہ روپیہ ٹھیک مصرف پر صرف ہوگا۔ جامعہ ملیہ کے متعلق ہم نے یہ رقم اطمینان کر کے دی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنے جواب میں شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگ کہا کرتے ہیں کہ ٹاٹا والے جس چیز کو بھی چھو دیتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے مگر میں ٹاٹا کی جس چیز کی قدر کرتا ہوں وہ ان کی یہ نادر خصوصیت ہے کہ وہ اپنی دولت پوری سماج کے فائدے کے لئے اور انسانی ہمدردی کے کاموں پر صرف کرتے ہیں۔ اس موقع پر بمبئی کے اتنے ممتاز اصحاب کی موجودگی اور جامعہ ملیہ کے جوبلی فنڈ کی اپیل کا جس گرم جوشی سے بمبئی میں جواب ملا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ ہمارے ملک کے موجودہ تعلیمی نظام کی خشک یکسانیت کی جگہ جامعہ نے اس میں تنوع پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کی آپ قدر کرتے ہیں اور ان لوگوں کے کام کو آپ پسند فرماتے ہیں جن کے نزدیک تعلیم وہ کام ہے جو محض اُجرت کی خاطر نہ کیا جائے بلکہ جسے وہ ایک بلند مقصد اور بڑا مجاری مشن سمجھتے ہیں اور جو اپنی روایات اور اقدار بھی رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس جوبلی کے موقع پر پورے ملک سے دس لاکھ کی اپیل کی تھی۔ اس اپیل کا بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے بہت حوصلہ افزا جواب ملا اور تقریباً سوا دو لاکھ جمع ہو گئے جس میں ٹاٹا ٹرسٹ کے پچاس ہزار بھی شامل ہیں۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں بھی یہ مہم جاری رہی، کل ملاکر خدا کے فضل سے ۱۲ لاکھ روپے جمع ہو گئے تھے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ جوبلی سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب کے پاس موٹر نہیں تھی، بیگم زیدی نے جوبلی کے موقع پر موٹر تحفہ کے طور پر دی، حیدرآباد کے احباب نے جن میں سجاد مرزا صاحب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، محمود حسین صاحب (مددگار تعمیرات)، اکبر علی صاحب بیرسٹر خاص ہیں، چندہ جمع کر کے جامعہ کے لئے اسٹیشن ویگن پیش کی۔

علاقے کو سنوارنا، جامعہ نگر سے اوکھلا کو جوبڑا اسا کچا راستہ جاتا ہے یہ بہت خراب حالت میں تھا، طے ہوا کہ سب سے پہلے اس کی درستی کی جائے۔ طلبا، اور اساتذہ چھٹیوں میں اور فرصت کے اوقات میں یہ کام کریں۔ آس پاس سے ٹیلوں کو کاٹنا پتھر جمع کرنا، مٹی کھودنا، بھرائی کرنا ان کاموں کو سب چھوٹے اور بڑے خوشی خوشی کرتے تھے۔ طلبا، کی طرف سے راستوں کو ٹھیک کرانے کے انچارج، کالج کے محمد اسمٰعیل صاحب پٹیل تھے۔ اسمٰعیل صاحب کی زبانی اس کا حال سنئے۔

"افتتاح یکم مارچ ۱۹۵۶ء بوقت ۸ بجے صبح ہوا۔ اور افتتاح کی رسم جناب محمد مجیب صاحب نے ادا کی، اس دن کالج، مدرسہ ابتدائی، مدرسہ ثانوی اور ٹریننگ کالج کے تمام طلبہ کے علاوہ اساتذہ مدرسہ ثانوی، در کالج اور ابتدائی بھی موجود تھے اور ساتھ ساتھ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی تھے۔ کام ۸ بجے شروع ہوا تھا اور مسلسل تین گھنٹے تک جاری رہا۔ باوجود اس کے کہ آلات بہت کم تھے اور اس کی وجہ سے کافی پریشانی رہی پھر بھی ہفتوں کا کام ننھے ننھے بچوں اور نوجوانوں نے صرف چند گھنٹوں میں کر دیا ٹھیک گیا۔ ۵ بجے ڈاکٹر صاحب نے مختصر تقریر فرمائی، چونکہ اوزار کم تھے اس لئے دوسرے ہفتہ میں صرف کالج اور ثانوی کے طلبا واساتذہ نے کام کیا۔ غرض چار ہفتوں میں (یعنی چار جمعوں کے کام میں) سڑک ایک حد تک تیار ہوگئی ہے اس سڑک کے بن جانے سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوا۔

اسٹور سے غفار منزل تک جانے کا راستہ بہت خراب تھا۔ کالج کے چند نوجوانوں نے اختر علی کی رہنمائی میں یہ کام انجام دیا۔ ان میں مختار علی، محمد بن قیوم، محمد یوسف قابل ذکر ہیں۔"

مغرب کی طرف اوکھلے کی سڑک سے شمالاً جنوباً ایک سڑک نکالی گئی یہ اس جگہ تک جاتی ہے جہاں جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا اس کا نام

"شاہراہ جوبلی" رکھا گیا جس علاقے میں ہم رہتے ہیں یہ بہت ناہموار، بنجر تھا اس کو سنوارنا اور "جوبلی بستی" بسانا ایک بڑا کام تھا ۔ اسٹرانس سے نقشہ بنوا کر یہ بھی شروع کر دیا گیا۔ پنڈال کی تعمیر، ڈائس پر اور جلسہ گاہ میں عام نشستوں کا انتظام، چھولداریاں، خیمے، چارپائیاں، برتن، ٹاٹ، بلیاں و سرکیاں، جازریاں، متعدد خوشنما دروازے وغیرہ کے جملہ انتظامات دہلی کے مشہور قومی کارکن مولانا عبداللہ صاحب کے سپرد تھے جو چوڑی والے اور آٹے والے کے نام سے مشہور تھے اور دہلی کی تمام قومی تحریکات کے بہترین منتظم مانے جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی میں فرقہ وارانہ جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ کرفیو آرڈر کے دنوں میں کاروبار بند تھا لیکن مولانا نے پھر بھی کام کو نبٹانے کی کوشش کی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کرفیو کی وجہ سے مولانا عبداللہ صاحب بہت پریشان تھے، شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ٹھہرے باقی سامان حاصل کیا۔ ریاست رام پور کے سابق وزیراعظم کرنل بشیر حسین صاحب زیدی ۔۔۔ (جو اَب ہمارے خازن ہیں) اور مرحومہ بیگم زیدی نے بھی ہماری بہت مدد کی، جوبلی کے جشن سے پہلے کارکنوں کی ایک بڑی جماعت جامعہ نگر بھیجی کہ جوبلی کا خاص پنڈال تیار کرے اور "جوبلی بستی" بسانے میں جامعہ والوں کی مدد کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نہایت شاندار شامیانہ جس کے نیچے کئی ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے بہت سے چھوٹے بڑے خیمے مہمانوں کے لئے بھجوائے۔ بیگم زیدی موقع پر خود موجود رہتی تھیں اور کام کی نگرانی کرتی تھیں، ان کی اور زیدی صاحب کی تحریک پر نواب صاحب رامپور نے اس سامان کے علاوہ ایک لاکھ روپے عطیے کے طور پر دئے اور رامپور کے لوگوں سے بھی بہت امداد ملی۔ جب تک بیگم صاحبہ زندہ رہیں جامعہ کی ہر طرح سے مدد کرتی رہیں۔ زیدی صاحب اب ہمارے خازن ہیں۔ جامعہ نگر کی آرائش کی ابتدا سلور جوبلی (جشن سیمیں) کے موقع پر موصوف نے کی تھی۔ اب گولڈن جوبلی (جشن زریں) کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس کی تکمیل کی فکر میں ہیں۔

رامپور کے کارکنوں کے انچارج احسان خاں صاحب تھے "حدی را تیز تر می خوان چوں محمل را گراں بینی" میں حدی کی بجائے آپ کی خوش مزاجی کام کرتی تھی جب جوبلی ختم ہوئی تو میں نے ان سے کہا تھا کہ میں ہر سال آپ کو ایک کارڈ لکھا کروں گا کہ گولڈن جوبلی میں اب اتنے سال رہ گئے ہیں، فسادات میں آبادی کا جو اتھل پتھل ہوا اس کے بعد خط لکھنے کی طرف میں نے توجہ نہ دی اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو میں اب لکھتا کہ گولڈن جوبلی میں پانچ سال رہ گئے ہیں۔!

مدرسہ ابتدائی کی اقامت گاہ کے مغرب میں "جوبلی بستی" کا ڈول ڈالا گیا اس میں ایک ہزار مہمانوں کے ٹھیرنے کا انتظام تھا۔ شمال کی طرف شاندار شامیانہ لگا تھا جس میں کئی ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ نمائش کا انتظام استادوں کے مدرسہ (ٹریننگ کالج) میں تھا۔ مرکزی عمارت سے ٹریننگ کالج تک جانے کا جو راستہ تھا اس پہ کالج کے قریب سڑک کے دونوں طرف جامعہ کے بچوں کی دکانیں تھیں جن میں پھل، مٹھائی اور چاء مل سکتی تھی اور اُستادوں کے مدرسہ کی مصنوعات تھیں۔ مکتبہ جامعہ کی طرف سے اخبارات اور رسالے پڑھنے کے لئے سڑک کے کنارے انتظام تھا۔

نمائش اور جوبلی کی تقریبات کا حال بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں جشن جوبلی کا دعوت نامہ، اس کا پروگرام درج کریں اور نمائش کا حال بیان کر دیں۔

جشن سیمیں

۱۵ر تا ۱۸ر نومبر
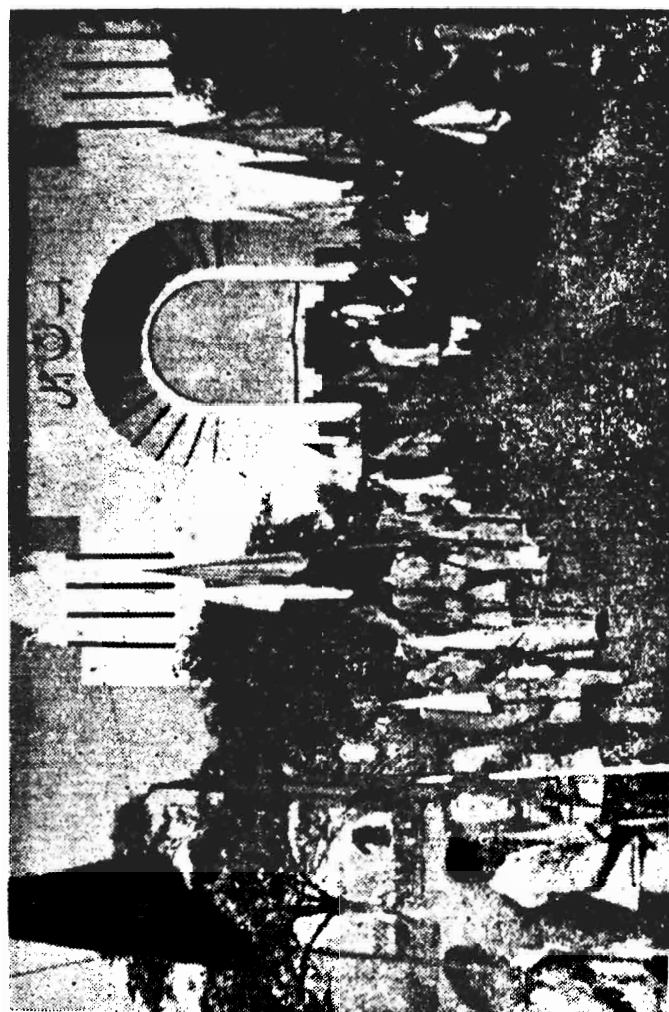
سنہ ۱۹۴۶ء

نوٹ :۔ یہ اور اگلے دو صفحات دعوت نامہ جشن سیمیں کا نمونہ ہیں۔

جامعہ نگر۔ دہلی
ستمبر ۱۹۴۶ء

نمبر ———

برادرم۔ تسلیم

انجمن جامعہ ملّیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ نومبر میں جامعہ کا جشن سیمیں منایا جائے۔ اس تقریب کی خاص غرض یہ ہے کہ آزاد تعلیم کا جو تجربہ جامعہ پچیس سال سے کر رہی ہے اس کے نتائج ملّت کے سامنے پیش کئے جائیں اور آئندہ کے لئے ہدایات حاصل کی جائیں۔ سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو برقرار رکھنے کی کوشش بہت مشکل تھی۔ لیکن خدا کے فضل اور آپ کی ہمدردی و مدد سے ہم نے اس مشکل کو ایک حد تک آسان کر لیا ہے۔

آپ سے التماس ہے کہ اس مبارک موقع پر تشریف لا کر ہماری خوشی میں شرکت فرمائیے ہمارے کاموں کا جائزہ لیجئے اور ہمدردانہ تنقید سے ہماری رہنمائی فرمائیے۔

آپ کا بھائی
ذاکر حسین (شیخ الجامعہ)

پروگرام

تاریخ	صبح	سہ پہر	عصر	رات
۱۵۔ نومبر ۱۹۴۶ء جمعہ	۹ بجے جامعہ کا جھنڈا لہرایا جائیگا ۱۰ بجے نمائش کا افتتاح	بعد نماز جمعہ ۲ بجے جامعہ کی مسجد کا سنگِ بنیاد	۴¾ بجے عورتوں کا جلسہ	۹ بجے علمائے کرام کی تقریریں
۱۶۔ نومبر ۱۹۴۶ء سنیچر	۹ بجے سکاؤٹ کا جھنڈا لہرایا جائے گا ۱۰ بجے تیراکی انجمنوں کے مقابلے	۲½ بجے کلّیات کے طلبہ کا کل ہند مباحثہ	۵ بجے طلبائے قدیم کا جلسہ	۹ بجے ڈراما
۱۷۔ نومبر ۱۹۴۶ء اتوار	۱۰ بجے جوبلی کا خاص جلسہ	۲½ بجے مدرسۂ ابتدائی کی عمارت کا سنگ بنیاد ۳¼ بجے علمی مقالے	۴¾ بجے علمی مقالے کا جلسہ جاری رہے گا	۹ بجے مشاعرہ
۱۸۔ نومبر ۱۹۴۶ء پیر	۱۰ بجے جلسہ تقسیم اسناد	۳ بجے سکاؤٹ ریلی	۵ بجے امیر جامعہ کی طرف سے عصرانہ	۹ بجے کیمپ فائر

اب ہم نمائش کا حال بیان کرتے ہیں، یہ حسب ذیل شعبوں پر مشتمل تھی

۱۔ ہندوستان کی تہذیب میں مسلمانوں کا حصّہ
۲۔ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کے طالب علموں کے تعلیمی پروجکٹ
۳۔ بنیادی تعلیم کی نمائش
۴۔ تعلیم بالغان کے تجربات
۵۔ جامعہ کے دیگر شعبوں کی کارگزاری

نمبر ا کی تشریح جناب شیخ الجامعہ صاحب نے اپنی نمائش والی تقریر میں کی ہے جو آگے درج ہے۔ آپ کی تقریر میں نمبر ۲ کا بھی اجمالی ذکر ہے، ہم یہاں مختصر طور پر ان کاموں کا جائزہ لیں گے جو مدرسہ ابتدائی کی مختلف جماعتوں۔ مدرسہ ثانوی، جامعہ کالج، استادوں کے مدرسہ اور تعلیم و ترقی نے نمائش کے سلسلہ میں کیا تھا اس سے آپ کو نمائش کی نوعیت اور وسعت کا کچھ اندازہ ہوگا۔

مدرسہ ابتدائی۔

۱۔ جماعت اوّل نے اپنے استاد عبدالواحد صاحب سندھی کی نگرانی میں "کاغذ کاٹنے کا کام" محنت اور جانفشانی سے کیا اور مٹی کے کھلونے بنائے۔ کاغذ کی تصویریں کاٹ کر دوسرے کاغذ پر چپکوائیں اور بہت اچھے اچھے مرقعے پیش کئے۔

۲۔ دوسری جماعت کے بچّوں نے "آپا جان" پر پروجکٹ رکھا تھا جو مرحومہ مس گرڈا فلپس بورن کی یادگار میں تھا۔ چودھری اصغر علی صاحب کی نگرانی میں چھوٹے چھوٹے بچّوں نے مرحومہ کی زندگی اور ان کے مشاغل کے متعلق بہت اچھے اچھے نمونے پیش کئے تھے۔

۳۔ درجہ سوم (الف) کے استاد راجہ نذیر احمد صاحب نے بھی اپنی جماعت کے مشورہ سے "کاغذ کاٹنے کا کام" منتخب کیا تھا۔ جرمنی سے وہاں کے بچّوں کے کام کے

نمونے منگوائے گئے تھے اور اپنے انداز میں اسی طرح کی چیزیں تیار کی تھیں۔ اس کام کے ساتھ ساتھ اس جماعت کے لڑکوں نے معلومات عامّہ کے نصاب کے مطابق مختلف عنوانوں پر چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی لکھے تھے مثلاً "ہمارے نصاب کی سبزیاں"، "ہمارے نصاب کے جانور" وغیرہ۔

۴۔ درجہ سوم (ب) کے استاد رشید نعمانی صاحب نے کپڑا پروجکٹ چلایا تھا۔ رنگ برنگ کے کپڑوں کے نمونے اور انواع و اقسام کے ٹکڑے جمع کرنے میں یقیناً بہت کاوش سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچّوں کے کام کے مختلف نمونے جو "تکلی پروجکٹ"، "کپڑا پروجکٹ"، کے سلسلہ میں تھے۔ مثلاً کتائی کے نمونے ان کا حساب، ان کے متعلق چارٹ مضامین وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ ابتدائی چہارم الف۔ نے اصغر احسن صاحب اصلاحی کی زیر نگرانی "ہماری غذا" کے متعلق معلومات اور چارٹ و نقشے و رسائل وغیرہ وغیرہ پیش کئے۔

۶۔ چہارم ب۔ اس جماعت نے محمد اکرام خاں صاحب کی نگرانی میں بڑی محنت اور شوق سے "تیراکی"، "بچوں کی سالگرہ" اور "صحت و صفائی" کے پروجکٹ اور ان کے ساتھ ساتھ گتّے کے کام اور "مٹی کے کام" کے عملی نمونے بھی پیش کئے تھے۔

۷۔ درجہ پنجم کے دو فریق تھے (الف) کے استاد عبیدالحق صاحب تھے اور (ب) کے آزاد رسول صاحب۔ اس جماعت کے دونوں فریقوں نے مل کر یہ پروجکٹ چلایا تھا اور یہ پروجکٹ اس قدر محنت اور شوق سے کیا گیا تھا کہ اسے مکمل پروجکٹ بلا تامل کہا جاسکتا ہے۔ اس پروجکٹ میں نصاب کے ہر ایک مضمون پر کام ہوا تھا۔ اُردو، معلومات عامّہ اور ڈرائنگ تو ہر پروجکٹ کے خاص موضوع تھے لیکن اس میں اسلامیات، حساب اور انگریزی کا کام بھی نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔

مٹی کا کام تقریباً ہر ایک جماعت نے کچھ نہ کچھ کیا تھا لیکن اس جماعت نے مٹی کے

کام کو اپنے پروجیکٹ کا ایک اہم جز دبنا دیا تھا۔ مثلاً گاؤں کے ماڈل، آمدورفت کے ذرائع۔ بیل گاڑی، شکرم۔ اونٹ۔ گھوڑا گاڑی۔ ریل۔ ہوائی جہاز، سمندری جہاز، موٹر وغیرہ۔ آب پاشی کے وسائل، رہٹ، چرس، ڈھیکلی وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کے مٹی کے نمونے، نہایت اعلیٰ درجہ کے بنائے تھے۔

اس پروجیکٹ کے سلسلہ میں صوبوں کی بعض مصنوعات بھی موجود تھیں جس نے ہندوستان پروجیکٹ کو چار چاند لگادئے تھے اور جغرافیہ کی معلومات مکمل کر دی تھیں۔

اس جماعت میں مستقل پروجیکٹ جو نصاب کا جزو ہے۔ بچوں کی دکان ہے بچوں نے اس کام میں بڑی دلچسپی دکھائی۔ اس میں حساب کا کام تو زور شور سے ہوتا ہی ہے لیکن اسلامیات کا بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ تجارت کی اہمیت، اس کی فضیلت، تاجر کے اخلاق اور رسول مقبولؐ کی تجارت سے دلچسپی پر خاص توجہ دی گئی۔ اور بچوں نے یہ کام بہت اچھی طرح پیش کیا۔

۸۔ جماعت ششم نے عبدالرؤف صاحب کی زیرنگرانی "مرغی خانہ" پروجیکٹ چلایا تھا۔ اس نمائش کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مرغیوں کے متعلق پوری معلومات نقشوں رسالوں اور چارٹس وغیرہ کے ذریعے ظاہر کی گئی تھیں۔

اس زمانے میں مدرسہ ابتدائی کے آرٹسٹ مسعود اختر صاحب تھے۔ آپ کی ہنر مندی اور دن رات کی محنت نے پروجیکٹ کے کاموں کو، مدرسہ کی نمائش کو نمایاں کر دیا تھا۔

تعلیمی مرکز ۱ ۔

ابتدائی اوّل۔ استاد جماعت محمود الحسن صاحب

مدرسہ اور اس کا ماحول باغیچہ

حرفہ ابری سازی

ابتدائی دوم — استاد جماعت — سید حسین احمد صاحب قیصر
گاؤں — دنیا کے بچے — پھول اور پتے
حرفہ — پیپر کٹنگ

ابتدائی سوم — استاد جماعت — غفران احمد صاحب نصرت
مختلف پیشہ ور۔ — پھل اور ترکاریاں، دہلی کی تاریخی عمارتیں۔
حرفہ — ابری سازی

ابتدائی چہارم — استاد جماعت — محمد اکرام صاحب عثمانی
میونسپل کمیٹی — ڈاک خانہ — تعلیمی تماشہ
حرفہ — گتّا

ابتدائی پنجم — استاد جماعت — حکیم محمد شفیع صاحب
ہمارا دیس — متعلق پروجکٹ بچوں کی دکان

ابتدائی ششم — استاد جماعت — سید عروج الحسن صاحب
یوم سر سید منانا — آثار الصنادید کی تحقیقات کے تحت تاریخی عمارتوں کی سیر اور ان کے نتائج۔
حرفہ — گتّا

ثانوی اوّل — استاد جماعت — سید احمد علی صاحب
ہندوستان — یورپ — ہوٹل
مشترکہ پروجکٹ — جلسہ سیرت النبیؐ

مولوی فضل الرحمٰن صاحب نے نہ صرف اس پروجکٹ میں بلکہ دیگر پروجکٹوں میں بھی اسلامیات کے کام میں استاد جماعت کی مدد کی۔

⁂ ⁂ ⁂

۱۔ شبلی پروجکٹ۔ مدرسہ ثانوی۔ — محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ کی نگرانی میں ایک زمانے تک تحقیقاتی کام کے بعد یہ پروجکٹ جوبلی نمائش میں رکھا گیا۔

۲۔ تفویضی کام۔ — سعید انصاری صاحب کی نگرانی میں اس کا ریکارڈ پیش کیا گیا۔

۳۔ تاریخی نقشے۔
۴۔ باغبانی پروجکٹ — عبدالرزاق صاحب نے اختر حسن صاحب کی مدد سے یہ کام انجام دیا تھا۔

۵۔ ملیریا پروجکٹ — یہ پروجکٹ عتیق احمد صاحب اور چودھری محمد علی صاحب کی محنت کا نتیجہ تھا، اس سے نہ صرف جامعہ نگر میں ملیریا ختم ہوا بلکہ بیش بہا معلومات نمائش میں پیش کی گئیں۔

۶۔ رسالہ پیامِ عمل — ثانوی اوّل — مدیرہ محمود علی خاں
〃 روشنی — 〃 دوم — 〃 مجیب الرحمٰن
〃 نئی زندگی — 〃 سوم — 〃

یہ سب رسالے جوبلی پروجکٹ کا ایک حصّہ تھے، شفیع الدین صاحب نیرؔ اور اُردو کے دیگر اساتذہ کی نگرانی میں مختلف مقامات میں نکلتے رہے اور آخر میں نمائش میں پیش کئے گئے۔

۷۔ جامعہ کیمیکل انڈسٹریز۔ — علی احمد صاحب استاد سائنس کی نگرانی میں ثانوی کے بچوں نے جامعہ انک "مچھر بچاؤ تیل، مچھر بچاؤ کریم، پومیڈ، مفید منجن جام، جیلی، مارمیڈ کو مقبول عام بنانے کے بعد جوبلی کی نمائش میں پیش کیا۔

۸۔ آرٹ کے نمونے:۔ — زیرِ نگرانی اختر حسن صاحب فاروقی۔
یہ کام پروجکٹ کی تصاویر کے علاوہ تھا۔

۹۔ دہلی کا عجائب خانہ۔ — یہ کام پروفیسر محمد مجیب صاحب کی نگرانی میں ہوا۔ محمد شفیع الدین صاحب

نیّر نے دہلی کے ادیب اور شعرا کی تصانیف، اِن کی تحریریں جمع کیں۔ سید مجاہد حسین صاحب زیدی نے ہاتھی دانت کا کام، میناکاری کی چیزیں اور تصاویر حاصل کیں۔

جامعہ کالج۔

۱۔ رسالہ جوہر کا جوبلی نمبر مدیر محمد عرفان خاں صاحب نوزی۔

۲۔ جامعہ میوزیم، منتظم عبدالحلیم صاحب ندوی۔

۱۔ جامعہ سے پہلے کی تعلیمی تحریکیں:۔

حکومت کا مقصد تعلیم سے مختلف تعلیمی تحریکیں، تصویروں، البم اور چارٹس کے ذریعہ۔

۲۔ سیاسی پس منظر۔

خلافت اور کانگریس کی تحریکیں، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شبلی کی تحریروں کے اقتباسات، قومی تعلیم یا قومی مدرسوں کے قیام کی ضرورت۔

۳۔ علی گڑھ کے طلبا اور قومی تعلیم کے قیام کا مطالبہ۔

اس تحریک میں کون کون سے طالب علم شریک تھے۔ ان کی تصویریں، کن قومی رہنماؤں نے اس ضرورت کا احساس کیا، ان کی تصویریں اور اس سلسلہ میں ان کے حالات۔

۴۔ جامعہ کے بانی

ان کی مختلف تصویریں، تحریروں کے البم، جامعہ کے مقاصد ان کی زبانی

۵۔ جامعہ کی ابتدائی زندگی۔

مختلف مکانات کی تصویریں، مختلف کام کرنے والے وفود کی تصویریں۔

اس زمانے کے طریقۂ تعلیم کا خاکہ، اسٹاف کی تصاویر، تحریروں کا البم، طلبہ کی تصاویر اس زمانے کے رسالے، نصاب تعلیم، دستورالعمل، قواعد امتحانات، اس زمانے کی

زندگی سے متعلق مختلف لوگوں کی تحریروں کے اقتباسات، اداروں کی فہرست، تصویریں، افسران شعبہ جات کی فہرست اور تصویریں۔

۶۔ جامعہ قرول باغ میں :۔

مکانات کی تصویریں اداروں کی فہرست، مختلف جلسوں کی تصاویر، طلبا کی تصاویر، شعبوں کی فہرست، افسران شعبہ کی تصاویر، تحریروں کا البم،

۷۔ جامعہ اوکھلا میں :۔

مکانات کی تصویریں، مختلف اداروں کی فہرست، مختلف جلسوں کی تصاویر، طلبہ کی تصاویر، افسران شعبہ کی تصاویر، تصویروں کا البم، وغیرہ وغیرہ۔

۸۔ جامعہ جوبلی کے موقع پر۔

جامعہ کا ارتقاء چارٹ اور تصویروں کے ذریعہ شعبہ جات کی فہرست۔ جامعہ نگر کی بستی کا ماڈل وغیرہ۔

۹۔ جامعہ کی مالیات :۔

شروع سے اب تک جامعہ کی مالی حالت کا ایک خاکہ چارٹ کے ذریعہ جامعہ کی امداد میں ریاستوں کا حصّہ، عوام کا حصّہ، مصارف کی تفصیلات، جامعہ کا کل سرمایہ عمارتوں وغیرہ کی شکل میں، جوبلی فنڈ میں مختلف صوبوں کا حصّہ۔

۱۰۔ جامعہ کے طلباء۔

طلبا کی تعداد سن وار، مختلف شعبوں میں، جامعہ کے طلبا مختلف صوبوں میں جامعہ کے گریجویٹس، فہرست، تصاویر، مشاغل، انجمن اتحاد۔ بزم ادب، ان کے رسالے اور دوسری چیزیں۔

۱۱۔ جامعہ کا حلقہ۔

اسٹاف، فارغ التحصیل طلبہ، جامعہ کے ہمدرد، رسالہ جامعہ پڑھنے والے۔

تعلیم بالغان کے ذریعہ، تعلیمی مرکز ہال کے ذریعہ، طلبا کے سرپرست جامعہ کے کاموں سے مختلف طور پر فائدہ اٹھانے والے۔

۱۲۔ جامعہ کے عہدیدار:۔

۱۳۔ جامعہ غیروں کی نظر میں

۱۴۔ جامعہ کے طلبأ اور کام کرنے والوں کی تصانیف

استادوں کا مدرسہ۔

۱۔ سفری نمائش۔

جوبلی کا چندہ جمع کرنے کے سلسلہ میں مختلف شہروں میں دکھانے کے لئے یہ نمائش تیار کرائی گئی تھی جس میں تمام شعبوں کی منتخب اشیا تھیں، یہ کام عبدالحئی صاحب اختر حسن صاحب اور ابوالکلام صاحب مسعود اختر صاحب کی نگرانی میں ہوا۔

۲۔ بنیادی تعلیم کی نمائش:۔

اس نمائش کی خصوصیت یہ تھی کہ جو بھی ایک مرتبہ اس نمائش میں داخل ہو جاتا وہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتا تھا جب تک کہ وہ ساری نمائش دیکھ نہ لے، اس نمائش میں مندرجہ ذیل چیزوں کو تصاویر، چارٹ، اور گراف کے ذریعہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

بنیادی تعلیم کے بنیادی اصولوں کو اس طرح تصاویر کے ذریعہ دکھایا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کو یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ تعلیم:۔

۱۔ ۷ سے ۱۴ سال کے بچوں کے لئے لازمی اور مفت ہوگی۔

۲۔ یہ بچے کی مادری زبان میں دی جائے گی۔

۳۔ یہ حرفہ کے ذریعہ دی جائے گی۔

اس نمائش کا دوسرا پہلو مربوط اسباق کے نمونے پیش کرنا تھا اس سلسلہ میں خاص

اسباق تیار کرائے گئے تھے جو مندرجہ ذیل تین موضوعات سے بچے کی تعلیم کو مربوط کرتے تھے۔

(۱) حرفہ کے ذریعہ مربوط

(۲) سماجی ماحول کے ذریعہ مربوط

(۳) قدرتی ماحول کے ذریعہ مربوط

اس نمائش کا تیسرا پہلو تھا، مختلف حرفوں کے ذریعہ اعلیٰ قسم کے ماڈل پیش کرنا، اس کے تحت گتے کے کام کے، لکڑی کے کام کے اور کتائی بنائی کے درجہ وار ماڈل پیش کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ کتابچے بھی رکھے گئے تھے جو ان ماڈل کے تعلیمی پہلو کو اجاگر کرتے تھے۔ اور مربوط طریقہ تعلیم کے اشارے پیش کرتے تھے۔

اس نمائش کا چوتھا پہلو تھا، "بنیادی مدارس میں آرٹ کا طریقہ تعلیم" اس کے تحت زیر تعلیم استادوں کے تیار کردہ آرٹ کے نمونے لگائے گئے تھے اور ساتھ ہی چارٹوں کے ذریعہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ان نمونوں کو تیار کرتے وقت کن اصولوں کو مدّنظر رکھنا چاہیئے۔

اس نمائش میں جگہ جگہ بنیادی تعلیم سے متعلق کتبات خوشخط لکھوا کر لگائے گئے تھے جو بنیادی تعلیم کے اصولوں، معلمی اور ہاتھ کے کام کو واضح کرتے تھے۔ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا کہ چارٹوں اور تصاویر میں جو رنگ استعمال کئے جائیں ان کی آمیزش دیدہ زیب ہو۔

یہ کام ابوالکلام صاحب اور اُن کے ساتھیوں نے بڑے سلیقے سے کیا تھا۔

ہندوستان کی تہذیب میں مسلمانوں کا حصّہ ۔ اس عنوان سے جو نمائش لگائی گئی تھی وہ حیدرآباد کے آغا حیدر حسن صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھی، موصوف حیدرآباد سے نہ صرف نادر اشیاء ساتھ لائے تھے بلکہ اس ساری نمائش کو ادوار کے لحاظ سے بڑی خوبی سے سجایا تھا۔ اس کام میں آغا اشرف علی صاحب کشمیری نے بہت مدد دی۔

اس غرض سے آپ نے پشاور اور دیگر شہروں کا سفر کر کے اشیاء حاصل کی تھیں۔
ادارہ تعلیم و ترقی۔
۱۔ تعلیم بالغان کے تجربات کا ریکارڈ
۲۔ بالغوں کے لئے مطبوعہ کتب

جامعہ کے جن اساتذہ نے ان کاموں کو بڑے جوش اور خلوص سے انجام دیا اُن میں مولانا اسعد انصاری صاحب اور صغیر احمد صاحب بھی تھے یہ دونوں اپنے کاموں کی بہار جوبلی میں دیکھنے سے پہلے ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ سعد صاحب کے استقلال اور ایثار کا جامعہ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں بڑا حصہ تھا، ان کا دل ہمارے دلوں سے کہیں زیادہ حساس تھا۔ مرحوم کے سب سے عزیز منصوبے وہ تھے جن کا تعلق کسی خاص ادارے یا زمانے سے نہیں تھا بلکہ عالمگیر اور ابدی قدروں سے تھا اور مرحوم جامعہ کو ان قدروں کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ دوسرے ساتھی جنھوں نے اس زمانہ میں وفات پائی صغیر احمد صاحب تھے۔ جیسے ہی جامعہ کا پہلا ادارہ (مدرسہ ابتدائی) جامعہ نگر منتقل ہوا، آپ ہمارے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ اس بستی کے بسانے میں مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔ اس وقت کی ویرانی اور بچوں کی آمد کا خیال کیجئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صغیر صاحب کی زندہ دلی اس ویرانے کو گلزار بنا دیتی ہے۔ تب ہی تو داخلے کے مرحلے طے ہوتے ہی بچے مانوس اور خوش دل نظر آنے لگتے تھے۔ ہر کھیل میں آپ کی دلچسپی۔۔۔ بچوں کے لئے بڑی کشش رکھتی تھی۔

اس ساری نمائش کا جس کا ہم ذکر کیا نقشہ مسٹر ہائنس نے بنایا تھا اور اس کے منتظم اعلیٰ شفیق الرحمٰن صاحب تھے۔ نمائش کی ترتیب اور آرائش میں جامعہ کے سب آرٹسٹ جناب ابوالکلام صاحب کی نگرانی میں شریک تھے۔

نمائش کے افتتاح سے پہلے ہم آپ کو "جوبلی بستی" لے چلتے ہیں جہاں مہمانوں کی

آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جامعہ کے قیام کے وقت بھی ہندوستان میں سیاسی ہیجان تھا اور اس کی سلور جوبلی کے زمانہ میں بھی سیاسی کشمکش تھی لیکن ۱۹۲۰ء میں ملک کے سب فرقوں کے لوگ مل کر سامراجی حکومت سے ٹکر لے رہے تھے اور ۱۹۴۶ء میں یہ خود آپس میں دست و گریباں تھے۔ ہماری زندگی بھی عجیب زندگی ہے ان آنکھوں نے وہ بہار بھی دیکھی جب کہ ہندو مسلمان دونوں کے پاؤں جوش جنوں میں وطن پر قربان ہونے کے لئے والہانہ عقیدت کے ساتھ مقتل کی جانب بڑھے چلے جاتے تھے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر تھی اور اب یہ دردناک منظر بھی دیکھا جب کہ وہی ہندو مسلمان ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے پر تلے ہوئے تھے۔

فرقہ وارانہ جنگ کا یہ زہریلا اثر شہروں سے دیہات تک میں پہنچ گیا اور وہاں کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہو گئی۔ جا بجا کرفیو لگ گیا۔ خود دہلی میں شام کے ۵ بجے سے صبح کے ۷ بجے تک باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ انسان انسان سے بیزار اور خوف زدہ ہو گیا۔ ان حالات میں کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ جامعہ کی جوبلی بھی ہو سکے گی یا کوئی شریک بھی ہوگا۔ ایک طرف ان تمام کاوشوں اور محنتوں کا خیال تھا جو جوبلی کے سلسلہ میں کی گئی تھیں اور دوسری طرف ملک کی بگڑی ہوئی حالت سے ہم لوگ سخت پریشان تھے۔ دن کا چین اور رات کی نیند جاتی رہی۔ عین اسی زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنی آنکھ کی پرانی تکلیف گلوکوما میں مبتلا ہو گئے۔ ہم سوچنے لگے کہ کیا اللہ نے یہ تمام بلائیں اسی وقت کے لئے مخصوص کر رکھی تھیں اور ہم دعا کرنے لگے کہ "رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ" (اے باری تعالیٰ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے) فسادات شروع ہوتے وقت لوگ جوبلی میں شرکت کے لئے اپنے گھروں سے روانہ ہو چکے تھے یا روانہ ہونے والے تھے۔ التوا کا اعلان ہوتا بھی تو اس سے پہلے بہت سے لوگ جامعہ نگر پہنچ

چکے ہوتے۔ یہی فیصلہ ہوا کہ بڑا اجتماع نہ سہی بہرحال یہ رسم پوری ضرور ہونی چاہیئے لیکن ہوا یہ کہ دیکھتے اندر دیکھتے دیکھتے جوبلی بستی آباد ہوگئی۔ جتنے مہمانوں کا اندازہ ہم نے لگایا تھا وہ سب آگئے رات کو کرفیو نافذ تھا، دن میں دہلی کے لوگ جوق درجوق آنے لگے۔ اب ہم یہ سوچتے تھے کہ فسادات کے ہوتے ہوئے حاضری کا یہ عالم ہے تو امن کی حالت میں کہاں تک نوبت پہونچتی اس صورت میں ہم انتظام پر قابو پالیتے! بہرحال خوشی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہمارے جشن کا آغاز ہوا۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے دہلی میں بھی فسادات شروع ہوگئے تھے۔ ان مہمانوں کو جو صورت حال سے بے خبر ملک کے مختلف حصّوں سے دن رات چلے آرہے تھے اسٹیشن سے جامعہ نگر لانا بڑا مشکل کام تھا .... لیکن جامعہ کے باہمت نوجوانوں نے جن میں اخلاص احمد صاحب صدیقی ناظم اسکاؤٹس ایسوسی ایشن اور جامعہ کے مخلص استاد عبدالرزاق صاحب اور ان دونوں کے ان تھک ساتھی شامل ہیں۔ دہلی اسٹیشن سے مہمانوں کو دس میل کے فاصلہ پر جامعہ نگر تک پہنچانے میں جس قابلیت ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا وہ انہی کا حصّہ ہے، خدا کا شکر ہے کہ بغیر کسی قسم کے حادثہ کے سب لوگ خیریت سے جامعہ نگر پہنچے اور خیریت سے واپس گئے۔

دہلی اور اوکھلا کے درمیان جی۔ این۔ آئی۔ ٹی بس سروس کی گاڑیاں چلتی تھیں جوبلی کے زمانے میں اس کمپنی نے ہمارے مہمانوں کے لئے خاص گاڑیاں چلائی تھیں اور بہت مدد کی تھی۔ ہماری طرف سے ٹرانسپورٹ کے منتظم سید مجتبیٰ حسین صاحب زیدی تھے۔ مستعدی، دن رات کی محنت سے یہ کام اچھی طرح چلتا رہا۔ کرفیو کی وجہ سے بس سروس والے کافی پہلے اپنی سروس بند کر دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ہمارے ٹرک اور اسٹیشن ویگن کام کرتے تھے۔ جوبلی کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا کہ مہمانوں کی سہولت کے لئے جامعہ نگر میں مختلف دکانیں لگوا دی جائیں۔ زمین کا ایک معقول ٹکڑا اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا

اور دکانیں بنانے کا سامان بھی منگوایا گیا تھا بعض دکان داروں کو ٹھیکے بھی دے دیئے گئے تھے۔ لیکن عین اس زمانہ میں دہلی میں فسادات کی وجہ سے وحشت چھاگئی اور آدمی آدمی کی شکل دیکھ کر بھاگنے لگا جس سے دکان داروں کو سامان ملنا ٹھہرے یہاں تک پہنچنا دشوار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازار کی تجویز مکمل نہ ہو سکی اور کوئی سلیقے کی دکان نہ لگ سکی بس دو ایک مقامی دکانیں بے ترتیبی سے کھل گئیں۔

ہمارے سابق طالب علم محمود علی خاں صاحب ... اور حارث صاحب مدیر اجمل بمبئی نے دفتر معلومات کے کل انتظام اپنے ذمہ لئے اور حافظ نبی احمد صاحب نے ہر مہمان کی جائے قیام کا ریکارڈ رکھا اور مہمانوں کے طعام کے لئے ٹکٹوں کی تقسیم کی ذمہ داری میں محمود صاحب اور حارث صاحب کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے ساتھ کالج اور مدرسہ کے دیگر طلبہ نے بھی رضاکارانہ خدمات انجام دیں۔

دہلی میونسپل کمیٹی کی ....

عنایت اور توجہ سے تمام کیمپ میں پائپ لائن بچھادی گئی تھی اور انجن کے ذریعہ کنوئیں کا پانی نکال کر تمام کیمپ میں پہنچادیا جاتا تھا۔ مہمانوں کو پانی کی مطلق تکلیف نہیں ہوئی، اس انتظام میں جامعہ کے ایک محنتی کارکن شبیر احمد صاحب ندوی کی محنت شاقہ کا بڑا حصہ تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ اس پائپ لائن اور انجن کے ملنے کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جوبلی شروع ہونے میں دو ہفتے رہ گئے تھے۔ شبیر صاحب نے ہمت سے کام لے کر جوبلی بستی میں ایک پختہ کنواں بنا ڈالا۔

اس زمانے میں جامعہ میں بجلی نہیں تھی بجلی تو درکنار مٹی کا تیل بھی ضرورت کے مطابق نہیں ملتا تھا لیکن کارکنان جامعہ کی ہمت، جناب علی احمد خاں صاحب استاد سائنس جامعہ کی دوڑ دھوپ اور حکومت کی مدد سے جوبلی کے ایام میں مہمانوں کے کیمپ میں، گزرگاہوں پر، پنڈال میں اور جن جن مقامات پر ضروری ... تھا بجلی کی روشنی کا

انتظام کیا گیا تھا جس سے جلسوں میں بہت رونق آگئی اور رات کے وقت مہمانوں کو بہت
اطمینان رہا۔

پانی کی طرح بجلی کا انتظام بھی حادثہ کا شکار ہونے سے بچ گیا۔ چار پانچ دن پہلے
بیگم زیدی کو معلوم ہوا کہ سرکاری جنریٹر ملنے میں ناکامی ہوئی ہے۔ ذاکر صاحب نے
ہنڈوں اور لالٹینوں کا انتظام طے کر دیا ہے تو بیگم زیدی فسادات کی حالت میں شہر
گئیں اور دو جنریٹر حاصل کر لئے۔

ماسٹر عبدالحیٔ صاحب ناظم مطبخ نے سڑکوں وغیرہ کی درستی کے علاوہ مطبخ کا انتظام
نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا۔ جامعہ کے طلبا اور اساتذہ کے کھانے کے روزمرہ کے انتظام کے
علاوہ تمام مہمانوں اور باہر سے آنے اسکاؤٹس کے خورد و نوش کا انتظام انہی کے متعلق
تھا۔ اس پریشانی اور ہیجان کے زمانہ میں انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے سب فرائض
انجام دئے اور سب کو وقت پر ناشتہ اور کھانا دیا۔ کھانے کی خرابی یا بدنظمی کی شکایت
کسی ایک وقت بھی نہیں ہوئی۔

مہمانوں کو مختلف اوقات میں چاء پلانے اور دیگر ضروریات پوری کرنے کا غیر
معمولی بار جامعہ اسٹور اور قہوہ خانہ پر پڑ گیا تھا جسے ۔ ۔ ۔ ۔ شبیر احمد خاں صاحب نے
نہایت تندہی اور مستعدی سے انجام دیا۔

جس جگہ جامعہ کی مسجد بننے والی ہے وہاں ایک وسیع چبوترہ بنایا گیا تھا اور
اس کا ایک حصہ مسقف کر دیا گیا تھا۔ عارضی مسجد کے لئے امام صاحب جامع مسجد
کی عنایت سے وہ پردے مل گئے تھے جو جمعہ کے دن دہلی کی جامع مسجد میں دھوپ
سے بچنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ جناب عبدالواحد صاحب سندھی استاد
مدرسہ ابتدائی جامعہ اور مولانا جمال الدین صاحب استاد مدرسہ ثانوی نے جناب خواجہ
عبدالحیٔ صاحب ناظم دینیات کی نگرانی میں اس سلسلہ میں بہت دوڑ دھوپ کی

حقیقت یہ ہے کہ نماز کا معقول انتظام سندھی صاحب اور مولانا کی محنت اور مستعدی کا نتیجہ تھا۔

جامعہ ملیہ کے تعلیمی مرکز ہال قرول باغ کی طرف سے اخبارات وغیرہ فراہم کرنے کا انتظام مہمانوں کے کیمپ میں برکت علی صاحب فراق کی نگرانی میں ایک بڑے خیمہ میں کیا گیا تھا۔ مہمانوں کو اخبارات دیکھنے میں بہت سہولت رہی۔

نشر و اشاعت کے ذمّے دار پروفیسر محمد عاقل صاحب، محمد سرور صاحب۔ آغا اشرف علی صاحب، سید محمد جعفری صاحب تھے۔

مہمانوں کی دوا علاج میں جامعہ کے مشیر طبّی ڈاکٹر سعید احمد صاحب کے علاوہ ہمدرد دواخانہ نے نہایت قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ایک بہت بڑا خیمہ بہت نمایاں جگہ پر نصب کر کے تقریباً ہر قسم کی ادویات لاکر جمع کر دیں اور سب جامعہ والوں اور مہمانوں کے لئے جوبلی کے پورے زمانہ مفت طبّی خدمات انجام دینے کے علاوہ دوائیں بھی مفت تقسیم کیں بلکہ جوشاندہ وغیرہ کے قسم کی چیزیں فوراً تیار کر کے مریضوں کو پہنچائیں۔ یہ فیض جناب عبدالحمید صاحب مالک دواخانہ کی دریا دلی سے مہمانوں کو پہنچا۔ جامعہ کے سابق طالب علم حکیم سید حسن مہدی صاحب مریضوں کی دیکھ بھال کرتے تھے اور دواخانے کا انتظام انہی کی نگرانی میں تھا۔

کیمپ کے مہمانوں کی دیکھ بھال اور خدمت کے لئے یوں تو دفتر معلومات کے کارکن اور دوسرے رضا کار موجود رہتے تھے لیکن مدرسہ ابتدائی کے مہمانوں کے لئے محمد حسین صاحب، عورتوں کے لئے بیگم عبدالواحد صاحب سندھی، مدرسہ ثانوی کے لئے عبدالرزاق صاحب اور اختر حسن صاحب فاروقی اور استادوں کے مدرسہ کے لئے ابوالکلام صاحب اور پنڈت تلارام صاحب خاص طور پر ذمّہ دار قرار دئے گئے تھے۔ ان حضرات نے باوجود بہت سی مشکلات کے اپنا فرض بہ حسن و خوبی انجام دیا۔

معین الدین صاحب، سجاد علی صاحب کا نیا تقرر ہوا تھا، ان حضرات نے بھی اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹایا خصوصاً بچوں کو نظم میں رکھنے کی ذمہ داری ان حضرات پر تھی یہ خدمت انھیں ایسی راس آئی کہ آج بھی یہ جلسوں میں اسی کام پر مامور نظر آتے ہیں۔

دہلی میں جس قدر قومی اجتماع ہوتے ہیں ان سب میں دلّی والے مہمانوں کے کھانے کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اپنی طرف سے کرتے ہیں اور مہمان نوازی کی اسلامی روایات کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ جامعہ جوبلی کے موقعہ پر جامعہ کے مخلص ہمدرد حاجی ممتاز الدین صاحب دہلوی نے جو کلکتہ میں کاروبار کرتے ہیں اپنے بہت سے احباب کو جامعہ نگر میں جمع کر کے تجویز پیش کی کہ جامعہ کے مہمانوں کو دلی والوں کا مہمان سمجھا جائے اور ان کے طعام کا انتظام ہماری طرف سے ہو۔ چنانچہ حسب ذیل احباب نے اس سلسلہ میں مختلف رقومات عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا۔

۱۔ جناب حاجی شیخ ممتاز الدین صاحب کلکتہ۔ ۲۔ شیخ سراج العارفین صاحب۔ ۳۔ شیخ احسان الٰہی صاحب۔ ۴۔ ڈی۔ ایم ملک صاحب۔ ۵۔ شیخ محمد صدیق محمد عمر صاحبان، نئی دہلی۔ ۶ محمد عمر الٰہی صاحب کلکتہ۔ ۷ محمد رفیع فیروز الدین صاحب کلکتہ ۸ محمد عارف اینڈ سنز، صدر بازار۔ ۹ حاجی محمد اشفاق صاحب صدر بازار۔ ۱۰۔ حافظ محمد مشتاق صاحب ملتانی کلکتہ۔

یہ تھا جوبلی بستی کا حال، اب جشن جوبلی کی خاص تقریبات کا حال سنئے۔

ا۔ جشن سیمیں کا افتتاح

۱۵ر نومبر ۱۹۴۶ء۔ جمعہ۔ وقت ۹ بجے صبح

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی پچیس سالہ جوبلی کا افتتاح ان آیات مقدسہ کی تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۙ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ۔

مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کے دارالاقاموں کے وسط میں ایک چکر بنا ہوا ہے جس کے عین بیچوں بیچ ایک گول چبوترے پر جامعہ کا ایک اونچا جھنڈا نصب ہے۔ اس جھنڈے کے لہرانے کی رسم جوبلی کے پروگرام کی بسم اللہ تھی اور اس کارروائی کا آغاز کلام مجید کی مندرجہ بالا سورت سے ہوا تھا جسے سورۂ نصر کہتے ہیں۔ اساتذہ، طلبا (موجودہ و سابق) ہمدرد اور مہمان سب موجود تھے۔ تمام اسکاؤٹس با وردی صف بستہ کھڑے تھے۔ جامعہ کا بینڈ موجود تھا۔ عمارت کے بالائی حصّوں کے برآمدوں میں جامعہ اسٹاف کی مستورات کے علاوہ باہر سے آئی ہوئی معزز مہمان عورتیں بھی موجود تھیں۔ سارا منظر اس قدر پُر اثر اور پُرشکوہ تھا کہ اس کا صحیح نقشہ الفاظ میں کھینچنا مشکل ہے۔ جناب امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اسکاؤٹس کی دو رویہ ایستادہ صفوں سے گذرتے ہوئے مقام پرچم کے چبوترے پر پہنچے۔ اسکاؤٹس نے محرابی تسلیم سے خیر مقدم کیا۔ بینڈ نے سلامی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ جب محمد ایثان احمد متعلم ابتدائی ششم نے تلاوت کلام مجید شروع کی تو حاضرین کے قلب کی کچھ عجیب کیفیت تھی۔ ان لوگوں نے جو جامعہ کے جھنڈے کے نیچے ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمع ہوئے تھے اور جنھوں نے اب تک اس علم کو بلند رکھا تھا ... محسوس کیا کہ اب جامعہ کو ملک و ملت کی تائید حاصل ہو گئی اور اس کا پرچم قومی تعلیم کے میدان میں سدا لہراتا رہے گا۔

جامعہ کا پرچم لہرانے کی رسم | تلاوت کلام مجید ختم ہوتے ہی جناب شیخ الجامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے امیر جامعہ سے جامعہ کی پرچم کشائی کے لئے درخواست کی۔ مدرسہ کے طلبہ فہیم خاں، محمد سعید اور احسان لئیین نے امیر جامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب کے گلے میں ہار ڈالے اس کے بعد امیر جامعہ نے جامعہ کا جھنڈا لہرایا۔ جس میں سے پھولوں کی بارش کا ایک پرکیف منظر منتظر آنکھوں نے دیکھا۔ بینڈ کی دھن کے ساتھ والنیٹرول کے دستوں نے سلامی ادا کی اور مدرسہ ابتدائی کے بچوں نے جامعہ کا مشہور ترانہ پرچم نہایت موثر انداز میں گایا۔

ترانہ کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ نے فرمایا

" دوستو اور عزیزو! سب سے پہلے جامعہ کے تمام استادوں اور طالب علموں کی طرف سے حضرت امیر جامعہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے جامعہ کے پرچم کو لہرایا اور مبارک باد دینے کا شرف حاصل کرتا ہوں کہ آج ان کی سرپرستی میں جامعہ کو یہ دن نصیب ہوا کہ وہ اپنا جشن سیمیں منائے۔

۲۵ برس کا گذر جانا یوں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے زمانہ یوں تو ہمیشہ گذرتا ہی ہے لیکن کسی عزم کا ایک مخصوص شدت کے ساتھ ایک عرصہ تک قائم رہنا زمانہ کے ہر دم بہتے دھارے میں ایک نئی توانائی کا اضافہ کرتا ہے۔ اسی عزم کی اچھائی یا برائی، شدت یا کمزوری اس وقت سے جو اس پر گذرتی ہے جھلکتی پڑھتی ہے۔ آپ کی خدمت میں مبارک باد اس لئے پیش کرتا ہوں کہ ہماری حیات ملی کے ایک عہد آفریں عزم نے ایک خاص شدت کے ساتھ ۲۵ سال سے اوپر کی مدت گذاری ہے خصوصیت سے آپ کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کرتے ہوئے مجھے جامعہ کی زندگی کا وہ ابتدائی دور یاد آتا ہے جب اگر آپ کی مخلصانہ مجاہدانہ سرگرمی حاصل

نہ ہوتی تو یہ دیا شاید مخالفوں کی پھونکوں سے بجھ جاتا۔ یہ ننھا سا بیج اُگنے سے پہلے کھنڈل دیا جاتا اور ایک نیا چراغ روشن کرنے کے لئے حالات اور بخت و اتفاق کی نامعلوم کن کن مطابقتوں کا انتظار کرنا پڑتا۔ ہم سب اس زمانہ کو فخر کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور جب مشکلیں سامنے یاد آتی ہیں جیسے کہ بسا اوقات یاد آتی ہیں تو اس پر آشوب زمانہ کی یاد سے اپنے لئے بے ثبات قدم کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ آپ سے زیادہ اس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو یوں روشن اور جمتے ہوئے بیج کو اس ہونہار پودے کی شکل میں دیکھ کر کون خوش نہ ہوگا۔ ہم سب آپ کی اس خوشی میں شریک ہیں۔ ہمارا ہدیۂ تشکر اور ہماری مبارکباد قبول فرمایئے۔

ان ۲۵ برس میں جو گذر چکے ہیں ہم نے اس پرچم کو جسے آپ نے ابھی لہرایا ہے کچھ معنی دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ صحیح تعلیم اور صالح تربیت کا پرچم بن جائے یعنی انفرادی استعدادوں کو کھلنے بغیر سیرت میں یکسوئی اور شخصیت میں پختگی پیدا کرنے کا پرچم بن جائے، دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی کا پرچم بن جائے، بے لوث خدمت کا پرچم بن جائے، محنت کشی کا پرچم بن جائے، نتائج سے بے نیاز سعی صحیح اور سعی پیہم کا پرچم بن جائے کام کو عبادت کی طرح انجام دینے کا پرچم بن جائے باتیں بنا کر چکنے کی سستی سہولتوں کے باوجود جانیں کھپا کر زندگیاں بنانے کا پرچم بن جائے، قوت پاکی، زیبائی کا پرچم بن جائے، ہمت اور استقامت کا بے ڈر اخلاقی جرأت اور بے باک صداقت کا، عدل اور حق کی حمایت میں سینہ سپر ہونے کا؛ ہر ہنگامہ بے تمیزی میں متانت اور شرافت کا پرچم بن جائے۔ عسر میں یُسر پہ یقین اور یُسر میں اس کی طرف دھیان جو یُسر عطا فرماتا ہے مشکلوں میں صبر اور
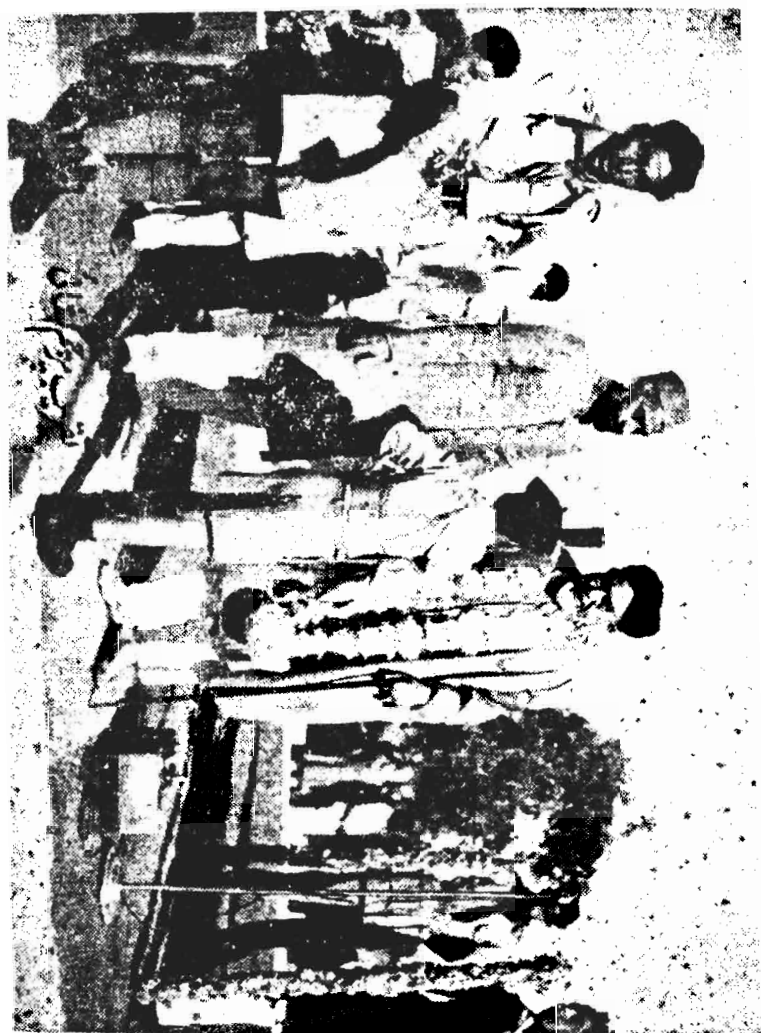
آسانیوں میں شکر کا پرچم بن جائے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کے سایہ میں پرورش پلنے والے اچھے، سچے، تندرست، من درست انسان ہوں۔ باادب باتمیز ارادوں میں پکے، خیالات میں واضح اور ستھرے، اپنی کہنے کے قابل دوسرے کی سننے اور سمجھنے پر آمادہ، زندہ دل، نڈر بس ایک خدا سے ڈرانے والے اور سب کے ڈر سے بے نیاز، ہم نے سچے دل اور پورے یقین کے ساتھ اس پرچم کو یہ معنی دینے کی کوشش کی ہے، ہم جانتے ہیں کہ یہ کوشش ناتمام ہے۔ ہماری کوتاہیوں کی وجہ سے ناتمام ہے لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جو ایسا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اور اس کی صحت کامیابی پر ایمان رکھتا ہے اس کی سعی مشکور ہوتی ہے اس کی بارگاہ میں جو دلوں میں اچھے عزم پیدا کرتا ہے اور ان کے پورا کرنے کی طاقت بخشتا ہے اور ڈگمگاتے قدموں کو ثبات عطا فرماتا ہے۔ دعا ہے کہ وہ ہماری سعی کو مشکور فرمائے اور اس پرچم کے وہ معنی سب پر واضح ہو جائیں جو ہم اسے دینا چاہتے ہیں۔"

شیخ الجامعہ کی تقریر کے بعد امیر جامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب نے حسب ذیل خطبہ پڑھا جس میں جامعہ کی ضرورت واہمیت اس کی تاسیس اور ابتدائی تاریخ پر نہایت جامع الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔ ہم اس کا اختصار یہاں درج کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

شیخ الجامعہ، عہدہ داران جامعہ، طلبا، جامعہ، بھائیو اور بہنو!

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ گوناگوں مشکلات اور دشواریوں کے باوجود ہم آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں منانے کی ابتدا کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا کام مجھ جیسے عاصی پر معاصی کے کمزور ہاتھوں سے شروع ہوا ہے۔ اس خدمت کی ادائیگی مجھے بہ حیثیت امیر جامعہ سپرد کی گئی ہے اور

اس عہدہ پر میرا انتخاب خصوصاً مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری جیسی شخصیتوں کے بعد صرف میرے پرانے رفقائے کار کی قدردانی بلکہ ذرہ نوازی ہے جس کے لئے میں دل کی گہرائیوں سے شکرگذار ہوں شیخ الجامعہ صاحب نے جو کچھ میرے متعلق فرمایا ہے وہ ان کی محبت اور ان کے خلوص کا کرشمہ ہے نہ کہ میری ناچیز خدمات کا اعتراف۔ پھر بھی میں شکریہ کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ایسے مخلص اور قوم و ملت کے حقیقی محسن کو عرصہ دراز تک زندہ و سلامت رکھے اور ان کی زندگی کو ہماری قوم کے لئے نمونہ بنائے آمین۔

بزرگو اور عزیزو! مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے ہر شخص میری اس دعا میں شریک ہوگا کہ اے خالق ہر بلندی و پستی جو پرچم تیرے نام پر آج میرے پست ہاتھوں نے بلند کیا ہے اس کو ہمیشہ بلند رکھنا۔ یہ پرچم اس جھنڈے کی یادگار ہے جسے بعض تیرے مقدس بندوں نے جن میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں، امیر الہند ڈاکٹر مختار احمد انصاری، اور رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہم کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ ہے آج سے چھبیس برس پہلے علی گڈھ میں بلند کیا تھا۔ ان بزرگوں کی حیات ہی میں اور ان کے ہم سے جدا ہونے کے بعد ہم پر بڑے بڑے سخت اور کٹھن وقت آئے اور ہم میں سے اکثر کے قدم ڈگمگائے مگر تیری توفیق شامل حال رہی جب علی گڈھ میں جامعہ کا قیام دشوار ہوگیا تو تیرے ایک بندہ خاص کی ہمت سے یہ ادارہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں منتقل ہوگیا اور یہاں بھی تیرے فضل وکرم اور تیرے چند خاص بندوں کی ہمت نے اس کو مضبوط بنیادوں پر قائم فرمادیا۔ یہ پرچم تیرا ہے ہم تیرے بندے ہیں۔ اس

پرچم کی حقیقی لاج تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ہماری آنے والی نسلوں کو اس پرچم کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائیو اور جو اس کی لاج رکھے تو اس کی لاج رکھیو، آمین۔

۱۹۲۰ء ایک مشہور پُر آشوب زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی بنیادوں پر حکومت برطانیہ کے زیر سایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کی جارہی تھی۔ مدرسۃ العلوم کو پہلے ہی محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج قرار دیا گیا تھا۔ وہ حکومت وقت کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا۔ اس لئے اس کالج میں اکثر یونین جیک لہرایا کرتا تھا، کالج کا کوئی علم نہ تھا مگر ایک کریسنٹ یا نشان تھا جس پر کھجور کا ایک درخت تھا جس کی ایک جانب ہلال بطور مسلم نشان کے اور دوسری طرف تاج برطانیہ جس میں سب سے اوپر سلیب کا نقشہ تھا بنا ہوا تھا۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو گورنمنٹ برطانیہ سے آزاد کرانے کے لئے ہمارے بعض دوستوں اور رہنماؤں نے کوشش کی۔ مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا شوکت علی مرحوم جو اسی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اس کوشش میں پیش پیش تھے اور وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو نیشنل مسلم یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے۔ اور ہنگامی طور پر جب اُمنا۔ یونیورسٹی یا کالج نے گورنمنٹ برطانیہ سے آزادی کی تجویز کو کثرت رائے سے مسترد کر دیا تو مولانا محمد علی مرحوم نے بعض پرجوش طلباء کی مدد سے اس پر قبضہ بھی کر لیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو کالج کی مسجد جامعہ میں اس کا اعلان کر دیا کہ اب یہ یونیورسٹی نیشنل مسلم یونیورسٹی ہو گی۔ بعد نماز جمعہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے وہ خطبہ دیا جو خطبۂ تاسیس کہا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض بھائیوں نے حکومت برطانیہ کی

مدد سے مولانا محمد علی مرحوم اور ان کے ساتھیوں کو کالج سے نکال دیا اور میرے احتجاج کے باوجود مجھے بھی اولڈ بوائز لاج سے بے دخل کر دیا گیا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے جن مدرسین اور طلبا نے علیحدگی اختیار کی وہ اس جامعہ کے خشت اولین کہے جا سکتے ہیں جن میں سب سے زیادہ نمایاں ہمارے موجودہ شیخ الجامعہ ہیں۔ جو طلبا پرانے کالج سے باہر آئے تھے ان میں سے اکثر کا اصرار تھا کہ ان کی تعلیم جاری رکھی جائے اس لئے سرکاری یونیورسٹی سے نمایاں کرنے کے لئے قومی ادارہ کا نام نیشنل مسلم یونیورسٹی رکھا گیا۔

حضرات تعلیمی کام کے لئے سب سے زیادہ امن وسکون کی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیم دنیا کو امن کے پیغام ہی کا نام ہے۔ اس کو اتفاق کہئے یا اس سے ایک فال لیجئے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک پُر آشوب زمانہ میں قائم ہوئی اور آج اس سے سخت تر پُر آشوب زمانہ میں اپنا جشن سیمیں منا رہی ہے سیاسی غلامی، اقتصادی بے بضاعتی، ملی انتشار اور گوناگوں مشکلات ہماری راہ میں سنگ ہائے گراں رہے لیکن خدا کا فضل ہماری کوششوں سے زیادہ ہمارا دستگیر رہا۔ اس کے فیض کرم سے ہمارے ہمدردوں کی جماعت میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسی کی عطا کی ہوئی توفیق نے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے رفقاء کو استقامت بخشی اور جہاں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اپنے شیخ الجامعہ اور ان کے باہمت رفقاء اور اپنے محسنوں اور ہمدردوں کے بھی شکر گذار ہیں کہ ہماری بہت سی مشکلات ایک حد تک آسان ہو گئیں جیسا کہ شیخ الجامعہ نے اپنے دعوت نامے میں لکھا ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہمدردان نہ صرف ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمیں ممنون فرمائیں، بلکہ

ہمدردانہ تنقید سے ہماری رہنمائی بھی کریں۔

طلباءِ جامعہ! بانیان جامعہ کی آرزو تھی اور میری دعا ہے کہ جامعہ کا ہر فرزند دنیا کے کسی حصّہ میں بھی جائے اور زندگی کے کسی شعبہ میں بھی قدم رکھے وہ اس پرچم کا خیال اور لحاظ اس طرح رکھے، اس ستارہ کی چمک جس میں اللہ اکبر کی جھلک ہے اس کی ساری زندگی کو منوّر کرتی رہے تاکہ جامعہ کا ہر ہلال بدرِ منیر بن کر دنیا کو منوّر کرے اور وہ دنیا کے سامنے اپنے آپ کو اس طرح پیش کرے کہ ہر دیکھنے والا بے ساختہ کہہ اُٹھے ؎

بالائے سرش زہوش مندی　　　می تافت ستارۂ بلندی

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

امیر جامعہ کی تقریر کے بعد جناب شیخ الجامعہ صاحب نے اعلان فرمایا کہ اب آپ حضرات استادوں کے مدرسہ تشریف لے جائیں جہاں جشن جوبلی کی نمائش کا افتتاح اعلیٰ حضرت نواب صاحب رام پور کے مبارک ہاتھوں ہوگا۔

"جامعہ زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں میں یہ تقریب ختم ہوئی اور حاضرین نمائش گاہ کے میدان کی طرف روانہ ہوگئے۔

۲۔ افتتاح نمائش کا جلسہ:-

۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء جمعہ، وقت ۱۰ بجے

جھنڈے کی سلامی سے فارغ ہوکر تمام مہمان اور دیگر حضرات استادوں کے مدرسہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ معزز مہمانوں میں یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں کے نمائندے ہندوستان کے مختلف حصّوں اور یورپ کے کچھ ملکوں کے حضرات اور خواتین، سرکاری عہدہ دار، مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈر موجود تھے۔ مرکزی حکومت

کے وزیروں میں سے مسٹر آصف علی، سردار بلدیو سنگھ اور راجہ غضنفر علی تشریف لائے تھے۔ ٹھیک ۱ بجے اعلیٰ حضرت نواب صاحب رام پور رونق افروز ہوئے ان کے ہمراہ جناب زیدی صاحب چیف منسٹر بھی تھے۔ اسکاؤٹس نے سلامی دی شیخ الجامعہ صاحب نے استقبال کیا اور جلسہ گاہ میں تمام حاضرین نے کھڑے ہو کر خیر مقدم کیا۔ جلسہ کی کارروائی تلاوت کلام مجید سے شروع ہوئی۔ تلاوت کے بعد اعلیٰ حضرت کے گلے میں چھوٹے بچوں (فہیم خاں، احسان یٰسین اور محمد سعید) نے ہار پہنائے اور جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

اعلیٰ حضرت! میرے لئے باعث صد افتخار اور وجہ ہزار مسرت ہے کہ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام کارکنوں، استادوں اور طالب علموں کی طرف سے جامعہ کی اس نامکمل مگر ہونہار بستی میں آپ کا خیر مقدم کر رہا ہوں۔

مجھے اس وقت وہ دن یاد آتا ہے جب سرکار بحیثیت ولی عہد رام پور آج سے کوئی بیس سال پہلے جامعہ کے بانی اور امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور کے ہمراہ جامعہ کے کام کو ملاحظہ فرمانے تشریف لائے تھے۔ جامعہ اس وقت تھوڑے سے طالب علموں پر مشتمل تھی۔ قرول باغ میں کرایہ کے مکانوں میں چند نوجوان تعلیم کا ایک مشکل تجربہ کر رہے تھے۔ ان کے کام کو نہ تعلیمی حلقوں میں کوئی اعتبار حاصل تھا نہ سرکاری دفاتر میں، ان کے پاس نہ ساز و سامان تھا نہ زر و مال، مجھے یاد ہے کہ سرکار کی تشریف آوری پر گرد و غبار کو دبانے کے لئے، بچوں کے کاموں کو سجا کر رکھنے کے لئے میں نے کیا کیا جتن کئے تھے اور پھر بھی ہزار اس تو گری اس جامعہ بے سر و سامانی کے بے شمار سوراخوں سے ہمارا افلاس اور ہماری ناتجربہ کاری جھانکتی تھی، مجھے یقین

ہے کہ سرکار کی ژرف نگاہی نے انھیں سوانحوں سے ہماری ہمتوں اور ہمارے حوصلوں کو بھی بے تابانہ سر نکالتے دیکھا ہوگا۔ اس مشکل زمانہ میں ہمیں اطمینان تھا کہ حکیم صاحب ہمارے سرپرست ہیں۔ ہندوستان کا کون امیر اور کون غریب ہے کہ ان کے کہنے پر اور ان کے اعتماد پر ہمارے لئے ضروری وسائل فراہم نہ کر دے گا۔ تھوڑے دن کی آزمائش، پھر راستہ صاف ہے لیکن قدرت کا منشا، تھا کہ یہ آزمائش ہم تمام کارکنوں کی تربیت کا سامان بنے اس لئے حکیم صاحب کا سایہ ہمارے سر سے یکایک اٹھا لیا گیا، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری نے ہمارے کام کی باگ سنبھالی مگر جلد ہی انھوں نے بھی ہمیں اس آزمائش میں چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان سرداروں سے محروم ہو کر ہم نے جو کھویا اسے سرکار سے زیادہ کون جانتا ہے لیکن سرکار آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ جامعہ کے ان کام کرنے والوں نوجوان، ناتجربہ کار، کام کرنے والوں نے اس آزمائش سے منہ نہیں موڑا اور انھیں اپنی محنت کا انعام، سچ یہ ہے کہ ان کے حق سے زیادہ ملا اور یقین ہے کہ اور ملے گا آپ جیسے روشن خیال اور بیدار مغز والیان ریاست نے بھی ان کی سرپرستی فرمائی اور بلا شرط انھیں لاکھوں مرحمت فرما کر ان کے کام کو سہل بنانے میں مدد دی اور ان غریبوں نے بھی جنھوں نے اپنی اٹھنیوں اور چونیوں اور روپیوں سے ماہ بماہ اور سال بہ سال انھیں اس ہمت افزا بات کا یقین دلایا کہ ان کے کام کی جڑیں قوم کے سواد اعظم میں جمتی جاتی ہیں اور یہ پچیس سال گزر ہی گئے۔ اس میں ایک خاصا ترقی پسند تعلیمی ادارہ وجود میں آگیا۔ اسے کچھ کچھ شہرت بھی حاصل ہوئی۔ اس کا کچھ کچھ اثر بھی بڑھا، مبالغہ آمیز تعریفیں بھی ہوئیں۔ مبالغہ آمیز تنقیدیں بھی۔ ملک میں وہ اصلاح تعلیمی کا

نقیب سمجھا جانے لگا اور ملک کے باہر بھی لوگوں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں لیکن اس میں کسی بے جا خاکساری کو دخل نہیں۔ جب سرکار کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ہم کارکنوں کو اپنی تعریفیں سن کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ابھی تو کام کا آغاز بھی بہ مشکل ہوا ہے۔ کام از سرتا پا نقائص سے پُر ہے اور پھر اس پر یہ تعریفیں۔ خیال آتا ہے کہ یا اللہ کیا تعلیمی کام کا ملک میں یہ حال ہے کہ یہ چھوٹا سا کام اس تعریف کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔؟ کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ تحسین کسی کوتاہی کی سزا تو نہیں ہے کہ کئے پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہنا اور ترقی کا حوصلہ چھوڑ دینا زندہ انسان کی سب سے بڑی سزا ہے۔ جامعہ کے کام کرنے والوں کی دلی دعا ہے کہ وہ اس سزا کے مستحق کبھی نہ قرار دئے جائیں ان کا کام ناقص ہو تو ہوا اور ضرور ہوگا مگر ان کے دل میں برابر ہو جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟ میرا گمان ہے کہ ہماری یہ دعا مقبول ہوئی ہے ہم نے اپنے ناقدوں سے بھی زیادہ اپنے عیبوں پر نظر رکھی ہے اور آج کہ اس دشوار کام پر ۲۵ سال گذر چکے ہیں، ہمیں اپنے نقائص کا پورا احساس ہے، اور انھیں دور کرنے کا پکا ارادہ، اور جو ہم کل تک ان پچیس سال کی مشقتوں سے کچھ تھکے تھکے سے تھے۔ آج پھر تازہ دم ہو کر اپنی کمیوں کو پورا کرنے اور راہِ ترقی پر آگے قدم بڑھانے کا عزم کرتے ہیں۔ یہ جوبلی ماضی پر فخر کرنے کا جشن نہیں ہے بلکہ مستقبل کے عزم کا ایک موقع ہے، خدا ہماری مدد فرمائے اعلیٰ حضرت نے اس جشن سیمیں کا افتتاح فرمانے کی درخواست کو قبول فرما کر ہم کارکنان جامعہ پر کہ پہلے سے کچھ کم مرہون منت و کرم نہ تھے۔ بڑا ہی احسان فرمایا ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس موقع پر اپنے ساتھیوں کی طرف سے آپ کو ان کی کیفیت ذہنی سے آگاہ کردوں۔

اس جشن کے آغاز کے ساتھ سرکار سے یہ التجا بھی ہے کہ آپ کے سامنے جو نمائش ترتیب دی گئی ہے اس کا افتتاح بھی اپنے دست مبارک سے فرمائیں۔ یہ نمائش دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصے میں وہ چیزیں ہیں جن سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کی زندگی میں اپنی کاوش سے کیا کیا اور کیسے کیسے اضافے کئے۔ اسے کیسے سنوارا اور سجایا اور چمکایا؟ یہ ہندوستان میں اسلامی تمدن کے بے پایاں خزانے سے مٹھی بھر چیزیں ہیں جن سے ہمارا ذوق حسن و جمال اور علوم و فنون اور معاشرت میں ہمارے اسلاف کے کارنامے جھلکتے ہیں۔ اچھے انسان اپنے ماحول کو کبھی اس کی جامد حالت پر نہیں رہنے دیتے۔ اسے بہتر بناتے ہیں اس لئے کہ خود ان کی روح پاک کی کیفیات، رنگا رنگ اپنے کو اس ماحول میں متشکل کرنے کے لئے بیتاب ہوتی ہیں، یہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں قوم اپنی ذہنی قوتوں کا عکس دیکھ سکتی ہے اور اپنی تحصیلات کے علم اور ان پر تنقید سے ترقی کے ولولے کو نشو و نما دیتی ہے۔ ہماری قوم نے ہندوستان کی ساری فضا اپنی روح پاک سے عکسِ جہاں آرا، سے آئینہ خانہ بنا دیا تھا۔ اس کے بہت سے شیشے ٹوٹ گئے بہت ہمارے سامنے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن جو کچھ اب بھی باقی ہے اس میں بھی دیکھنے والے اس ندرت فکر و عمل، ان تمناؤں اور ولولوں، ان حوصلوں اور ان خدمتوں، پاک اندیشیوں اور پاک بینیوں کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں، جن کے اثر سے اس برّ اعظم کی فضا کے سارے ارتعاشات میں ایک دلآویز رنگینی ہے۔

دوسرے حصے میں اس نمائش کے جامعہ کے کچوں اور طالب علموں اور مختلف شعبوں کے بعض کاموں کے نمونے آپ کے سامنے آئیں گے۔

یہ دونوں چیزیں ایک نمائش میں اس لئے یک جا کر دی گئی ہیں کہ ان دونوں میں وہ تعلق ہے جو زمانے کے تسلسل میں ماضی اور حال اور مستقبل کے درمیان ہوتا ہے۔ تمدن آفرینی کا وہ کام جس سے مسلمانوں نے ہندوستانی زندگی کے ہر گوشے کو مالا مال کیا ہے ختم نہیں ہوا ہے۔ اپنی تمدنی تخلیقات سے تمدن آفریں قوتوں کو نشوونما دینے کا اصل تعلیمی کام بھی ابھی جاری ہے اور یہ قوم خدمت انسانیت کے منصب سے ابھی اپنے کو معزول تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے منصوبوں میں جن کی تکمیل میں ابھرتی ہوئی کمزور قوتیں نشوونما پاتی ہیں اور جن کے بظاہر حقیر نتیجے آج جامعہ کے بچوں کے کام کی شکل میں آپ کے سامنے آئیں گے۔ یہ دراصل اس سے بہت بڑے منصوبوں کا پیش خیمہ ہیں۔ یہ بچے چھوٹے چھوٹے منصوبے بناتے ہیں ان منصوبوں کو پورا کرنے کے وسائل تلاش کرتے ہیں۔ ان منصوبوں کی تکمیل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور تکمیل کے بعد اپنے کام پر بیگانہ وار تنقید کی قیمتی عادت اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے منصوبوں سے یہ بچے دراصل بڑے تمدنی کاموں کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ ان کی نیم رس ناقص کوششوں کو استادوں اور کاملوں کے شاہکاروں کے پہلو بہ پہلو رکھنے کی جرأت بس اس لئے کی ہے کہ ان کے نمونوں کے سائے میں ان میں سے بھی استاد اور کامل نکلیں گے اور تمدن آفرینی کا کبھی ختم نہ ہونے والا کام انشاءاللہ جاری رہے گا اور یہ ملک رحمت اللعالمین کے نام لیواؤں کی خدمت سے پھر ایک بار جنت نشان بن سکے گا۔ انشاءاللہ۔

معافی چاہتا ہوں، سرکار، کہ آپ کا اتنا وقت لے لیا۔ بات میں بات

نکل آئی۔ مجھے تو صرف اپنی طرف سے اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے سرکار کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا تھا کہ آپ نے ہم فقیروں کی محفل میں تشریف لانا منظور فرمایا۔ پھر اپنی تشریف آوری، اپنی سرپرستی، اپنی اعانت اور اپنی ریاست کے قیمتی تعاون سے فقیروں کی اس محفل کا رنگ ہی کچھ اور کر دیا اور تعلیم جیسے روکھے پھیکے کام کی اس انداز سے حوصلہ افزائی فرمائی کہ شاید کچھ دیر تو ہم سے زیادہ بھڑک دار کام کرنے والوں کو بھی ہم پر رشک آجائے۔ ورنہ ہم اس جنگل میں یہ شہر کیسے بساتے جس کی رونق کو آپ نے قدم رنجہ فرما کر دوبالا فرما دیا ہے۔ مجھے صرف ان عنایات شاہانہ پر ہدیۂ تشکر پیش کرنا تھا اور یہ درخواست کرنی تھی کہ جشن سیمیں اور اس نمائش کے افتتاح پر سرکار اپنے ارشادات عالیہ سے ہم کو سرفراز فرمائیں۔"

جناب شیخ الجامعہ کی تقریر کے بعد اعلیٰ حضرت ہز ہائی نس نواب سر سید محمد رضا علی خاں بہادر، فرماں روائے ریاست رام پور نے ارشاد فرمایا۔

"حضرات۔ جامعہ ملیہ کی پچیس سالہ جوبلی کا افتتاح کرنا میرے لئے بڑے فخر اور مسرت کا مقام ہے۔ مجھے اس درس گاہ میں کئی وجہ سے دلچسپی ہے۔ میں اس کے استادوں اور طلبہ سے ملا ہوں اور ان کی قابلیت اور خلوص سے متاثر ہوا ہوں۔ میں نے ان کا کام دیکھا ہے اور میں اس کی خوبی اور عمدگی کا معترف ہوں۔ اس کے علاوہ جامعہ کا اور میری ریاست کا عرصے سے تاریخی تعلق ہے اس کے سب سے پہلے پرنسپل مولانا محمد علی مرحوم رام پور ہی کے رہنے والے تھے اور اس کے دو قابل احترام امیر یعنی حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے۔ ریاست رام پور میرے والد مرحوم اور خود مجھ سے بہت خصوصیت اور محبت کے مراسم تھے

بحمداللہ اب ویسے ہی مراسم میرے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آپ کے شیخ الجامعہ سے ہیں اور میرے دل میں ان کی ذات کی اور ان کی اس عظیم الشان کارنامے کی بے انتہا قدر ہے جس کا اعتراف میں اس موقع پر کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا جب انھوں نے مجھے اس تقریب کے موقعہ پر مدعو کیا تو میں نے ان کی دعوت کو خوشی اور شکریئے کے ساتھ منظور کیا۔

حضرات! کوئی ملک اور کوئی قوم اس وقت تک صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک اچھی تعلیم کے ذریعے اس میں صحیح خیالات اور شریفانہ جذبات کی اشاعت نہ کی جائے یعنی ان میں رواداری، انسان دوستی، صداقت اور جرأت کی صفات پیدا نہ کی جائیں، جامعہ ملیہ نے قومی زندگی کے ایک نازک دور میں اس اہم خدمت کو اپنے ذمے لیا اور گذشتہ پچیس سال سے وہ جس خاموشی اور استقلال کے ساتھ اس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہی ہے وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ کم سے کم میرے علم میں کوئی دوسری ایسی جماعت نہیں جس نے موجودہ صدی میں اس قدر ایثار اور خلوص کا، اس قدر بلند نظری اور قومی دردمندی کا ثبوت دیا ہو اور ایک روشن اور واضح نصب العین کی خاطر اس قدر اتحاد اور یک جہتی کے ساتھ کام کر کے دکھایا ہو۔ ہمارے ملک میں بہت سی ایسی جماعتیں ہیں جو باوجود ہر قسم کی مالی سہولتوں کے کامیابی کے ساتھ تعمیری کام نہیں کر سکتیں۔ آپ جانتے ہیں کہ باہمی اختلافات کی وجہ سے چلتے کام بگڑ جاتے ہیں لیکن جامعہ ملیہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس کے ایثار پسند کارکنوں نے اپنے میر کارواں ذاکر حسین کی رہبری میں نہ صرف ہر قسم کی مشکلات اور تکلیفوں کو صبر اور خندہ پیشانی کے ساتھ

برداشت کیا بلکہ خودداری، اتفاق، محبت اور ضبط و تنظیم کے ساتھ کام کرنے کی ایسی مثال پیش کی جو مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ملک کے لئے ایک نیک فال ہے ۔ اب کہ اس درس گاہ نے اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کر لئے ہیں اور یہ ماشاءاللہ اپنے شباب اور شعور کی منزل پر پہنچ گئی ہے ہیں نہ صرف اپنی طرف سے بلکہ ملت اسلامیہ کی طرف سے اور جامعہ کے تمام بہی خواہوں کی طرف سے جس میں ہر مذہب و ملت اور سیاسی خیالات کے لوگ اور سرکاری اور غیر سرکاری حلقے دونوں شامل ہیں ۔ جامعہ کے کارکنوں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کی نیک نیتی، ان کا ایثار اور خدمت کا جذبہ، ان کی شرافت اور انسانیت اور ان کی مسلسل جد و جہد نے لوگوں کے...... دلوں میں گھر کر لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اب قوم کا ہر طبقہ اپنے اعتراف اور تحسین کا زیادہ سے زیادہ عملی ثبوت دے گا بلکہ اس کا یہ ثبوت اس وقت بھی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جامعہ جوبلی فنڈ کے لئے جو چندے کی اپیل کی گئی تھی اس پر لبیک کہنے والوں میں حکومت ہند، والیان ریاست اہل دولت اور عوام سب ہی شریک ہیں ۔ میں نے اس پروگرام کو غور سے دیکھا ہے جو جامعہ کے کارکنوں نے آئندہ کے لئے ترتیب دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ہر ایک کام قومی تہذیب کی تعمیر، بقا اور ترقی کے لئے نہایت مفید اور ضروری ہے ۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ بہت جلد اپنے خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھ سے دیکھ سکیں ۔ جامعہ کی علمی اور تعلیمی کارگذاریوں کا اندازہ لگانے کے لئے میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اس عظیم الشان اور خوش سلیقہ نمائش کا معائنہ کریں جس کا افتتاح آج میرے

سپرد کیا گیا ہے۔ اس نمائش کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جامعہ کے طلبہ کے کاموں اور باہر سے جمع کئے ہوئے نمونوں کے ذریعے ایک مؤثر اور دل نشین انداز میں یہ دکھایا جائے کہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب کے بنانے میں مسلمانوں کا کتنا بڑا اور قابل قدر حصہ ہے اس نمائش میں جہاں ایک طرف طلبہ کی دست کاری اور تخلیق کی صلاحتیں آپ کو متاثر کریں گی وہاں دوسری طرف آپ کو یہ اندازہ بھی ہوگا کہ مختلف علوم میں ادب، مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ میں، فن تعمیر میں غرض تہذیب کے ہر شعبے میں مسلمانوں نے کیا کیا کمالات دکھلائے ان کارناموں کو زندہ رکھنا، ان کی قدر کرنا، ان سے سبق اندوز ہونا، قوم کی ذہنی اور جمالی ترقی کے لئے ایک شرط لازم ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں کہ ان کو دیکھ کر ہم میں محض ایک فخر کا جذبہ پیدا ہو جائے اس سے بھی زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم میں ان کی بدولت ایک نیا حوصلہ ایک نیا عزم اور نیا ولولہ پیدا ہو اور ہم اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار ہو اور ہم تہذیب کے میدان میں ہندوستان کی کسی جماعت سے پیچھے نہ رہیں۔

آج کل ملک کے بعض حلقوں میں دو متضاد خیالات پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان کی تہذیب کے بنانے اور سنوارنے میں مسلمانوں کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ میں اس خیال سے اختلاف کرتا ہوں اور یہ نمائش اس قسم کے تمام شبہات کا نہایت مدلل اور زبردست جواب ہے۔ برخلاف اس کے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو عام ہندوستانی تہذیب سے کوئی خاص تعلق رکھنے کی ضرورت نہیں اور انھیں اس رنگا رنگ باغ کی آرائش سے کوئی مطلب نہ رکھنا چاہیئے

میں اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کرسکتا کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب کا تانا بانا ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں، غرض تمام جماعتوں کی کوشش اور میل جول سے تیار رہا ہے۔ ہندوستان کی فن موسیقی کے ارتقاء کا میں نے مدت دراز تک اور بہت غور سے مطالعہ کیا ہے اور اس میں اسی صداقت کو کارفرما پایا ہے اکثر و بیشتر دوسرے علوم و فنون کا بھی یہی حال ہے اور جب آپ نظر غور سے اس نمائش کو ملاحظہ کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ماضی میں کس طرح مسلمانوں نے فیاضی کے ساتھ اپنی ذہنی اور جمالی صلاحیتوں کے ذریعے ہندوستانی تہذیب کے خزانے کو مالا مال کیا ہے مجھے امید ہے کہ ہم اپنی اس روایت کو برقرار رکھیں گے اور جامعہ ملیہ اس ضمن میں شاندار خدمات انجام دے گی۔

اب میں نہایت خوشی کے ساتھ اس جشن جوبلی کا اور نمائش کا افتتاح کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ تقریبوں کا جو سلسلہ آج شروع ہو رہا ہے وہ ہر لحاظ سے کامیاب ہو[1] اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سامنے، مسلمانوں کی خدمت کا جو اعلیٰ اور مکمل نصب العین ہے اس پر عمل کرنے کے لئے ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو خدا کی طرف سے توفیق اور قوم کی طرف سے پوری تائید حاصل ہو۔"

اعلیٰ حضرت کے ارشادات گرامی کے ختم ہونے پر جامعہ کے ایک بچے طارق ارسلان نے اعلیٰ حضرت سے نمائش کا افتتاح فرمانے کی درخواست کی۔ رسم افتتاح کے بعد جناب شیخ الجامعہ صاحب اعلیٰ حضرت کو نمائش کے مختلف حصوں میں معائنے کے لئے لے گئے اور حاضرین جلسہ بھی بڑے شوق سے نمائش کی سیر میں منہمک ہو گئے ۱۲ بجے یہ پُر لطف تقریب بخیر و خوبی ختم ہوئی۔

مذکورہ دو جلسوں کا حال ہم نے رسالہ ہمدرد جامعہ سے نقل کیا ہے۔ اگلے جلسوں کی روئداد ان کے منتظم کی زبانی سنئے۔

۴۔ رسم سنگ بنیاد مسجد جامعہ،
اور علماء کرام کا جلسہ۔
۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء جمعہ وقت ۲ بجے۔

ہندوستان کے مشہور و مقتدر علمائے کرام کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ جامعہ کے جشن سیمیں میں شریک ہوں، اور اپنے پاکیزہ افکار و خیالات سے اہل جلسہ کو مستفید کریں۔ جامعہ کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے ازراہ عنایت اسے شرف قبولیت بخشا تھا۔

جامعہ نگر میں جوبلی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ عین وقت پر دہلی اور اس کے اطراف میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ فضا مکدر ہو گئی۔ کرفیو آرڈر نے اور زیادہ دلوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا۔ چہار شنبے کا تمام دن میں نے شہر میں گذارا اور دہلی کے عربی مدارس اور اہل علم کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ۱۵ نومبر کو جمعے کی نماز جامعہ نگر میں ادا کریں تاکہ ان کی موجودگی میں سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ادا ہو۔ مختلف اطراف و جوانب میں اوقات نماز کے تختے آویزاں تھے۔ مجوزہ پروگرام کے مطابق ٹھیک ۱۲ ۱/۲ بجے ایک خوش الحان نوجوان نے جمعے کی اذان دی حضرت مولانا قاری حافظ محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے جمعے کی نماز پڑھائی دو بجے سنگ بنیاد رکھنے کا وقت مقرر تھا، جامعہ کے ایک طالب علم نے قرآن پاک کی تلاوت کی مدرسہ ابتدائی کے سب سے چھوٹے بچے سعید خاں اچگ زئی نے بسم اللہ کہہ کر اپنے معصوم ہاتھوں سے مسجد کی پہلی اینٹ رکھی اور مولانائے محترم نے نہایت

اثر انگیز انداز میں دعا فرمائی۔

شب کو ۹ بجے علمائے کرام کی تقریریں تھیں، جوبلی ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ تقریباً ہر صوبے کے ممتاز اہل علم شریک جلسہ تھے۔ ناظم دینیات نے حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے درخواست کی کہ وہ جلسے کی صدارت فرمائیں قرآن پاک کی تلاوت کے بعد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب استاد دارالعلوم ندوہ لکھنؤ نے اپنا مقالہ "عہد نبوی میں نظام تعلیم" پڑھا مضمون دلچسپ اثر انگیز اور معنی خیز تھا، تمام حاضرین لطف اندوز ہوئے۔

اب مولانا محمد طیب صاحب نے "تہذیب نفس اور تعلیم و تربیت" پر اپنا مضمون سنایا۔ جو نہایت محنت اور غور و فکر کا نتیجہ تھا، پیرایۂ بیان دل نشین اور انداز تحریر اچھوتا تھا، اہل علم بار بار سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم جمعیۃ علمائے ہند نے نظام تعلیم پر عالمانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔

آخر میں فاضل صدر نے اپنی تقریر میں جامعہ کے کاموں پر تبصرہ فرمایا اس کے ۲۵ سالہ کارناموں پر مبارک باد پیش کی۔ اس کی سعی و کوشش کو سراہا۔ آئندہ منصوبوں میں کامیابی کی دعا، کی اور تمام حاضرین کا شکریہ ادا کر کے گیارہ بجے شب کو جلسہ ختم ہونے کا اعلان فرمایا۔

جلسے کی یہ مختصر کارروائی ہے جو اوپر درج کی گئی ہیں اس موقع پر اپنا یہ خوشگوار فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے رفقائے کار کا دل سے شکریہ ادا کروں، جنھوں نے اپنی ان تھک سعی و کوشش سے اس جلسے کو کامیاب کیا۔ ہنگامہ آرائی اور کرفیو آرڈر کی وجہ سے دل بیٹھا جارہا تھا مگر مولانا جمال الدین صاحب، راجہ نذیر احمد صاحب اور عبدالواحد صاحب سندھی نے دن رات ایک کر کے اپنی لگاتار

محنت سے وہ کام کر کے دکھایا کہ بایدوشاید۔ جشن سیمیں کا یہ پہلا دن تھا اور سب سے پہلے شعبہ دینیات ہی کا امتحان تھا، خدا کا شکر ہے کہ جلسہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔

(مولانا، خواجہ) عبدالحئی
ناظم دینیات

۴۔ خواتین کا جلسہ۔

۱۷ر نومبر ۱۹۴۶ء، جمعہ وقت ۴½ بجے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں کے موقع پر خواتین جامعہ نگر اور خواتین دہلی کا ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ شہر کی فضا بہت خطرناک تھی اور ۶ بجے سے کرفیو تھا خیال یہ تھا کہ عورتیں بالکل نہیں آئیں گی لیکن باوجود ناسازگار حالات ہونے کے جلسے میں کافی خواتین کا اجتماع ہو گیا تھا۔ خواتین کے خیر مقدم وغیرہ کے لئے جامعہ نگر کی بڑی لڑکیوں اور خواتین نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا اور انتظام بحیثیت مجموعی اچھا رہا۔ شرکت کرنے والی خواتین میں علاوہ مسلمان عورتوں کے کئی یورپین اور ہندو بہنیں بھی شامل تھیں۔

بیگم مجیب صاحبہ نے بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کے لئے صدارت کی تحریک اور بیگم عتیق صاحبہ نے تائید کی۔ جامعہ کی ایک ننھی بچی عصمت نے صدر صاحبہ کے گلے میں نقرئی ہار ڈالا۔ جلسے کی ابتدا۔ سیدہ سعادت فاطمہ نے کلام پاک کی تلاوت سے کی۔ تلاوت کے بعد جامعہ کی دس چھوٹی چھوٹی بچیوں نے ترنم کے ساتھ حمد پڑھی۔ پھر صدر صاحبہ نے اپنی لکھی ہوئی تقریر پڑھی اور اس کے علاوہ زبانی تقریر بھی فرمائی جس میں جامعہ سے مولانا محمد علی مرحوم کا تعلق، اپنی دلچسپی کا ذکر اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمات کو سراہا۔ صدر صاحبہ کی تقریر کے بعد سیدہ کرامت فاطمہ فرحت نے اپنی نظم "جامعہ کی جوبلی" سنائی جسے حاضرین نے بے حد

پسند کیا۔ پھر صالحہ عابد حسین نے تقریر کی جس میں بہنوں کا خیر مقدم کرنے کے بعد انھیں اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ جامعہ ملیہ میں جلد سے جلد لڑکیوں کے اسکول کا قیام ہونا چاہیئے اور آپ سب بہنوں کا فرض ہے کہ اس کے لئے دل وجان سے کوشش کریں۔ پھر سلمہ عمر صاحبہ نے علامہ اقبال کی فارسی نظم "خطاب بہ امہات" ترنم کے ساتھ پڑھی۔ اس کے بعد خواجہ بانو صاحبہ نے تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد نیر جہاں شعاع صاحبہ نے اپنی مزاحیہ نظم لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں پڑھ کر سنائی جس سے خواتین بہت محظوظ ہوئیں۔ ایک چھوٹی سی تقریر بیگم یار محمد خاں نے کی اور حمیدہ سلطان صاحبہ نے اپنی نظم جامعہ پڑھ کر سنائی، سیدہ فرحت کی نظم "علم باعمل" سیدہ سعادت فاطمہ نے پڑھی۔

آخر میں بیگم صاحبہ خواجہ عبدالمجید نے ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں جامعہ ملیہ کے کارکنوں اور طلبا کو جشن سیمیں کی مبارک باد پیش کرنے کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جلد سے جلد لڑکیوں کے لئے ایک ہائی اسکول قائم کریں۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ صاحب نے اس ریزولیوشن کی تائید میں ایک مختصر مگر جامع تقریر کی۔ بیگم شعیب قریشی صاحبہ نے بھی ایک چھوٹی سی تائیدی تقریر کی اور باتفاق رائے یہ رزولیوشن پاس ہو گیا۔ آخر میں صدر صاحبہ نے سب بہنوں کا اور صالحہ عابد حسین نے صدر صاحبہ اور مہمان خواتین کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا جلسہ ختم ہونے کے بعد اکثر خواتین نے اصرار کر کے چندے کی کچھ رقمیں لکھائیں جن کی مجموعی تعداد آٹھ سو سے کچھ زائد تھی۔ صالحہ عابد حسین

جامعہ اسکاؤٹس کے مظاہرے

۱۶ر نومبر ۱۹۴۶ء سنیچر وقت ۹ بجے صبح

...... کھیل کے میدان میں جامعہ اسکاؤٹس کے خیمے لگے تھے۔

خواجہ عبدالحمید صاحب کی آمد پر جنرل سلامی ہوئی۔ نونہالوں نے نعرے لگائے۔ محرابی تسلیم ہوئی۔ اسکاؤٹ افسران کا تعارف کرایا گیا پھر صدر نے کیمپ کا معائنہ کیا۔ اجتماع کے موقع پر محمد احمد سعید نے کلام پاک کی تلاوت کی۔ بچوں نے صدر صاحب کو ہار پہنائے۔ جھنڈا لہرایا گیا تعلیمی مرکز کے طلباء نے ترانہ پڑھا۔ اسکاؤٹس نے نعرے لگائے گئے۔ صدر صاحب نے تقریر کی۔ اس کے بعد بالترتیب ماس ڈرل۔ فینسنگ مارچ۔ لاٹھی۔ فرسٹ ایڈ، جھنڈل، پول ڈرل، وغیرہ ہوئی پھر تمام لوگ اوکھلا نہر پر گئے جہاں پیراکی کے کرتب کا مظاہرہ ہوا۔ انعامات دئے گئے۔

۶۔ کالج کے طلبا کا کل ہند مباحثہ ۔ محمد اخلاص احمد صدیقی

۱۶ نومبر ۱۹۴۶ء سنیچر وقت ۲ ½ بجے۔

.... اس مباحثہ کا موضوع تھا۔ ایوان کی رائے میں ہندوستان کی نجات اشتراکیت قبول کر لینے میں ہے" اس میں دہلی کے کالجوں کے علاوہ علی گڈھ، لکھنؤ۔ حیدر آباد دکن۔ لاہور کے کالجوں کے طلبہ نے حصّہ لیا۔

صدر جلسہ جناب ڈاکٹر سید حسین صاحب کو سب سے پہلے ہار پہنایا گیا اور موصوف نے تلاوت قرآن پاک کے بعد جلسہ کا آغاز کیا۔

مقررین نے خوب گرما گرم بحثیں کیں۔ اور حاضرین نے بھی کافی دلچسپی اور پورے سکون واطمینان سے تمام تقریریں سُنیں۔ بیچ میں جلسہ نماز عصر کے لئے ملتوی ہوا۔ بعد نماز پھر شروع ہوا جس کا سلسلہ مغرب کی نماز تک چلتا رہا۔ چونکہ مغرب کی نماز کے بعد جوبلی کے دوسرے پروگرام شروع ہونے والے تھے اس لئے جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن مغرب بعد پھر جلسہ شروع ہوا۔ اور جج حضرات نے (جن میں ۱۔ ڈاکٹر اشرف صاحب۔ ۲۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ۳۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب حصاری تھے) اپنا فیصلہ سنا دیا فیصلے کی رو سے،

اوّل ، گلزار صاحب ، ہندو کالج دہلی

دوم ، احسان صلاح الدین صاحب گورنمنٹ کالج لاہور

سوم ، احسان رشید صدیقی صاحب مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ قرار پائے۔
جن کو انعامات میں کتابیں دی گئیں اور چونکہ سب ٹیموں میں سب سے زیادہ نمبر مسلم یونیورسٹی نے حاصل کئے تھے اس لئے ٹرافی ان کو دی گئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے چونکہ ٹرافی پیش کی تھی اس لئے یہاں کے نمائندوں نے مباحثے میں حصّہ لیا مگر یہ اعلان کر دیا کہ وہ مقابلے میں شریک نہ سمجھے جائیں۔ آخر میں جناب صدر اور جناب ڈاکٹر اشرف صاحب نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور خاکسار نے جناب صدر، مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ سوا چھے بجے ختم ہوا۔

عبدالحلیم ندوی

۷۔ طلبار قدیم کا جلسہ۔

اسی دن ۵ بجے شام کو طلباء قدیم کا جلسہ ہوا۔

۸۔ ڈراما:۔

رات میں ۹ بجے پروفیسر محمد مجیب صاحب کا نیا ڈرامہ "خانہ جنگی" کھیلا گیا۔ یہ آپ ہی کی رہنمائی میں تیار ہوا تھا۔ جوبلی کا خاص پنڈال حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔ میک اپ، اداکاری، ڈرامے کے ماحول کے مطابق خوب تھی۔

اداکاروں میں شیخ سرمد کا پارٹ عبیدالحق صاحب۔ شاہ جہاں، احسان الحق صاحب۔ اورنگ زیب، محمد اکرام خاں صاحب۔ ملّا ابوالقاسم، سید حسن صاحب ابراہیم بدخشانی، سید مجاہد حسین صاحب زیدی۔ اعتماد خاں، عبدالقوی بشیر احمد صاحب انصاری مرحوم۔ دارا شکوہ، نور احمد صاحب شاگرد ...... حافظ رضی الدین صاحب، علی قوال، اشفاق محمد خاں صاحب۔ لڑکا، حسن شمسی نے ادا کیا تھا

تیسرے دن صبح دس بجے جوبلی کا خاص جلسہ ہوا، اس کی کارروائی آخر میں درج ہے۔

۹۔ علمی مقالے۔

۱۷ نومبر اتوار، وقت ۲ ½ بجے۔

جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مولوی یحییٰ صاحب اعظمی تنہا کی ایک نظم کے کچھ بند جو انھوں نے "جمال جامعہ" کے نام سے لکھی تھی۔ اشتیاق احمد مودی متعلم ثانوی چہارم نے ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنائے جس نے حاضرین کے دلوں کو گرما دیا۔

سہ پہر کا یہ اجلاس اصل میں دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ ادبی مقالوں سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا تعلیمی مباحث سے۔ دونوں جلسوں کے لئے ایک ہی صدر کا انتخاب کیا گیا یعنی ڈاکٹر عبدالحق صاحب، پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (دکن) کا صدر نے مناسب الفاظ میں جلسے کی نوعیت بیان کی اس کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے جناب آل احمد صاحب سرور نے اپنے مقالے کا خلاصہ پیش کیا جس میں نہایت قابلیت کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ "تنقید کیا ہے"۔

اس کے بعد جناب سید وقار عظیم صاحب نے اُردو افسانے پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا۔

اس سلسلے کا آخری مقالہ جناب امتیاز علی صاحب عرشی کا "اُردو ادب کی تعمیر میں پٹھانوں کا حصہ" کے عنوان سے تھا۔ عرشی صاحب نے اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ ان کے علاوہ دو اور مقالے بھی آئے تھے جن کے مقالہ نگار تشریف نہیں لائے تھے اس لئے صرف مقالوں کے عنوانات پڑھ کر سنائے

گئے۔ (۱) فارسی اور اُردو شاعری میں تخلص کی رسم، از ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب (۲) اُردو ادبی تنقید کی تاریخ از ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ۔

اس حصے کے ختم ہونے ہوئے عصر کا وقت آگیا تھا۔ نماز کے وقفے کے بعد دوسرا جلسہ جو تعلیمی مباحث سے تعلق رکھتا تھا شروع ہوا۔ اس حصے کا عام موضوع تھا کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تعلیم" سب سے پہلے ڈاکٹر سید حسین صاحب نے اس موضوع کو پیش کیا اور اس سلسلے میں آپ نے انگریزی زبان میں ایک نہایت مبسوط تقریر کی جس میں دنیا کے اور اسلامی ممالک میں دینی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان کی دینی ضروریات سے نہایت خوبی سے بحث کی۔

آپ کی تقریر کے بعد مشہور نومسلم جناب محمد اسد صاحب نے تقریر کی جس میں آپ نے دینی تعلیم کا مقصد اور اس کی ضروریات بیان فرمائیں۔

اس کے بعد جناب اسداللہ صاحب کاظمی نے مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مقالے میں آپ نے ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی و دنیوی تعلیمی ضروریات سے نہایت حسن و خوبی سے بحث کی تھی، وقت چونکہ بہت کم تھا اس لئے پورا مقالہ پڑھا نہیں جاسکا اور جلسہ مغرب کے وقت ختم ہوگیا۔ جناب صدر بھی خود اس موضوع پر کچھ فرمانا چاہتے تھے لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے اس کا موقع نہ نکل سکا۔

ان تقریروں اور مقالوں کے علاوہ بعض اور حضرات بھی تھے جنھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا تھا یا بیان فرمانا چاہتے تھے لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے ان حضرات کے لئے بھی وقت نہ نکل سکا۔ ان حضرات میں ایک علامہ موسیٰ جاراللہ صاحب کا مقالہ تھا جو آپ نے عربی زبان میں ایک رسالے کی صورت

میں بمبئی سے طبع کراکر بھیجا تھا۔ دوسرا مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا مقالہ تھا۔ تیسرا پروفیسر عبدالغفور صاحب کا تھا۔

یہ جلسہ اپنی نوعیت اور موضوع کے لحاظ سے جوبلی کے جلسوں میں بہت اہم اور قابل قدر تھا اور وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے مقالہ نگاروں، مقررین اور حاضرین کے لحاظ سے ہر طرح پر نہایت بارونق اور کامیاب جلسہ کہا جا سکتا ہے۔

جناب شفیع الدین صاحب نیر نے متعلقہ حضرات سے مقالے لکھوانے کا جو اہم کام انجام دیا ہے اس کے لئے میں موصوف کا شکر گذار ہوں۔

سعید انصاری

اسی دن ۵ بجے شام کو امیر جامعہ کی طرف سے عصرانہ دیا گیا۔

۱۰۔ مشاعرہ۔

۱۷؍ نومبر ۱۹۴۶ء اتوار، وقت ۹ بجے شب۔

آج رات کا خاص پروگرام مشاعرہ تھا، لیکن آدھ گھنٹے کے لئے مدرسہ ثانوی کے طلباء کی بیت بازی کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ ایک پارٹی کے سرگروہ محمد اسمٰعیل سعد اور دوسری پارٹی کے سرگروہ اشتیاق محمد خاں تھے۔ اشعار سنانے کے لئے یہ شرط تھی کہ صرف اقبال۔ حالی اور اکبر کے شعر ہوں۔ تیاری اچھی تھی، بیت بازی بہت کامیاب رہی۔ طلباء نے شعر بھی بہت اچھے دئے، پڑھے بھی اچھی طرح سے اور کافی مشق کی وجہ سے کوئی بچہ مجمع سے متاثر نہیں ہوا۔ دونوں پارٹیاں برابر رہیں۔ اس کام میں میرے رفیق کار جناب سید مجاہد حسین صاحب زیدی نے میرا بہت ہاتھ بٹایا۔ اصل چیز مشاعرہ تھی، اس کی شرکت کے لئے بیرونی اور مقامی کم و بیش ساٹھ شعراء کو دعوت دی گئی تھی۔

مقامی شعراء میں سے حضرت یکتا دہلوی، حضرت نہال سیوہاردی، حضرت گوپی ناتھ امن، ڈاکٹر تاثیر، لفٹننٹ کرنل فیض احمد صاحب فیض، حضرت اسد ملتانی، جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، حضرت قیصر زیدی، سر شنکر لال صاحب اور سحاب صاحبہ قزلباش شریک مشاعرہ ہوئے اور انہوں نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ ماہر القادری صاحب لکھنؤ سے اسٹیشن پر ایسے وقت آئے کہ کرفیو آرڈر اور اس سے متعلق دشواریوں کی وجہ سے جلسہ گاہ تک نہ آسکے۔

بیرونی شعراء میں وعدہ تو پچیس سے زیادہ شعراء نے کیا تھا جن میں حضرت جگر مراد آبادی، حضرت مجروح سلطان پوری، حضرت سیماب اکبر آبادی اور حضرت صفی لکھنوی جیسے شعراء شامل تھے۔ مگر ملک کی فضا یا دیگر عوارض کی وجہ سے صرف مندرجہ ذیل حضرات شریک ہوسکے۔ حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت روش صدیقی، حضرت آل احمد سرور، حضرت علامہ حسین میر کاشمیری، حضرت مداح احمق بھپوندوی، حضرت قدیر لکھنوی، حضرت بسمل ٹونکی، حضرت حفیظ ہوشیار پوری، حضرت رگھوپتی سہائے، فراق گورکھپوری، حضرت مظفر شاہجہاں پوری۔

حضرت صفی لکھنوی، حضرت بیخود دہلوی نے طرحی غزلیں بھیج دی تھیں جو پڑھ کر سنا دی گئیں۔ حضرت یوسف ظفر، حضرت مختار صاحب آزاد، حضرت گلزار، حضرت محشر نے بھی حصہ لیا تھا۔ امیر جامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کی بھی ایک غزل اُن کے صاحبزادے نے پڑھ کر سنائی۔

موقع کے لحاظ سے حضرت صفی کا ایک شعر، حضرت یکتا کی دو رباعیاں اور حضرت واصف کی ایک نظم اور حضرت حفیظ جالندھری کی خاص نظم ایسی ہے جن میں جامعہ کا ذکر تھا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی طرف سے ایک گھنٹے تک مخصوص شعراء کا کلام نشر بھی کیا گیا۔

مشاعرہ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا اور ایک بجے ختم ہوا۔ مشاعرے کے صدر مولانا حسرت موہانی تشریف نہیں لا سکے تھے اس لئے صدارت کے فرائض مولانا محمد اسلم صاحب جے راج پوری نے انجام دئے۔

حاضرین کی تعداد بہت کافی تھی۔ وسیع پنڈال بھرا ہوا تھا۔ اسٹیج پر ملک کے مشہور ادیب اور بزرگ رونق افروز تھے۔ مشاعرہ بخیر وخوبی ختم ہوا۔

مشاعرے کے انتظام کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، نے میری ہر موقع پر مدد کی۔ ابوالکاظم حضرت قیصر صاحب زیدی اور برکت علی صاحب فراق بھی آخر میں اس کمیٹی میں شامل کر دئے گئے تھے۔ ان سب کی اعانت کا میں شکر گزار ہوں۔

محمد شفیع الدین نیر

۱۱۔ جلسہ تقسیم اسناد

۱۸ نومبر ۴۶ء پیر، وقت ۱۰ بجے

جلسہ ٹھیک دس بجے جوبلی پنڈال میں منعقد ہوا۔ جن طلباء کو سند ملنے والی تھی وہ سبز رنگ کی عبائیں پہنے ہوئے پنڈال میں اپنی مقررہ جگہوں پر بیٹھے تھے۔ دس بجنے سے پہلے سائنس کلاس کے سامنے جامعہ کے ۳۲ء سے پہلے کے گریجویٹس اور بعض معزز مہمان، مسجل، امیر جامعہ، شیخ الجامعہ، جامعہ کے مختلف شعبوں کے ناظم جمع ہوئے اور اپنے اپنے چغے زیب تن کئے۔ پھر مقررہ ترتیب کے مطابق قطار میں یہ جلوس روانہ ہوا۔ جلوس کے پنڈال میں پہنچنے پر تمام حاضرین کھڑے ہو گئے جب سب لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو مسجل نے امیر جامعہ سے جلسہ کا افتتاح فرمانے کی درخواست کی۔ امیر جامعہ کرسئ صدارت پر تشریف رکھتے تھے۔ اب انھوں نے جلسے کی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سب سے پہلے عبدالباری طالب علم نے

تلاوت کلام مجید کی، تلاوت کردہ آیات کا ترجمہ ناظم دینیات خواجہ عبدالحی صاحب نے سنایا۔ اس کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے جلسۂ تقسیم اسناد کے متعلق کچھ تمہیدی کلمات ارشاد فرمائے۔

مستجل صاحب نے تمام سند پانے والے امیدواروں سے عہد لیا۔ تمام اُمیدوار اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ مستجل عہد کے جملے ایک ایک کر کے پڑھتا اور تمام امیدوار انھیں ہم آواز ہو کر دُہراتے۔

عہد لینے کے بعد جناب ای۔ جے کیلاٹ صاحب پرنسپل جامعہ کالج نے ایک ایک امیدوار کا نام لے کر پکارنا شروع کیا۔ ہر اُمیدوار اسٹیج پر جا کر امیر جامعہ سے اپنی سند لے کر ان سے مصافحہ کرتا اور واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا۔

جب اسناد کی تقسیم ختم ہو گئی تو امیر جامعہ نے مختصر الفاظ میں سر عبدالقادر کا تعارف فرمایا اور ان سے خطبہ پڑھنے کی درخواست کی۔ خطبہ پہلے سے چھپ گیا تھا اور حاضرین کے پاس موجود تھا۔ اس پر مغز خطبے میں انھوں نے تمام سند پانے والے طلبا کو مبارک باد دی اور انھیں نصیحتیں کیں کہ جو کام وہ کریں پورے شوق اور انہماک سے اسے پورا کرنے کی کوشش کریں۔ جامعہ کی تاریخ پر بھی انھوں نے اس خطبے میں روشنی ڈالی۔ خطبہ بہت دلچسپ تھا اور زبان ٹکسالی تھی۔

سر عبدالقادر کے خطبے کے بعد امیر جامعہ نے تقریر کی جس میں جامعہ کی زندگی اس میں ان کا حصہ اور بعض دوسری دلچسپ باتیں بیان فرمائیں۔ موصوف نے بھی سند پانے والے طلبا کو نصیحت کی اور مبارک باد دی۔ آپ نے فرمایا کہ

"جامعہ کی سند لینے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سپرد لی ہے جسے پورا کرنا آپ کا فرض اولین ہے آپ کو ملک اور قوم کی خدمت کا اپنے کام میں لحاظ رکھنا چاہیئے اور اپنے

آپ کو ایک اچھا، سچا، مضبوط اور محنتی شہری بنانا چاہیئے۔
آخر میں آپ نے سر عبدالقادر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ تکلیف اٹھا کر جامعہ تشریف لائے اور خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد دیگر حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے امیر جامعہ نے جلسے کے برخاست کرنے کا اعلان فرمایا۔

ارشاد الحق
مسجل جامعہ

خطبے کے چند اقتباسات یہ ہیں۔

پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہیئے، وہ رواداری ہے یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں..........................

.... دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی مخاصمت یا نفرت سے زیادہ کوئی بیماری نہیں ہو سکتی۔ ہم آج کل ہندوستان کی تاریخ کے جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں بدقسمتی سے یہ بیماری زوروں پر ہے.....

.... ہم آزادی کی ایک ضروری شرط کو بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ آزادی جب حاصل ہوتی ہے کہ انسان اپنے ہاتھ

سے اس کو محدود رکھنا سیکھ جائے اور کسی معاملے میں حد سے نہ گزرے۔ نہ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر انھیں اشتعال دے اور نہ اشتعال سے دست درازیوں کا حوصلہ بڑھ جائے۔ اس جلتی آگ پہ پانی ڈالنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر اس جامعہ سے سند پانے والے نوجوان اور اسی طرح کے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ عزم کر لیں کہ وہ اپنی تقریر اور تحریر سے اور اپنے مجموعی اثر سے باہمی صلح کی کوشش کریں گے اور لڑائی جھگڑے کو مٹانے میں مساعی ہوں گے تو ملک کی زہریلی اور مکدر فضا صاف ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

قوم و ملت کے بہی خواہوں کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ باہمی اتفاق اور محبت کی تلقین کریں تاکہ ہر کہ و مہ یہ سمجھ جائے کہ سیاسی نظریئے اگر مختلف بھی ہوں تو بھی باہمی میل جول پر ان کا اثر نہیں پڑنے دینا چاہیئے کیوں کہ آخر ہندو مسلمان دونوں اسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں انھیں ایک دوسرے سے دیوار بہ دیوار رہنا ہے اور یہیں پیوند زمین ہوجانا چاہیئے۔ نہ ہندوؤں میں سے وہ لوگ جو پہلے وسط ایشیا یا غرب ایشیا سے یہاں آئے تھے، پھر وہاں جا کر آباد ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے وہ حصے جو عرب یا ایران یا افغانستان یا بخارا اور سمرقند سے آئے تھے، پھر وہاں جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نسل اور خون کے لحاظ سے بھی یہیں کی پیداوار ہے اس لئے حق ہمسائیگی کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے ہمدرد بنیں اور ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ اور ایک دوسرے کی دل آزاری اور توہین اور تضحیک سے گریز کریں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں چاہتا ہوں کہ اس جامعہ میں پڑھے ہوئے طالب علم نہ صرف خود اپنے اپنے ہنر کو ذریعہ معاش بنائیں، بلکہ اس اصول کی تبلیغ کریں اور وہ جھجک جو اب تک بعض دلوں میں ہے کہ وہ پیشہ، قلم کو نسبتاً بہتر اور ہاتھ سے کام کرنے کو کم معزز سمجھتے ہیں۔ لوگوں کی طبائع سے نکل جائے۔ کسی ملک کے عوام میں وہ خودداری جو آزادی کی بنیاد ہے پیدا نہیں ہو سکتی۔ جب تک اہل حرفت و صنعت کو نظر حقارت سے دیکھنے کا رواج ہو۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آکر حکومت کی ہے۔ ان کی کامیابی کا ایک راز یہی تھا کہ وہ صنعت و حرفت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے جس شخص نے دخانی انجن ایجاد کر کے قوموں کی قسمت اور نظام کو دفعتاً پلٹا دے دیا وہ صنّاع ہی تھا ....

....

بعض محدود کمپنیوں میں ہندو اور مسلمان مل کر کام کر رہے ہیں، لیکن عام طور پر میلان یہی ہے کہ ہندو ہندو کمپنیاں اور مسلمان مسلمان کمپنیاں قائم کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر تو اشتراک عمل میں سہولت رہتی ہے مگر انجام کار یہ میلان ایک دوسرے سے علیٰحدگی کی طرف لے جاتا ہے اور جس مغائرت کی شکایت کی جاتی ہے وہ بڑھتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ میدان ہے جس میں مل کر کام کرنے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس میں تنگ دلی خواہ ایک جانب سے ہو یا دوسری سے، دور سے ہونی چاہیئے اور اسے دور کرنے کی کوشش میں اس جامعہ کے طلبہ کو خاص طور پر حصہ لینا چاہیئے کیونکہ ان کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار ایسے اشخاص رہے ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کے موافق رہے ہیں اور جنھوں نے اپنے ہندو ہم وطنوں کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ

اٹھا نہیں رکھا ....

....

کسی قوم کی تجارتی ترقی بنکوں کے نظام اور عمل سے واقفیت، اور بنکوں کے وجود کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ملت اسلامیہ بنکوں کی اہمیت سے بے پرواہے اور نہ بیمہ کمپنیوں میں ان کا کوئی متناسب حصہ ہے۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طلبہ کو اس مضمون سے آشنا کرنے کے لئے اپنے مدرسوں میں سیونگ بنک اور باہمی تعاون کی سوسائٹیاں قائم کی ہیں اور طلبہ کو خود ان کا انتظام کرنے کا موقع دیا ہے مگر اس مضمون کی وسعت کے لحاظ سے یہ ابجد خوانی اور کنڈر گارٹن کی تعلیم کا درجہ سمجھا جانا چاہیئے۔ اب یہ کام فارغ التحصیل طلبہ کا ہوگا وہ اس خشک مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں اور اس راستے میں اپنے ہم عمروں اور دوستوں کی رہنمائی کریں۔ ....

....

آپ کی جامعہ میں جو پہلا خطبہ تقسیم اسناد پڑھا گیا وہ ملک کے ایک نامور سائنس داں پی، سی۔ رائے کا عالمانہ خطبہ تھا جو انگریزی زبان میں دیا گیا تھا۔ اس میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ سائنس کی ترقی سے دنیا میں کیا کیا نتائج پیدا ہوئے ہیں اور ابھی کتنے بڑے امکانات باقی ہیں۔ انھوں نے آپ کو مسلمانوں کی تاریخ سے بہت سے حوالے دے کر یہ بھی بتایا تھا کہ ایک وقت میں مسلمان علوم فلسفہ اور سائنس کی مشعل لے کر گھر سے نکلے تھے اور انھوں نے اس وقت یورپ کی جہالت اور تاریکی کو علم کی روشنی سے منور کردیا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور شاگرد عالم فاضل

بن گئے اور استادوں کی اولاد جاہل بن گئی۔ اب زمانے نے پھر کروٹ لی ہے اور آپ لوگوں میں جو طلبہ سائنس پڑھتے رہے ہیں انھیں اس کی قدر و قیمت کا کافی احساس ہو گیا ہے اب ان کا کام ہے جستجو اور تلاش کی لالٹین لے کر اس مضمون کی گہرائیوں تک پہنچیں اور اس میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کریں ۔ ....

....

عزیزو۔ آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے ہیں جس میں انسان کی قوت کے امکانات بے حد وسیع ہو گئے ہیں۔ بہت سے پوشیدہ حقائق آپ کے گرد و پیش موجود ہیں اور ان کے خزانوں کی کلید سائنس کے ہاتھوں میں ہے اور سائنس کی کتابیں اور تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ قفل کھولئے اور خزائن سے دنیا کو مالا مال کر دیجئے۔
اس طولانی تمہید کا اختصار یہ ہے کہ آپ نے جو علم یہاں حاصل کئے ہیں اب ان کے استعمال اور صحیح استعمال کا وقت آیا ہے۔ بلند ارادے اور حوصلے لے کر درسگاہ سے باہر قدم رکھئے کہ آپ کا اصلی فرض یہ ہے کہ جو کام کریں اور جو فن پسند کریں اس میں مصروفیت کے ساتھ یہ مدنظر رہے کہ ملک و ملت کی خدمت آپ کے ذمے ہے۔ ملک و ملت کے لئے سچی محبت آپ کے دل میں ہو اور ان کی فلاح کے لئے ہر قربانی اور ہر ایثار کے لئے آپ تیار ہوں۔ بہت مدت ہوئی ایک سیاح جو ترکی کے علاوہ فارسی، عربی خوب جانتے تھے لاہور میں وارد ہوئے۔ میں شاید اس وقت اسکول کے کسی درجے میں پڑھتا تھا۔ میں اُن کی تعریف سُن کر انھیں دیکھنے گیا اور میں نے ان سے

کہا کہ کوئی ہدایت مجھے دیتے جائیں۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا جو میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

من نمی گویم سمندر باش یا پروانہ باش
گر بہ فکر سوختن باشی برو مردانہ باش"

سہ پہر میں جامعہ کے نئے اور پرانے طلبہ کا عصرانہ ہوا۔ رات میں کیمپ فائر ہوا۔ اب ہم آخر میں جوبلی کے خاص جلسے کی روئداد درج کرتے ہیں۔

۱۲۔ جوبلی کا خاص جلسہ

۱۷ نومبر ۱۹۴۶ء، اتوار، وقت ۱۰ بجے

پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دس بجنے سے کچھ دیر پہلے اس جلسے کے صدر نواب صاحب بھوپال تشریف لائے۔ جامعہ کے اسکاؤٹس نے ان کا استقبال کیا اور بینڈ نے سلامی دی۔ ان کے بعد مسٹر آصف علی، پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور راج گوپال آچاری تشریف لائے۔ حاضرین نے پرجوش نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ ان کے پیچھے پیچھے مسٹر جناح اور ان کے ساتھ مس فاطمہ جناح تشریف لائیں۔ ان کے آنے پر پنڈال نعروں سے گونج اٹھا۔ لوگ ان کو دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ جب سب لوگ اسٹیج پر پہنچ گئے اور نعروں کا شور ختم ہوا تو امیر جامعہ جناب عبدالمجید خواجہ صاحب نے نواب صاحب بھوپال سے صدارت کی درخواست کی۔ ان کی اس درخواست پر نواب صاحب بھوپال آکر کرسی صدارت پر تشریف فرما ہو گئے۔ ان کے بائیں طرف شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور دائیں طرف کرسی پر امیر جامعہ تشریف رکھتے تھے، اسٹیج پر پہلی قطار میں ایک طرف مسٹر جناح، مس فاطمہ جناح اور لیاقت علی خاں وغیرہ بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف مولانا آزاد، پنڈت نہرو، آصف علی، راج گوپال آچاری اور بعض

دوسرے معزز مہمان تشریف رکھتے تھے۔

سب سے پہلے احسان الرحمٰن متعلم ثانوی دوم نے کلام مجید کی تلاوت کی۔
اس کے بعد سفید ٹوپی اور سفید شیروانی میں ملبوس ابتدائی کے کچھ بچوں نے آکر، "جاگو اور جگاؤ" کا ترانہ بڑی خوش الحانی سے پڑھا۔ ترانے کے بعد نواب صاحب بھوپال نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ جس میں انھوں نے جامعہ کی تعریف و توصیف فرمائی اور یہاں کے مخلص کارکنوں کی خدمات کو سراہا۔ اور انھیں جامعہ کا پچیس سالہ جشن سیمیں منانے پر مبارک باد پیش کی۔ ان کے خطبے کے ختم ہونے پر حفیظ جالندھری ایک نظم پڑھنے تشریف لائے۔ ان کے تشریف لانے پر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جامعہ کے متعلقین، انھوں نے ایک نظم سنائی جس سے لوگ بہت محظوظ ہوئے۔

اس کے بعد مختلف یونیورسٹیوں کے نمائندوں نے آکر پیامات سُنائے۔
سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی طرف سے عظمت اللہ صاحب رجسٹرار مسلم یونیورسٹی نے آکر یونیورسٹی کی طرف سے جو پیام بھیجا گیا تھا، سُنایا۔ جامعہ کو اس کے جشن سیمیں منانے پر مبارک باد دی اور یونیورسٹی اور ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر یونیورسٹی کی طرف سے بعض عطیوں کا اعلان کیا۔ ان کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا پیام، ان کے نمائندے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ لکھنؤ یونیورسٹی کی طرف سے کیلاش ناتھ کول نے پیام مبارکباد پیش کیا اور اپنی طرف سے بھی جامعہ کو مبارک باد دی کہ وہ جامعہ کے بہت پرانے طالب علموں میں سے ہیں۔ ان پیامات میں سے بعض خواتین کی انجمنوں کی طرف سے تھے مثلاً شائستہ اختر سہروردی صاحبہ نے انجمن خواتین مسلم لیگ (صوبہ دہلی) کی طرف سے پیام سنایا۔ آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی طرف سے بھی ایک خاتون نے

جوبلی کا خاص جلسہ

ہدیۂ تہنیت پیش کیا۔ حیدرآباد کی طرف سے دو معزز مہمانوں نے جامعہ کو مبارکباد دی جن میں ایک میر اکبر علی صاحب بیرسٹر تھے اور دوسرے ٹیگور اور اقبال سوسائٹی کے صدر و نمائندہ نواب آصف یار جنگ تھے۔ ان زبانی پیامات کے علاوہ جن لوگوں یا اداروں نے تحریری پیامات بھیجے تھے وہ بھی سنائے گئے۔ اُردو کے پیامات سعید انصاری صاحب نے سنائے اور انگریزی کے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے۔ ان پیامات میں سے بعض مصر، امریکہ اور یورپ وغیرہ سے آئے تھے۔ اُردو کے پیامات میں مولانا آزاد اور بعض دوسرے ممتاز رہنماؤں کے پیامات تھے۔

ان تمام پیامات کے سنائے جانے کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جامعہ کی پچیس سال کی مختصر روئداد پیش کی۔ جامعہ کی ابتداء، اس کی مشکلات اور جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کی خدمات کا ذکر کیا۔ جامعہ کے موجودہ اور گزشتہ کاموں کی روئداد اور اس کے آئندہ کے منصوبے اور ارادوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ ذاکر صاحب کی یہ تقریر جامعہ کی پچیس سالہ روئداد ہونے کے علاوہ ایک ادبی کارنامہ بھی ہے۔ ہم اس کے چند اقتباسات یہاں درج کرتے ہیں۔ جامعہ کی آزادی کے بارے میں ذاکر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کی تابع بھی نہیں ہے۔ ذہنی کام کی آزادی اور خود مختاری کا اصول سیاست کی دھوپ چھاؤں سے بے تعلقی، آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیرطلب کاموں میں مؤخر الذکر کی اہمیت کا اقرار، یہ ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہو گئے اور اگرچہ بسا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اس پر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینیوں کو بھی، ان کی

نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر، مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔

بہر حال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی، خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں کہ شاید تنگ دستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو، اور رُک رُک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے۔ جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔

جامعہ کے کاموں کا ذکر کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں۔

"پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ! پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب! جانتا ہوں کہ بے صبری کا حق نہیں، جانتا ہوں کہ کام کی ماہیت میں ہر پختہ کام کی طرح سست رفتاری ہے، جانتا ہوں کہ تعلیمی تربیتی کام میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنا دے۔ چمن بندی ہے، مادی وسائل کی نہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے، دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے اور وہاں، خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے

تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے ان تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں آئے جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں دیکھ کر سیکھ سکیں۔ بست کر اپنا سکیں اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشو و نما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل دین اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ للعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت بنیں۔ یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو۔ وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے اور ہر طرف اپنی تحقیق اور رائے۔۔۔۔ اچھی زندگی کے موتی بکھیریں کہ دولت لٹانے سے ہی بڑھتی ہے، اعلیٰ حضرت، اکابر قوم، اور بلند ہمت دوستو اور عزیزو اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہو سکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیتے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہو کر رہے گا، لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمے بھی ہے۔"

اس سلسلے میں ایک اور جگہ ہے۔

"قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف اسے بگڑنے سے بچا کر نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بنائے رہنے کا طالب ہوتا ہے، آزادی ہو یا نمو پذیر حیات تمدنی، یا اقتدار عالیہ مطلقہ، یہ بس ایک بار حاصل کرنے اور سنبھال کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں۔ یہ انھیں کو ملتی ہیں اور انھیں کے پاس رہ

سکتی ہیں جو ہر دم ان کے از سرِ نو حصول اور ہر دم از سرِ نو تخلیق کی دشواریاں انگیز نے پر تیار ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اسی تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں ؟

فسادات کے سلسلے میں رہنمایانِ قوم کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔

" آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے، آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورے میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے لئے خدمت گزار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے۔ ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں

ہوا مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو بھی کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی، آگ لگی ہوئی ہے، اسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے، مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی میں انتخاب کا ہے، خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھدنے نہ دیجئے۔"

ایک جگہ سیاست اور تعلیمی کام کا مقابلہ کس دلکش مگر زوردار انداز میں کیا ہے "سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیمے دھیمے بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمیوں میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کر لیتا ہے، سیاست استحکام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب، تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے لازماً صبر طلب ہے۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی ہے۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت اس لئے وہ مخدوم ہے یہ خادم، سیاست شدت چاہتی ہے، تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے۔ راہ رو کا رُخ متعین کرتی ہے۔

طلاب عالمیاں دم بدم دگرگون است
منم کہ مدت عمرم بیک طلال گزشت

پنڈال میں خاموشی طاری تھی۔ لوگ اتنے ساکن بیٹھے تھے جیسے کسی ملکوتی نغمے کو سُن کر مسحور ہو گئے ہوں۔

گزشتہ دنوں میں جامعہ کے کارکنوں کی تکالیف کا ذکر کرتے ہوئے جب ذاکر صاحب نے کہا کہ انھوں نے اس پچیس سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائی ہیں اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔

" یہ قوم کے بچّوں کے لئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں۔ اور خود ان کے بچّے اچھی غذا اور اچھے لباس کے لئے ترسے ہیں۔ یہ قوم کی ذہنی زندگی کے لئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا۔ یہ کتابوں کو ترستے ہیں۔ تحقیق وسائل کو ترستے ہیں انھیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کے لئے زمین خرید واتے ہیں اور اپنے مطالبات کو مؤخر کر دیتے ہیں۔"

تو اکثر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ خود ذاکر صاحب کی آواز بھرّا گئی اور وہ آب دیدہ ہو گئے۔ جامعہ کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے جب اس شعر

آغشتہ اند بر سر خارے بخون دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ اند

پر ختم کیا تو پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد راج گوپال اچاریہ، ذاکر صاحب کی درخواست پر مائیکروفون کے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے ایک مختصر تقریر میں جامعہ کی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ دن دور نہیں جب جامعہ ایک

بہت بڑی یونیورسٹی ہو گی جو دوسرے تعلیمی اداروں کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی آخر میں انھوں نے اعلان کیا کہ اس مبارک موقعے پر ہندوستان کی قومی حکومت نے جامعہ کو ۱/۲ ۴ لاکھ روپے دئے ہیں اور ان کے علاوہ ۱/۲ ۲ لاکھ روپے اس لئے دئے ہیں کہ استادوں کے مدرسے کی عمارت وغیرہ کی تکمیل ہو سکے۔

راجہ جی کی تقریر کے بعد ذاکر صاحب نے مسٹر جناح سے درخواست کی کہ وہ اپنے ارشادات سے حاضرین کو محظوظ فرمائیں۔ مسٹر جناح نے بھی جامعہ کو اس جشن سیمیں منانے پر مبارک باد دی اور جامعہ کے ایثار پیشہ خادموں کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جامعہ کو انشاء اللہ اب مالی پریشانیوں سے دوچار نہ ہونا پڑے گا اس کی راہ میں وہ مشکلات پیش نہ آئیں گی جن کی وجہ سے پہلے اس کا کام رکا رہتا تھا۔ تعریفی کلمات کے بعد انھوں نے اپنی تقریر ختم کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تھے۔

اس کے بعد بعض عطیات کے اعلان ہوئے۔ جن میں ایک اعلان نواب صاحب بھاولپور کی طرف سے ان کے وزیر اعظم نے کیا جس میں انھوں نے فرمایا کہ اس مبارک موقعے پر نواب صاحب بھاولپور نے جامعہ کو ایک لاکھ روپے عطا فرمائے ہیں۔ حافظ فیاض احمد صاحب نے، حافظ محمد صدیق صاحب کان پوری کا پیام پڑھ کر سنایا اور ان کی طرف سے پچیس ہزار کے عطیے کا اعلان کیا۔ آخر میں شیخ الجامعہ ذاکر حسین صاحب نے یو پی گورنمنٹ کا تار پڑھ کر سنایا جس میں اس زمین کے جامعہ کو دئے جانے کا ذکر تھا جو جامعہ کی زمینوں سے ملحق ہے اور یو پی گورنمنٹ کے رقبے میں ہے۔

اس کے بعد تقریباً ۱/۲ ۱ بجے یہ جلسہ برخاست ہوا۔

ارشاد الحق
مسجل جامعہ

جوبلی کے موقع پر جن مشاہیر نے پیغامات تہنیت بھیجے ان میں سے چند کے اقتباسات یہاں درج ہیں۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی،

دُعا ہے کہ جامعہ اپنی اس جوبلی میں اس طرح کامیاب ہو کہ وہ اپنے بانیوں کے مقصد نیک پر قائم رہ کر ایسی مسلمان نسل پیدا کرے جو دماغی حیثیت سے مغربی علوم سے بہرہ ور ہو اور قلبی حیثیت سے مدنی آقا کی تعلیم و تربیت سے مالا مال ہو۔

بہر حال جامعہ نے غربت و بیکسی کے دور سے نکل کر اس رُبع صدی میں اپنے مخلص کارکنوں اور کارگزاروں کی ان تھک کوششوں سے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ یقیناً ہماری نئی تعلیمی ترقی کے لئے خوش آئند مستقبل کی بشارت ہے اور مسلمانوں کی نئی صبح سعادت کے لئے سپیدۂ سحر ہے۔

ذالک فضل اللّٰہ یوتیہِ من یَّشاء وَاللّٰہ ذوالفضلِ العظیم۔

پنڈت جواہر لال نہرو

میرا دھیان ترک موالات کے ابتدائی زمانے ۱۹۲۰ء کی طرف لوٹ رہا ہے میں خاص طور پر جامعہ دیکھنے کے لئے علی گڈھ گیا جو مولانا محمد علی کی قیادت میں اس وقت نئی نئی قائم ہوئی تھی، تعلیم کی سچی لگن رکھنے والے نوجوان علی گڈھ یونیورسٹی چھوڑ کر جامعہ میں شامل ہو گئے تھے تاکہ ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں کو تقویت پہنچا سکیں۔ مولانا محمد علی جیسی مؤثر شخصیت کی قیادت میں نئی جامعہ میں بڑا جوش و خروش تھا مجھے یاد ہے کہ میں نے جامعہ کے بارے میں اس وقت ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں اسے تحریک ترک موالات کا ایک تندرست بچہ کہا تھا۔

وقت گذرتا گیا اور جامعہ، دہلی منتقل ہو گئی۔ اسے بہت خراب حالات کا

معاملہ کرنا پڑا اور اس کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے لیکن اس میں کچھ ایسی بات تھی جو بہت کم ہندوستان کے کسی تعلیمی ادارے میں پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی رہنمائی میں اس کے پاس مخلص اور لائق کارکنوں کی ایک جماعت تھی اس لئے بہت سی چیزوں اور ہر قسم کی معمولی سہولت کی کمی کے باوجود، اس کے پاس روپیے پیسے اور سرپرستی سے بڑھ کر کچھ اور بھی موجود تھا۔ اس بنا پر نہ صرف وہ قائم رہی بلکہ ترقی بھی کرتی رہی۔ اگرچہ اس کے کاموں میں کوئی نمایاں چمک دمک نہیں رہی، لیکن پھر بھی اس ابتدائی دور میں وہ ایک ایسے ادارے کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب ہوگئی جو ہندوستان میں ایک انفرادیت رکھتا ہے، اب یہ ادارہ مضبوط ہو گیا ہے اور اس کے کاموں میں وسعت پیدا ہوگئی ہے اور ایسے لوگ بھی اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں جو پہلے اس کی طرف دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ اس کا مقصد تقسیم اسناد اور ملازمت کی تیاری نہیں رہا بلکہ بلند کردار کے لوگ پیدا کرنا رہا ہے جو ذاتی مفاد سے ہٹ کر بڑے مقاصد کی آبیاری کر سکیں گے اس لئے اس نے نئی بنیادی تعلیم کو اپنایا ہے جس کی ہندوستان میں اس نے ہی رہنمائی کی ہے۔

پچیس سال کا زمانہ گزر گیا اور پورا ایک عہد ختم ہو گیا۔ یہ امر باعث مسرت اور باعث تسکین ہے کہ اس طرح قابل قدر کام انجام پایا ہے جشن سیمیں کے موقع پر اُن سب حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہوں جن کا تعلق جامعہ سے ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے قابل قدر رفقائے کار کی خدمت میں۔

خدا کرے جامعہ پھلے پھولے اور اعلیٰ مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھے، وہ برابر ایسے قابل قدر لوگ پیدا کرتی رہے جو ہندوستان کے ہونہار اور سچے فرزند کہلانے کے مستحق قرار پائیں اور اپنی خدمت گزاری سے اعلیٰ مدارج حاصل کریں"

ڈاکٹر طٰہٰ حسین صاحب، قاہرہ، مصر

سخت افسوس ہے کہ حالات نے مجھے اس امر کی اجازت نہ دی کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں میں شریک ہوتا۔ میرے لئے کتنی خوش قسمتی ہوتی کہ میں اس جشن میں شرکت کرتا اور خود حاضر ہو کر اس نوعمر یونیورسٹی کو جو اب اپنے شباب میں قدم رکھ رہی ہے مبارک باد دیتا۔ آپ یقین فرمائیں کہ مصری اہل علم جب وہ مشرق کے اسلامی ممالک میں بالعموم اور ہندوستان میں خاص طور پر علمی و تمدنی بیداری دیکھتے ہیں تو اس سے انھیں بے حد خوشی ہوتی ہے اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

مصری اہل علم کے دلوں میں آپ کی اس یونیورسٹی کی ایک اور لحاظ سے بڑی وقعت ہے۔ آپ کی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قاہرہ کی نوا دادل یونیورسٹی تقریباً ایک ہی زمانے کی پیداوار ہیں اور دونوں کی بنیاد اسی عہد جدید میں رکھی گئی ہے اور دونوں کے پیش نظر یہ ہے کہ مشرق کی اس ضرورت کو پورا کریں کہ وہ اپنے ماضی کی یاد کو از سر نو تازہ کرے اور اسے دوبارہ زندگی بخشے اور ساتھ ہی ساتھ مغربی علوم و فنون کو اپنے یہاں منتقل کرے اور پھر اپنے ماضی کے آثار اور زمانہ حال کے افکار و رجحانات کو باہم سمو کر ان میں ہم آہنگی پیدا کرے اور نیز اس دور میں مشرق جو اس بات کا متمنی ہے کہ وہ اپنی عزت و شرف کے موروثی حق کو واپس لے اور انسانیت کی عام ترقی میں دوسری قوموں کے ساتھ برابر کا شریک ہو، یہ دونوں جامعات مشرق کی اس فطری خواہش میں اس کی رہنمائی کریں۔

آپ کی یہ خوشی ہماری خوشی ہے کہ، بات یہ ہے کہ اس ضمن میں آپ جو بھی کوششیں کر رہے ہیں، اس سلسلے میں ہم نے جو کوششیں کی ہیں بالکل ان سے ملتی جلتی ہیں اور اسی طرح آپ کی آرزوئیں بعینہٖ ہماری آرزوؤں سے مشابہ ہیں۔

اور تہذیب و تمدن میں آپ کے مد نظر جو قدریں ہیں وہی قدریں ہمارے سامنے ہیں۔ اور جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ اس نئے دور میں اسلام بحیثیت ایک دین کے عام انسانی ترقی کا اساسی رکن بنے جیسے وہ کسی زمانے میں تھا اُسی طرح آپ چاہتے ہیں چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم اپنے پرانے علمی اداروں کو مضبوط کر رہے ہیں اور نئے ادارے بنا رہے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ آپ بھی بعینہٖ اسی کھوئی ہوئی چیز کے لئے جدّ و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ اور ہم اپنی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں اور ہماری آرزوئیں پوری ہوں۔"

جناب علی اصغر حکمت صاحب، انجمن روابط ایران و ہند

انجمن فرہنگی ایران و ہند جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استادوں، بزرگوں، اور رہنماؤں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتی ہے۔ اس پچیس سالہ جشن سیمیں پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار کرتی ہے۔ خداوند مہربان سے دعا کرتی ہے کہ وہ اس جامعہ کے اساتذہ اور طالبان علم کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ علم و فن کی راہ میں عظیم کارنامے انجام دیں۔

آج اس جامعہ کا جشن سیمیں منعقد ہو رہا ہے، آرزو ہے کہ اس کے ہوا خواہوں کو وہ دن بھی نصیب ہو جب اس کا جشن زرّیں بھی منعقد ہو، اور اس کی ترقیوں کے بارے میں اس کے بانیوں اور بزرگوں کی آرزوئیں کامیاب ہوں۔

انجمن فرہنگی ایران و ہند کو معلوم ہے کہ اسلامی یونیورسٹیوں کی صف میں یہ درس گاہ کتنی سودمند ہے اور آئندہ دانشمندان عالم کے لئے کتنی نفع

بخش ہوگی۔ ایمان جو آفتاب اسلام کی ضیا باری سے تاباں ودرخشاں ہے اس کے باشندے اس عظیم المرتبت جامعہ کے کارناموں سے مسرور وشاداں ہیں۔ اللہ تعالیٰ (عمل کرے) اس مبارک درخت کو بہرہ مند و کامیاب فرمائے۔

جناب خواجہ غلام السیدین صاحب مشیر تعلیم، رامپور

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پچیس سالہ جشن جوبلی ملت اسلامیہ کے لئے نوید مسرت ہے۔ اس عرصے میں بہت سے نقشے بنے اور بگڑے، بہت سی امیدوں کے چراغ جلے اور بجھ گئے۔ بہت سی ہونہار تحریکیں ناکام، اور نامبارک تحریکیں کامیاب ہوئیں، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اسلامی تہذیب اور تعلیم کی وہ شمع جو ملک اور قوم کے چند روشن ضمیر اور دردمند خادموں نے ۱۹۲۰ء میں روشن کی تھی، آج پوری تابانی کے ساتھ ملک میں تعلیم اور اقدار صالحہ کی روشنی پھیلا رہی ہے اور کیوں نہ پھیلائے۔؟

وقت اس مایوس تاریکی میں ذاکر حسین اور ان کے بلند نظر، بلند ہمت، فراخ دل اور ایثار پیشہ ساتھیوں کی ٹولی افق پر ستارۂ امید بن کر چمکتی ہے اور دل گواہی دیتا ہے کہ جس قوم کی خاکستر میں ایسی چنگاریاں موجود ہوں اس کی طرف سے مایوس ہونا کفران نعمت ہے۔

جامعہ کے کارکنوں کو، ان کے بے شمار قدر شناسوں کو، ہندوستان کو ملت اسلامیہ کو یہ جشن جوبلی مبارک ہو، جامعہ کے ماضی کے کارنامے ہمارا عزیز ترین قومی سرمایہ ہیں، اس کا مستقبل ہماری عزیز ترین امانت اور امید ہے، خدا کرے ملت اسلامی اس امانت کی صحیح قدر کرے۔

آنریبل سر مرزا اسمٰعیل صاحب، صدر اعظم، دولت آصفیہ حیدرآباد۔

جامعہ کی جوبلی کے موقع پر ان تمام بانیان جامعہ کی مسرت میں شریک ہوں۔

جنھوں نے ملک کے سامنے نہ صرف قومی تعلیم کا ایک قابل تقلید نمونہ پیش کیا ہے، بلکہ جنھوں نے قومی مقصد کے لئے ذاتی ایثار اور قربانی کی ایک ایسی شاندار مثال قائم کی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔
ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ان کے ایثار پیشہ شرکائے کار ہر مسلمان بلکہ ہر وطن پرست ہندوستانی کی بہترین تمناؤں اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ درحقیقت جامعہ کا وجود خدمت اور ایثار کے جذبے کا ایک ایسا روشن نشان ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کی گزشتہ آدھی صدی کے ورق پر کبھی نہ مٹنے والے نقوش بنا دئے ہیں۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ جامعہ نے عوامی تعلیم و تربیت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس قومی ادارے کی مزید توسیع اور ترقی کے لئے جدوجہد کرنے کا فرض ہر مسلمان پر عائد ہوتا ہے۔
مجھے اُمید ہے کہ جامعہ کے متعلق ہماری قوم اپنا فرض بھولے گی نہیں اور اس بات کو یاد رکھے گی کہ یہ ادارہ ہمارا ایک بہت بڑا قومی سرمایہ ہے جس کی ترقی سے ملت کے ذہنی ارتقار کا ایک شاندار مستقبل وابستہ ہے۔
میری تمنا ہے کہ جامعہ کی تعلیمی تحریک کا میدان زیادہ سے زیادہ وسیع ہوتا رہے اور اہل وطن کے دلوں میں اس کو عزت اور محبت کا وہ اعلیٰ مقام حاصل ہو جس کا وہ بلاشبہ مستحق ہے۔

پروفیسر جان ڈیوی، ماہر تعلیم، نیویارک

میں جامعہ کے جملہ اراکین، طلبہ اور اساتذہ کو مفید خدمت سے پچیس سال پورا کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس درس گاہ کی اساس ایک غیر معمولی وسیع اور جامع منصوبے پر مبنی ہے جس میں متنوع تعلیمی سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس نے حکومت

کے اثر سے اپنے آپ کو برابر بچائے رکھا ہے۔ اس کی کشادہ اور ترقی پسندانہ ذہنیت ان تمام ماہرین تعلیم کے اندر حوصلہ پیدا کرتی ہے جو قدامت پسند نہیں ہیں اور پیش بینی سے کام لیتے ہیں۔ صرف ادارے کے کارکن ہی مبارکباد کے مستحق نہیں ہیں بلکہ پوری برادری حق دار ہے۔

میں یہ توقع ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ اگلے پچیس سال میں یہ ادارہ اپنی مفید خدمات کا دائرہ بہت زیادہ بڑھا لے گا۔

پچھلی کارکردگی ایسی توقعات پیدا کرتی ہے اور اس یقین کی تائید میں ہے

پروفیسر ولیم کلپیٹرک، نیویارک۔

ہم امریکہ کے لوگ تعلیم کے میدان میں آپ کی باضابطہ تجربہ کرنے کی کوششوں پر اظہار مسرت کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی صحیح راستہ ہے بلکہ یہی صرف ایک راستہ ہے جس سے رواجی طریقۂ تعلیم کو واقعی بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہے کہ ہندوستان کی ضروریات کے پیش نظر آپ نے "قومی تعلیم" کا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک مدت سے بدیسی نظام اگرچہ اپنے وطن میں نمایاں خدمت انجام دیتا رہا تھا لیکن اس نے ہندوستان کی ضروریات کو مقدم نہیں سمجھا۔ میں نے ۱۹۲۶ء میں ہندوستان میں رہ کر خود بھی یہ بات محسوس کی تھی کہ مروجہ طریقۂ تعلیم ہندوستانی نوجوانوں کی اصلی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا ہے جیسا کہ انھیں اپنے ہندوستان میں مناسب تہذیبی نظریہ قائم کرنے کا مشکل کام انجام دینا ہے۔ اس ضروری اصلاح کی توقع میں ہم آپ کے برابر شریک ہیں۔

لہٰذا ہماری دلی خواہش ہے کہ اس مشکل لیکن اہم کام میں آپ کو ہر طرح

کامیابی نصیب ہو۔ جامعہ ملیہ کے ہر اچھے کام میں ہماری نیک خواہشات اُن کے ساتھ ہیں۔

مسز سروجنی نائیڈو۔

لوگوں کے داخلی تصورات ان کی زندگی کے واقعات سے زیادہ حقیقی طور پر ان کی سرگزشت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جامعہ ملیہ جو آج اپنا جشن سیمیں منا رہی ہے ایک مشترک خواب کا مظہر ہے جو تین بڑے ہندوستانی مسلمانوں نے دیکھا۔ یہ تینوں یعنی حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اہلیت اور طبیعت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے لیکن ملک وملت کی فلاح وبہبود کی لگن نے انھیں متحد کر دیا تھا۔ وہ بالغ نظر، جری اور شیدائے وطن تھے اور انھوں نے تن دہی اور خلوص دل سے ہندوستان کی خدمت کی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ایک ایسا قومی ادارہ قائم ہو جو اسلامی تہذیب کے اعلیٰ تصورات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرت کی اقدار کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہو۔ جامعہ ملیہ بذات خود ان کی مخلصانہ جد وجہد کی آئینہ دار ہے اور ایک مستقل خراج عقیدت بھی۔

لیکن یہ ہماری بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم ان ہونہار اور بے لوث نوجوانوں کی خدمت میں اپنا ہدیہ تشکر نہ پیش کریں جو آج اس قومی ذمے داری کا بار اپنے کندھوں پر سنبھالے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اپنی پے در پے قربانیوں سے ایک ایک اینٹ جوڑ کر جامعہ کی تعمیر کی ہے۔

خدا کرے بانیان جامعہ کے خواب ان کے جانشینوں کے کارناموں کے ذریعے بجن تمام پورے ہوں اور یہ نئی درس گاہ ان تمام افکار واعمال کا مرکز بنے جن سے انسانیت کی روایات کو درخشندگی حاصل ہوتی ہے۔

حسن علی یوسل وزیر تعلیم، انکارا۔ ترکی

یہاں مجھے ایک بار پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علموں اور استادوں کو جو کچھ انھوں نے حاصل کیا ہے اور مستقبل میں حاصل کریں گے اس کے لئے تہہ دل سے مبارک باد پیش کرنے دیجئے۔ خدا کرے کہ دنیا کی یونیورسٹیاں موجودہ دور کی خوشیوں کے لئے مضبوط پناہ گاہیں ثابت ہوں۔

جناب بیربل سنگھ صاحب پرنسپل۔ کاشی ودیا پیٹھ۔ بنارس

اس بات کی مجھے بڑی مسرت ہے کہ جامعہ امسال اپنا جشن سیمیں منا رہی ہے کاشی ودیا پیٹھ کی طرف سے میں جامعہ کی خدمت میں دوستانہ طور پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ ترک موالات کے ہنگامہ خیز زمانے میں ملک کی ایک قومی ضرورت پورا کرنے کے لئے آپ کی اور ہماری درسگاہیں قائم ہوئیں۔ پچھلے پچیس سال سے آپ اور ہم قومی تعلیم کے مشترک مفاد کی خاطر کام میں لگے ہوئے ہیں اور مصائب کا سامنا کرتے رہے ہیں۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ جامعہ ملیہ نے اپنی زندگی کے پچیس سال قومی تعلیم کے میدان میں نہایت خوش اسلوبی سے گزار لئے ہیں اور آج وہ اپنا جشن سیمیں منا رہی ہے۔

مجھے پوری توقع ہے کہ جامعہ حسب معمول وطن اور انسانیت کی خدمت میں برابر لگی رہے گی۔

ایس۔ ایچ۔ وُڈ

وزارت تعلیم لندن

مجھے فخر اور مسرت ہے کہ نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے مقاصد اور اس کے کاموں کی مدح و ستایش اور اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین سے اپنے محبت و خلوص کے اظہار کا موقع ملا۔ تقریباً دس سال ہوئے جب میں نے پہلی مرتبہ جامعہ

ملیہ اسلامیہ کی سیر کی تھی، اس کے بعد سوائے اس کے کہ آسٹریلیا جاتے وقت چند لمحے کے لئے یہاں اترا تھا، میں ہندوستان نہیں آیا۔ ۱۹۳۶ء میں جس وقت میں جامعہ کے نامکمل کالج کی سیر کر رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ یہ ہے وہ ادارہ یا برادری ("ادارہ" نہ کہئے اس لئے کہ یہ بڑا مشکل اور ناموزوں لفظ ہے) جہاں ہندوستان کے حق میں بہت اہم اور نتیجہ خیز کام ہو رہا ہے اور لوگوں کو اپنی شخصیت کی مکمل تعمیر کا خوب موقع دیا جا رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہاں علم و فن ہی نہیں سیکھا اور سکھایا جا رہا ہے بلکہ حسن کا ذوق بھی پیدا کیا جا رہا ہے۔ عقل و خرد کی دانائی کا دروازہ حسن کی دانائی پر بند نہیں، اس کے لئے کھلا ہوا ہے۔" اس وقت جب کہ جامعہ کی پچیسویں سال گرہ منائی جا رہی ہے، میں اس کے باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اب سے دس سال پہلے میں بخوبی کہہ سکتا تھا کہ صداقت، حسن اور نیکی، یہ تینوں اوصاف کس طرح انسانی سیرت میں حیات جاوید کے لئے سرگرم عمل تھے اور مجھے یقین تھا کہ بالآخر یہ بعد کمال ہی نہیں بلکہ من حیث الکل سیرت انسانی میں رچ جائیں گے۔ اگر یہ یونیورسٹی انسانوں کو انسانی کمزوریوں اور معذوریوں کے باوجود انسان کامل بننے میں مدد کر سکے تو یہ بات ہندوستان ہی کے لئے نہیں پوری دنیا کے لئے ایک سبق آموز نمونہ ثابت ہوگی۔

ہم جامعہ جوبلی کی کہانی کو مولانا ابوالکلام آزاد کے پیام پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے اس موقع کے لئے بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کو آزادی ملنے سے پہلے کے اس دور کی جامعہ کی کہانی مکمل ہوتی ہے۔

"جامعہ ملیہ پر اس کی زندگی کے ابتدائی پچیس برس گزر گئے اب وہ اپنی زندگی کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ان گزرے ہوئے پچیس برسوں کی مدت طرح طرح مشکلوں اور رکاوٹوں کی ایک مسلسل

داستان تھی مگر اب وقت آگیا ہے کہ کامرانیوں اور سربراہیوں کی ایک نئی داستان شروع ہو جائے۔ آج ہم اس کا پہلا ورق الٹ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ نئی داستان زیادہ سے زیادہ کامیاب اور شاندار ہوگی۔"

فہرست ضمیمہ

فہرست ممبران فاؤنڈیشن کمیٹی، نیشنل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
جو ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کے جلسے میں منتخب ہوئے

آنریری سکریٹری ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری

صوبہ دہلی

۱۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ ۲۔ ڈاکٹر عبد الرحمن صاحب۔ ۳۔ مولوی کفایت اللہ صاحب۔
۴۔ حکیم محمد اجمل خاں صاحب۔ ۵۔ قاضی عبد الغفار صاحب

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ

۶۔ مولانا محمد علی صاحب۔ ۷۔ مولوی انوار الہدیٰ صاحب وکیل علی گڑھ۔
۸۔ مولانا شوکت علی صاحب۔ ۹۔ مولوی عبد السلام صاحب مرادآباد۔ ۱۰۔ محمد اسمٰعیل
خاں صاحب بیرسٹر میرٹھ۔ ۱۱۔ مسعود الحسن صاحب مرادآباد۔ ۱۲۔ خواجہ عبد المجید صاحب
بیرسٹر پٹنہ۔ ۱۳۔ حافظ عبد الرحیم صاحب وکیل علی گڑھ۔ ۱۴۔ عامر مصطفےٰ خاں صاحب
علی گڑھ۔ ۱۵۔ نواب علی حسن خاں صاحب لکھنؤ۔ ۱۶۔ حاجی موسیٰ خاں صاحب
علی گڑھ۔ ۱۷۔ تصدق احمد خاں صاحب شیروانی علی گڑھ۔ ۱۸۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب
کانپور۔ ۱۹۔ مولانا عبد الماجد صاحب بدایوں۔ ۲۰۔ مولوی عبد الودود صاحب
بریلی۔ ۲۱۔ مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ۔ ۲۲۔ نواب سربلند جنگ صاحب
الہ آباد۔ ۲۳۔ ظہور احمد صاحب بیرسٹر الہ آباد۔ ۲۴۔ ڈپٹی نثار احمد صاحب میرٹھ۔
۲۵۔ معظم علی صاحب بیرسٹر بمبئی۔ ۲۶۔ مجتہد العصر مولانا نجم الحسن صاحب لکھنؤ۔
۲۷۔ خلیق الزماں صاحب لکھنؤ۔ ۲۸۔ مولوی حسین احمد صاحب دیوبند۔
۲۹۔ مولانا عبد الباری صاحب لکھنؤ۔ ۳۰۔ مولانا حسرت موہانی صاحب کانپور۔
۳۱۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اعظم گڑھ۔ ۳۲۔ مولوی سلامت اللہ صاحب
فرنگی محل لکھنؤ۔ ۳۳۔ مولوی شبیر احمد صاحب دیوبند ۳۴۔ قاضی نجم الدین حسن صاحب میرٹھ

۳۵۔ محمد حسین صاحب بیرسٹر میرٹھ۔

پنجاب وصوبہ سرحد

۳۶۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو صاحب امرتسر۔ ۳۷۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب لاہور۔
۳۸۔ آغا محمد صفدر صاحب لاہور۔ ۳۹۔ مولوی عبدالقادر صاحب لاہور۔ ۴۰۔ غلام محی الدین صاحب وکیل لاہور۔ ۴۱۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے لاہور۔ ۴۲۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب لاہور۔ ۴۳۔ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسر۔
۴۴۔ مولوی صدرالدین صاحب لاہور۔ ۴۵۔ ملک لعل خاں صاحب گوجرانوالہ
۴۶۔ مولوی محمد داؤد صاحب غزنوی امرتسر۔ ۴۷۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب بیرسٹر سرگودھا
۴۸۔ حاجی جان محمد صاحب پشاور۔ ۴۹۔ مرزا قطب الدین صاحب وکیل راولپنڈی
۵۰۔ شیخ جان محمد صاحب ہوشیار پور۔

بہار

۵۱۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب پٹنہ۔ ۵۲۔ مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ۔ ۵۳۔ مولوی نورالحسن صاحب وکیل پٹنہ۔

بنگال

۵۴۔ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کلکتہ۔ ۵۵۔ مولوی ابوالقاسم صاحب وکیل بردوان
۵۶۔ مولوی محمد اکرم صاحب کلکتہ۔ ۵۷۔ مولوی فضل الحق صاحب وکیل کلکتہ۔ ۵۸۔ مولوی نجم الدین صاحب کلکتہ۔ ۵۹۔ مولوی مجیب الرحمٰن صاحب کلکتہ۔ ۶۰۔ حاجی محمد اسمٰعیل صاحب کلکتہ۔ ۶۱۔ موسیٰ مال صاحب کلکتہ۔

برما

۶۲۔ سیٹھ جمال صاحب رنگون۔ ۶۳۔ حاجی محمد احمد ملا داؤد صاحب مدنی رنگون۔
مدراس اور میسور:۔ ۶۴۔ یعقوب حسن صاحب مدراس۔ ۶۵۔ نواب

غلام احمد کلامی صاحب بنگلور۔ ۶۶۔ مولوی عبدالمجید صاحب شور مدراس

سندھ

۶۷۔ غلام محمد بھرگری صاحب حیدرآباد۔ ۶۸۔ سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب کراچی۔
۶۹۔ مولانا تاج محمد صاحب سکھر۔

بمبئی

۷۰۔ سیٹھ میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی بمبئی۔ ۷۱۔ عمر سبحانی صاحب بمبئی۔ ۷۲۔
حاجی احمد صدیق کھتری صاحب بمبئی۔ ۷۳۔ عباس طیب جی بمبئی۔

حیدرآباد (دکن)

۷۴۔ مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد۔ ۷۵۔ قاسم حسن صاحب سدر۔

فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء میں منتخب ہونے والے بعد کے ۱۷ اراکین کی فہرست :۔

صوبہ سرحد اور پنجاب

(۱) مولوی عبدالرحیم صاحب بنوں۔ (۲) محمد جان خاں صاحب بیرسٹر بنوں (۳) رانا
فیروزالدین صاحب ہوشیارپور (۴) سید کمال صاحب کوہاٹ۔

ممالک متوسط

(۵) مولوی عبدالقیوم صاحب آرسی (۶) عبدالغفار صاحب وکیل برہان پور۔
(۷) مولوی عبدالستار صاحب (اکولہ برار)

بہار

(۸) مولوی شفیع صاحب داؤدی مظفرپور (۹) مولوی محمد سجاد صاحب گیا
(۱۰) محمد زبیر صاحب مونگھیر۔

مدراس اور یوپی :۔ (۱۱) مولوی سید مرتضیٰ صاحب ترچناپلی۔

(۱۲) مولوی فضل اللہ صاحب، مدراس (۱۳) عبدالغفور صاحب، کانپور۔ (۱۴) کمال الدین جعفری صاحب، الہ آباد (۱۵) سید محفوظ علی صاحب بدایوں۔ (۱۶) مولوی ولایت حسین صاحب الہ آباد (۱۷) کنور عبدالوہاب خاں صاحب علی گڑھ۔ یہ سب لوگ ممبر منتخب ہوگئے۔

سنہ ۱۹۲۴ء تک جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ملحق ہونے والے مدارس کی فہرست!

(۱)	غازی مصطفیٰ کمال پاشا ہائی اسکول	اعلیٰ	بمبئی
(۲)	قومی مسلم اسکول	ثانوی	ہردوئی
(۳)	مدرسہ عالیہ قومیہ	اعلیٰ	پونہ
(۴)	آزاد مدرسہ عالیہ اسلامیہ اسکول	اعلیٰ	حضرو
(۵)	آزاد اسلامیہ اسکول	مڈل	گجرات
(۶)	راشٹریہ سرسوتی پاٹ شالہ	اعلیٰ	جھانسی
(۷)	مدرسہ عالیہ اسلامیہ	ثانوی	بھٹکل
(۸)	جامعہ اسلامیہ نیشنل کالج	اعلیٰ	وانمباڑی
(۹)	مدرسہ نصرت الاسلام	ثانوی	پشاور
(۱۰)	مدرسہ ملیہ	ثانوی، کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ	
(۱۱)	جامعہ ملیہ ہائی اسکول	اعلیٰ۔ علی گڑھ	
(۱۲)	مدرسہ اسلامیہ	اعلیٰ، تحصیل چاررودہ پشاور	
(۱۳)	اسلامیہ نیشنل ہائی اسکول	اعلیٰ	رنگون
(۱۴)	مدرسہ عین الاسلام	ثانوی، زیارت کاکا صاحب پشاور	
(۱۵)	مدرسہ اسلامیہ قادریہ	ثانوی سوابی (پشاور)	
(۱۶)	اے۔ ڈی۔ اسکول	ثانوی	سورت
(۱۷)	مدرسہ تعلیم القرآن	ثانوی	مکھڈ شریف

ضمیمہ نمبر ۴

جولائی ۱۹۲۴ء میں جامعہ کے عہدے دار

امیر جامعہ	مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خاں
وزیٹر	مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی
ناظم اور خازن	تصدق احمد خاں شیروانی
شیخ الجامعہ	عبدالمجید خواجہ
مسجل	حسن محمد حیات

ضمیمہ ۵۔ وہ اصحاب جو گزشتہ چند سال میں (۱۹۲۴ء تک) مجلس انتظامی کے رکن رہے۔

(۱) مسیح الملک حکیم اجمل خاں (امیر جامعہ) (۲) مولانا محمد علی (شیخ الجامعہ) (۳) عبدالمجید خواجہ بی۔ اے کینٹب بار ایٹ لا (شیخ الجامعہ) (۴) تصدق احمد خاں، شیروانی (سکریٹری)، (۵) ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۶) مولانا شوکت علی (۷) عامر مصطفےٰ خان (علی گڑھ) (۸) حافظ عبدالرحیم (وکیل علی گڑھ) (۹) نواب محمد اسمٰعیل خاں (۱۰) کنور عبدالوہاب (علی گڑھ) (۱۱) مولانا فضل الحسن حسرت موہانی (۱۲) مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۳) آغا محمد صفدر (سیالکوٹ) (۱۴) مولانا آزاد سبحانی۔
(۱۵) سیٹھ حاجی میاں جان محمد چھوٹانی (۱۶) مولانا سید سلیمان ندوی (۱۷) ڈاکٹر سید محمود پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بار ایٹ لا (۱۸) حاجی محمد موسیٰ خاں (علی گڑھ) (۲۰) ڈاکٹر محمد عالم (۲۱) ذاکر حسین (۲۲) سید رؤف پاشا (۲۳) مولوی سید محمد (۲۴) ڈاکٹر سیف الدین کچلو (۲۵) مولانا ابوالکلام آزاد (۲۶) عبدالعزیز انصاری (نائب شیخ الجامعہ)

ضمیمہ ۶۔ وہ اصحاب جو گزشتہ چند سال میں (۱۹۲۴ء تک) مجلس تعلیمی کے رکن رہے

۱۔ عبدالمجید خواجہ (شیخ الجامعہ) ۲۔ نثار احمد خاں شروانی۔ ۳۔ حسن محمد حیات (مسجل)

(۴) مولوی انوار الہدیٰ (۵) حافظ عبدالرحیم (۶) مولوی محمد علی شاہ (۷) سید محمد (۸) مولانا محمد اسلم جیراج پوری (۹) مولوی بدرالدین ناظم للمعارف (۱۰) ذاکر حسین مہتمم دارالتصنیف (۱۱) ڈاکٹر عالم (۱۲) تصدق احمد خاں شروانی (معتمد جامعہ) (۱۳) سید ہادی حسن (۱۴) مولوی نورالرحمٰن (۱۵) ڈاکٹر محمد عظیم۔

ضمیمہ ۲۷۔ ۱۹۲۴ء میں کالج اور مدرسے میں یہ اساتذہ صاحبان کام کر رہے تھے

اساتذہ کالج

۱۔ مولانا خواجہ عبدالحیٔ، تفسیر (۲) مولانا محمد علی شاہ، حدیث و فقہ (۳) مولانا محمد اسلم جیراج پوری، سیرۃ و تاریخ اسلام۔ (۴) پنڈت جواہر پرشاد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) ہندو اخلاقیات (۵) مولانا محمد السورتی، عربی (۶) مولانا شرف الدین ٹونکی اُردو (۷) محمد عبدالعزیز انصاری ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) انگریزی۔ سید رئوف پاشا بی۔ اے۔ (علیگ) انگریزی۔ (۸) ذاکر حسین خاں بی۔ اے (علیگ) رخصت پر۔ معاشیات (۹) معظم علی خاں بی۔ اے (آکسن) تاریخ و سیاسیات۔ ای۔ جی کیلاٹ ایم۔ اے (مدراس و کیمبرج) تاریخ و سیاسیات (۱۰) وحید اللہ بی۔ اے (آنرز) جامعہ۔ اجتماعیات (۱۱) عبدالمجید خواجہ بی۔ اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا۔ قانون (۱۲) اے۔ اے۔ قریشی۔ بی۔ اے۔ (علیگ) جغرافیہ (۱۳) ایل۔ این گپتا۔ ایم۔ ایس۔ سی (الہ آباد) کیمیا۔ (۱۴) ڈی۔ این۔ کرجی۔ ایم۔ اے۔ (کلکتہ) ریاضی (۱۵) آر۔ این۔ سیلوم بی۔ اے۔ (آنرز) (کنٹب) طبیعات (۱۶) ڈاکٹر محمد عظیم خاں۔ ایم۔ بی۔ علم النباتات (۱۷) ڈی۔ جی۔ ایس، صحافت۔ الیف۔ ایس۔ ماسٹر بی۔ اے۔ صحافت (۱۸) اگروالا۔ بی۔ اے (تعلیم تجارت)

اساتذہ مدرسہ

۱۔ عبدالکریم فاروقی بی۔ اے (علیگ) نائب صدر الاساتذہ (۲) اشفاق علی قریشی، بی۔ اے (علیگ) ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (پرایوس) (۳) سید عبدالوحید بی۔ اے (علیگ)

ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی (ریلویس) (۴) سید نذیر نیازی، بی۔اے (جامعہ) (۵) محمد اسمٰعیل بی۔اے (بمبئی) (۶) ارشاد الحق۔ بی۔اے (علیگ) (۷) سید محمد ابراہیم بی۔اے (مدراس) (۸) خواجہ حافظ فیاض احمد، فورتھ ایر بی۔ایس۔سی (علیگ) (۹) برکت علی۔فورتھ ایر بی۔ایس۔سی (علیگ) (۱۰) سعد انصاری (فاضل ندوی)۔ (۱۱) قاری حبیب الرحمٰن (۱۲) منشی علی محمد خاں، خوشنویس (۱۳) سردار خاں، ڈرل ماسٹر،

وہ اساتذہ جو جامعہ میں کچھ عرصہ رہ کر چلے گئے تھے اُن کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم
۲۔ محمد ہادی حسن
۳۔ ہرندر کمار چودھری
۴۔ طیب اللہ
۵۔ بابو ستیش چندر ڈے
۶۔ بدر الدین
۷۔ سید نور اللہ
۸۔ خواجہ عبدالحمید
۹۔ پنڈت رام کشور پاٹھک
۱۰۔ بدر الحسن
۱۱۔ مولوی محمود الحسن

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

جشن سیمیں (۱۹۴۶ء) کے زمانے کے کارکن۔

ضمیمہ۸۔ اراکین انجمن جامعہ ملّیہ اسلامیہ :۔

(الف) حیاتی اراکین۔

۱۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
۲۔ خواجہ عبدالحیٔ صاحب
۳۔ مولانا محمد اسلم صاحب جیراج پوری
۴۔ حافظ فیاض احمد صاحب
۵۔ شفیق الرحمٰن صاحب
۶۔ ارشاد الحق صاحب
۷۔ سعید انصاری صاحب
۸۔ حامد علی خاں صاحب
۹۔ برکت علی صاحب
۱۰۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب
۱۱۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب
۱۲۔ پروفیسر ای۔ جے۔ کیلاٹ صاحب
۱۳۔ پروفیسر محمد عاقل صاحب
۱۴۔ علی احمد خاں صاحب
۱۵۔ اختر حسن فاروقی صاحب
۱۶۔ ماسٹر عبدالحیٔ صاحب
۱۷۔ عبدالغفار صاحب مدہولی
۱۸۔ سید احمد علی صاحب

(ب) جامعہ کے سابق اُمنا :۔

(۱) عبدالمجید خواجہ صاحب (۲) ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (۳) مولوی مسعود علی صاحب ندوی۔

(ج) منتخب اراکین۔

(۱) خواجہ عبدالحمید صاحب، سپلاکینی (۲) خواجہ غلام السیدین صاحب (۳) سجّاد مرزا صاحب۔

ضمیمہ ۹۔ عہدے داران

(۱)	امیر جامعہ	عبدالمجید خواجہ صاحب بی۔اے۔ بار ایٹ لا
(۲)	شیخ الجامعہ	ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم۔اے۔ پی، ایچ، ڈی
(۳)	خازن جامعہ	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے (علیگ)
(۴)	مسجّل جامعہ	ارشاد الحق صاحب بی۔اے (علیگ)

ضمیمہ ۱۰۔ اراکین مجلس منتظمہ۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب
(۳) ای۔ جے کیلاٹ صاحب (۴) حافظ فیاض احمد صاحب
(۵) شفیق الرحمن صاحب (۶) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
(۷) خواجہ عبدالحمید صاحب (۸) خواجہ غلام السیدین صاحب (۹) ارشاد الحق صاحب

ضمیمہ ۱۱۔ اراکین مجلس تعلیمی۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (۲) ای۔ جے۔ کیلاٹ صاحب
(۳) سعید انصاری صاحب (۴) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
(۵) پروفیسر محمد عاقل صاحب (۶) حامد علی خاں صاحب
(۷) خواجہ عبدالحیٔ صاحب (۸) عتیق احمد صاحب
(۹) شفیق الرحمن صاحب (۱۰) مولانا محمد اسلم صاحب
(۱۱) پروفیسر محمد مجیب صاحب (۱۲) خواجہ غلام السیدین صاحب
(۱۳) مولانا سید سلیمان صاحب ندوی (۱۴) ارشاد الحق صاحب (معتمد)

ضمیمہ ۱۲۔ افسران شعبہ

(۱) صدر کالج	پروفیسر ای۔ جے۔ کیلاٹ صاحب ایم۔ اے
(۲) پرنسپل استادوں کا مدرسہ	سعید انصاری صاحب
(۳) نگراں مدرسہ ثانوی	ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب
(۴) نگراں مدرسہ ابتدائی	عتیق احمد صاحب
(۵) نگراں تعلیمی مرکز ۱	شفیق الرحمن صاحب قدوائی
(۶) ناظم ادارہ تعلیم و ترقی	" "
(۷) ناظم دینیات	مولانا خواجہ عبدالحیٔ صاحب

(٨) ناظم کتب خانہ — پروفیسر محمد عاقل صاحب
(٩) ناظم ہمدردان جامعہ — حافظ فیاض احمد صاحب
(١٠) ناظم بیت الحکمتہ — پروفیسر محمد سرور صاحب
(١١) ناظم اُردو اکادمی — ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب
(١٢) ناظم مکتبہ جامعہ — حامد علی خاں صاحب
(١٣) ناظم جامعہ کیمیکل انڈسٹریز — علی احمد صاحب
(١٤) ناظم جامعہ ڈیری — ظفر علی منصوری صاحب
(١٥) ناظم جامعہ اسٹور — شبیر احمد خاں صاحب
(١٦) ناظم مطبخ جامعہ — ماسٹر عبدالحیٔ صاحب
(١٧) مشیر طبی — ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی

ضمیمہ ۳ مدرسہ ابتدائی

(١) عتیق احمد صاحب ایم۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی نگران مدرسہ
(٢) عبدالغفار صاحب مدہولی موگا ٹرینڈ
(٣) محمد حسین صاحب بی۔ اے
(٤) عبدالواحد صاحب موگا ٹرینڈ۔
(٥) آزاد رسول صاحب بی۔ اے
(٦) محمد اکرام خاں صاحب بی۔ ٹی۔ ڈی۔
(٧) رشید نعمانی صاحب بی۔ ٹی۔ ڈی
(٨) عبید الحق صاحب بی۔ اے
(٩) مسعود اختر صاحب
(١٠) اصغر حسن صاحب اصلاحی۔ بی۔ اے
(١١) عبدالرؤف صاحب بی۔ اے
(١٢) چودھری اصغر علی صاحب بی۔ اے۔
(١٣) سید حسن صاحب بی۔ اے
(١٤) عبدالغفور صاحب بی۔ اے
(١٥) کلثوم اشرف صاحبہ
(١٦) محمد بشیر صاحب ندوی
(١٧) عبدالسلام صاحب
(١٨) سجاد علی صاحب ندوی
(١٩) معین الدین صاحب

۱۳/۲ مدرسہ ثانوی۔

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، نگراں مدرسہ

(۲) برکت علی صاحب

(۳) علی احمد صاحب بی۔ایس۔سی۔

(۴) محمد علی صاحب بی۔اے

(۵) اختر حسن صاحب فاروقی

(۶) عتیق احمد صاحب ایم۔ایس، سی، بی، ٹی

(۷) عبدالرزاق صاحب ایم۔اے۔ بی۔ٹی

(۹) ابوالکاظم قیصر صاحب زیدی ایم، اے۔

(۱۰) راجہ نذیر احمد صاحب بی۔اے۔

(۱۱) شفیع الدین نیر صاحب

(۱۲) مجاہد حسین زیدی صاحب بی۔اے

(۱۳) اشفاق محمد خاں صاحب

(۱۴) ایاز محمد خاں صاحب

۱۳/۳ جامعہ کالج

(۱) پروفیسر ای۔جے کیلاٹ صاحب ایم۔اے پرنسپل

(۲) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

(۳) مولانا محمد اسلم صاحب جے راج پوری

(۴) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

(۵) پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔اے

(۶) مولانا خواجہ عبدالحئ صاحب

(۷) پروفیسر محمد عاقل صاحب

(۸) پروفیسر محمد سرور صاحب بی۔اے

(۹) آغا اشرف علی صاحب ایم۔اے

(۱۰) چودہری محمد علی صاحب بی۔اے

۱۳/۴ اُستادوں کا مدرسہ

(۱) سید انصاری صاحب ایم، اے، پی۔ڈی پرنسپل

(۲) سلامت اللہ صاحب ایم، اے، بی۔ٹی

(۳) ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب ایم۔اے

(۴) ابوالکلام صاحب، اُستاد آرٹ

(۵) پنڈت تلارام صاحب اُستاد کتائی وبنائی

(۶) عبدالحمید صاحب اُستاد باغبانی

(۷) صدیق احمد خاں صاحب

(۸) افضال الحق صاحب

۱۳/۵ تعلیم مرکز ۱

(۱) شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔اے ناظم ادارہ ونگران مدرسہ تعلیمی مرکز۔

(۲) برکت علی فراق صاحب بی۔اے — (۳) سید عروج الحسن صاحب

(۴) سید احمد علی صاحب موگا ٹرینڈ — (۵) مولوی فضل الرحمٰن صاحب

(۶) محمد شفیع صاحب بی۔اے۔بی۔ٹی۔ڈی — (۷) محمود الحسن صاحب بی۔ٹی۔ڈی

(۸) محمد اکرام صاحب عثمانی (۹) محمد عقیل صاحب (۱۰) محمد احتشام الدین صاحب فریدی

(۱۱) سید حسین احمد قیصر صاحب — (۱۲) مختار احمد صاحب بی۔اے منتظم دفتر

(۱۳) ظریف احمد صاحب محاسب — (۱۴) شفاء الرحمٰن صاحب منتظم مرکز بالغان

(۱۵) محمد صدیق صاحب محاسب — (۱۶) سید منظور حسن صاحب

۴۔ صدر دفتر

(۱) ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، شیخ الجامعہ — (۲) پروفیسر محمد مجیب صاحب، خازن

(۳) حافظ فیاض احمد صاحب، نائب خازن — (۴) ارشاد الحق صاحب، مسجّل

(۵) مجتبیٰ حسین صاحب زیدی موگا ٹرینڈ — (۶) شبیر احمد صاحب انصاری بی۔اے

(۷) مولوی فرید احمد صاحب — (۸) محمد بن عبد القیوم صاحب بی۔اے

(۹) مصعب الرحمٰن صاحب بی۔اے — (۱۰) غیاث الدین صاحب

(۱۱) عبد العلی خاں صاحب — (۱۲) عزیز محمد صاحب

۵۔ مرکزی کتب خانہ

(۱) پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم۔اے، ناظم کتب خانہ اعزازی

(۲) خواجہ نبی احمد صاحب بی۔اے۔ مہتمم — (۳) عبد اللطیف صاحب اعظمی بی۔اے۔

(۴) محمد محفوظ صاحب — (۵) رحمت اللہ صاحب

اُردو اکادمی اور مکتبہ جامعہ

(۱) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔اے پی۔ایچ ڈی۔ ناظم اُردو اکادمی

(۲) حامد علی خاں صاحب بی۔اے ناظم مکتبہ — (۳) پروفیسر محمد عاقل صاحب

اساتذہ و کارکنانِ کلیۂ جامعہ
داہنے سے بائیں کرسیوں پر : محمد مجیب صاحب
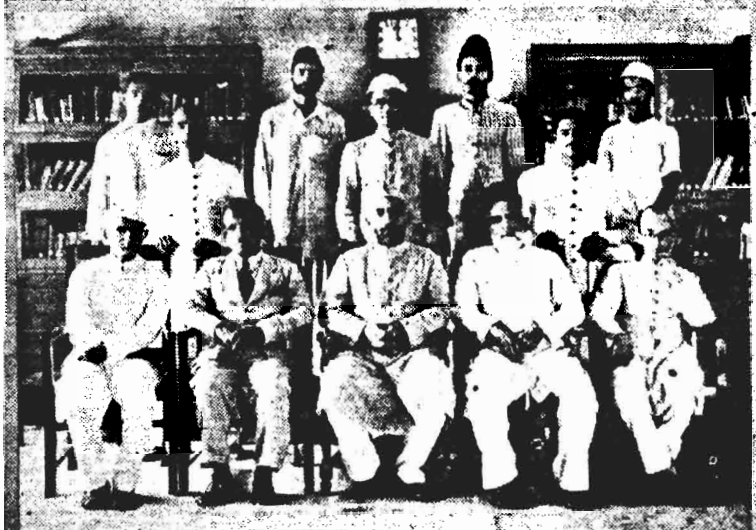
(۴) حسین حسّان صاحب (۵) مشتاق احمد صاحب (۶) رشید احمد صاحب (۷) منظور احمد صاحب۔
(۸) محمد عارف صاحب (۹) ذوالفقار حسن صاحب (۱۰) اسرار احمد صاحب۔

۱۴/۳ ہمدردانِ جامعہ: (۱) خواجہ حافظ فیاض احمد صاحب ناظم شعبہ (۲) شفیق احمد صاحب چشتی۔
(۳) محمد فائق صاحب فاروقی (۴) محمد یونس خان صاحب بنگش (۵) اعراب الدین صاحب (۶) سید منیر الحسن صاحب

۱۴/۴ شفاخانہ: (۱) ڈاکٹر سعید احمد صاحب مشیر الملتی (۲) جلیل اللہ صاحب۔
(۳) نصیر اللہ صاحب (۴) جعفر حسین صاحب (۵) صفی الدین صاحب

۱۴/۵ امورِ عامہ

(۱) جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدر (۲) مولوی ارشاد الحق صاحب بی۔اے
(۳) بشیر احمد صاحب انصاری بی۔اے (۴) حافظ فیاض احمد صاحب
(۵) عبدالحمید صاحب (۶) عبدالحیٔ صاحب (۷) ڈاکٹر سعید احمد صاحب

۱۴/۶ مطبخ

(۱) ماسٹر عبدالحیٔ صاحب ناظم (۲) منشی بختیار محمد خاں صاحب
(۳) مشتاق احمد صاحب (۴) منور حسین صاحب
(۵) محمد ادریس صاحب (۶) علیش محمد صاحب نان پُز
(۷) عبدالحفیظ صاحب نان پُز (۸) عظیم الدین صاحب، چپاتی پکانے والا
(۹) شفیق صاحب آٹا گوندھنے والا (۱۰) صابر صاحب مسالا پیسنے والا
(۱۱) اختر صاحب بیرا (۱۲) رحمت اللہ صاحب بیرا
(۱۳) نصرو صاحب (۱۴) نور محمد صاحب بہشتی
(۱۵) عبدالغنی صاحب ریڑھی والا (۱۶) سمیرا صاحب مہتر مطبخ

جامعہ کے مصنفین کی کتابیں ۱۹۴۷ء تک

(۱) مولانا محمد علی جوہر:۔ (۱) کلام جوہر۔ (۲) انگریزی سوانح عمری خود نوشت

۲۔ حکیم اجمل خاں:۔ (۱) دیوان شیدا۔

۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب:۔

(۱) تعلیمی خطبات۔ (۲) مرغی اجیرچلی (۳) معاشیات قومی (۴) مبادی معاشیات (ترجمہ)
(۵) ہندوستان کیا ہے؟ (۶) ذاکر حسین (۷) حالی محب وطن (۸) معاشیات مقصد و منہاج۔
(۹) ریاست (ترجمہ افلاطون)

۴۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب

(۱) کھیتی (۲) روسی ادب، دو حصے (۳) تاریخ ہند کی تمہید (۴) جنگ کے چار سال۔
(۵) ادب اور ادیب (۶) انجام (۷) ہمارا دین (۸) کیمیاگر (۹) تاریخ فلسفہ سیاست۔
(۱۰) خانہ جنگی (۱۱) شیدا۔

۵۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

(۱) مضامین عابد (۲) ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب، تین حصے (۳) علم الاقوام، دو حصے۔
(۴) پردہ غفلت (۵) تنقید عقل محض (۶) مکالمات افلاطون (۷) قوم کی آواز (۸) مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ (۹) تاریخ فلسفہ اسلام (۱۰) نفسیات (مصنفہ ایڈورڈ اشپرانگر) ترجمہ (۱۱) ضبط نفس اور نفس پرستی (مصنفہ گاندھی جی) ترجمہ (۱۲) تلاش حق (گاندھی جی) ترجمہ (۱۳) ترکی میں مشرق و مغرب کی کش مکش۔ ترجمہ (۱۴) میری کہانی ترجمہ (پنڈت جواہر لال)

مولانا اسلم جیراج پوری:۔

(۱) تاریخ الامت، حصہ اول تا ہشتم۔ (۲) مجاہد اسلام، (۳) ارکان اسلام (۴) خواتین (۵) نوادرات، (۶) نکات قرآن (۷) جواہر القرآن؟ (۸) وراثت… (۹) تاریخ نجد (۹) سیرت نبوی اور مستشرقین

(۱) سیرت عمر بن عاص (۱۱) حیات حافظ (۱۲) حیات جامی (۱۳) تاریخ القرآن (۱۴) تعلیم قرآن
(۱۵) محجوب الارث (۱۶) الوراثۃ فی الاسلام (عربی)

۷۔ مولانا عبدالحئی صاحب

(۱) ہمارے رسول (۲) خلفاء اربعہ (۳) نبیوں کے قصے (۴) سبیل الرشاد (۵) بیان۔
(۶) صراط المستقیم (۷) عبرت (۸) برہان (۹) سبل السلام (۱۰) ذکریٰ (۱۱) بصائر۔
(۱۲) التحافۃ الکبریٰ (تفسیر سورہ بقرہ)

۸۔ مولانا عبداللہ محمد بن یوسف الشورتی

(۱) قواعد عربی (۲) ازھار العرب۔

۹۔ پروفیسر محمد عاقل صاحب

(۱) آپ کی غذا۔ (۲) آدمی اور مشین (۳) سیاسیات کی پہلی کتاب (۴) مسئلہ آبادی (۵) اجتماعی زندگی کی ابتداء (۶) ہندوستان کا دیہی قرض

۱۰۔ نورالرحمٰن صاحب :۔ (۱) انتخاب میر

۱۱۔ سعید انصاری صاحب

(۱) آزادی (لبرٹی کا ترجمہ) (۲) مولانا شبلی بحیثیت انشاپرداز (۳) بچوں کی نظمیں، (۴) بچوں کے اسماعیل (۵) تعلیم و سماج (۶) بھولا بچہ (۷) زندگی کا رُخ (۸) ایک بچہ کی کہانی۔
(۹) ہندوستانی تعلیم کے مسائل

۱۲۔ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب۔ (۱) ہم کیسے پڑھائیں۔

۱۳۔ محمد سرور صاحب (۱) شاہ ولی اللہ اور ان کا سیاسی فلسفہ۔

۱۴۔ محمد شفیع الدین صاحب نیّر

(۱) بچوں کا تحفہ، دو حصے نظم (۲) تعلیمی تحفہ، دو حصے، نظم (۳) بچوں کا کھلونا۔ نظم (۴) اسلامی کہانیاں نظم (۵) وطنی نظمیں (۶) نئی کہانیاں (۷) گھی شکر (۸) تارا کا ڈنڈا (۹) بونے کا بٹوا۔

(۱۱) ادار راجا (۱۲) پری کی جھڑی (۱۳) بیچ شہزادی نظم (۱۳) پرستان کی سیر نظم (۱۴) جنن منن ۔
(۱۵) میاں مٹھو (۱۶) مٹھو میاں (۱۷) منی کا پرستان (۱۸) طلسمی مینار (۱۹) مکھو میاں (۲۰) مزدور کا بیٹا
(۲۱) انوکھی چھتری ۔

۱۵۔ وقار عظیم صاحب :۔ (۱) انشار کی تعلیم (۲) ہماری داستانیں (۳) ہمارے افسانے۔

۱۶۔ قاسم حسن صاحب (۱) قومیت اور بین الاقوامیت ۔

۱۷۔ مولانا سعد الدین انصاری صاحب مرحوم :۔ (۱) دروس القرآن والحدیث چار حصے۔
(۲) محاسن اسلام ۔

۱۸۔ برکت علی صاحب فراقؔ ۔
(۱) نئی تہذیب نئی تعلیم (ترجمہ کلپٹرک) (۲) ارتقائی اشتراکیت۔ (ترجمہ پروفیسر جوڈ) (۳) نئی تنظیں

۱۹۔ محمد حسین حسّان صاحب :۔
(۱) سرکار دو عالم (۲) ناموران اسلام (۳) ہماری زمین (۴) انوکھا عجائب خانہ (۵) انعامی مقابلہ
(۶) تانبیل خاں (۷) چنبیلی (۸) چینو منو (۹) قرقر (۱۰) دنیا کے بچے۔ (۱۱) چھوٹا چمٹو (۱۲) صحت وصفائی
(۱۳) بیماری سے بچو (۱۴) نئی منی کہانیاں (۱۵) انعامی مقابلہ

۲۔ الیاس احمد مجیبی صاحب
(۱) آنحضرت (۲) سرکار کا دربار (۳) چار یار (۴) اور مقدمہ چلتا رہا (۵) باغ وبہار (۶)
چاندبی بی (۷) نصیب کھلے پھول کھلے (۸) مہاجرین اور انصار (۹) اسلامی حکومتیں ۔
(۱۰) فسانۂ عجائب ۔

۲۱۔ فیاض حسین جامعی ۔ (۱) آسان خوشخطی چار حصے ۔ (۲) کھٹملوں کا اعلان جنگ

۲۱ ۔ عبدالواحد صاحب سندھی ۔
(۱) قرآن کیا ہے (۲) اسلام کیسے پھیلا (۳) اسلام کے سپہ سالار (۴) پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔
(۵) ادھر کی تارا (۶) یکہ دھوم کاٹے (۷) لال مرغی (۸) جنگو کی بلی (۹) ننھی مرغابی (۱۰) چیونٹی

کی کہانیاں (۱۱) جادو کا گھر (۱۲) روٹی کس نے پکائی (۱۳) بنسا دو نانی (۱۴) بی مٹھو کی اڑ کیا (۱۵) لومڑی کا گھر (۱۶) سپر چینگو کی کہانیاں (۱۷) ہانچپو (۱۸) چل مسرے ڈھمک ڈھوم۔ (۱۹) ناک دھنا دھن تاک (۲۰) مال تو خوب بکی (۲۱) دیپی کو کس نے ہارا (۲۲) پنچ نوٹے (۲۳) آسان کہانیاں۔

۲۳۔ عبدالغفار صاحب مدہولی۔

(۱) اردو کا بنیادی قاعدہ (جامعہ کے طریقے سے) (۲) اردو کی بنیادی پہلی کتاب (۳) رہنمائے قاعدہ (۴) قوم پرست طالب علم (ڈراما) (۵) جھوٹا لڑکا (ڈراما) (۶) بچوں کا انصاف (ڈراما) (۷) اسکول کی زندگی (ڈراما) (۸) چوری کی عادت (ڈراما) (۹) دعوے (۱۰) چندہ پروجکٹ (۱۱) امن کا راستہ (۱۲) محنت (ڈراما) (۱۳) اردو تماشہ (۱۴) ایک معلم کی زندگی دو حصے۔ (۱۵) کھیل کے ذریعہ تعلیم دو حصے۔ (۱۶) پہلی جماعت کا حساب۔